روشنی خوشبو مہک

(۷۰ تاثراتی مضامین کا مجموعہ)

چمن چمن سے ہیں انہیں چُن چُن کے لایا ہوں
شامل ہیں جتنے پھول مری اس کتاب میں

صلاح الدین نیّر

ماہ وسنِ اشاعت : .... جون ۲۰۰۲ء
تعدادِ صفحات : ۴۴۰
تعدادِ اشاعت : ۵۰۰
قیمت : .... ۳۰۰ روپے
لائبریری ایڈیشن : .... ۲۵۰ روپے
کتابت : .... سید انور احمد
طباعت : .... اعجاز پرنٹنگ پریس، چھتہ بازار
ناشر : .... صلاح الدین نیر

کتابیں ملنے کا پتہ

- سیاست سیل کاونٹر۔ جواہر لال نہرو روڈ۔ حیدرآباد ۱
- حسامی بک ڈپو مچھلی کمان پتھر گٹی ۔ حیدرآباد ۲
- مصنف۔ کہکشاں ۱۱-۳-۸۲۴/۷ جدید ملے پلی حیدرآباد ۱

فون ۔ ۳۳۴۰۰۱۵

ترتیب و تزئین

روشنی خوشبو مہک

روشنی، خوشبو، مہک میرے تاثراتی مضامین کا مجموعہ ہے۔ تاحال میری اور مجھ سے متعلق ۱۲ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ ۱۳ ویں کتاب ہے۔ اس کتاب میں حیدرآباد کی بقیدِ حیات ان شخصیتوں پر میرے تاثراتی مضامین شامل ہیں جن کی خدمات مختلف شعبۂ حیات میں نمایاں رہی ہیں اور ان تمام سے میرے شخصی مراسم ہیں۔ ان میں شاعر بھی ہیں ادیب بھی، محقق بھی ہیں نقاد بھی، قانون داں بھی ہیں سماجی کارکن بھی، صحافی بھی ہیں اور تہذیبی فنکار بھی۔ اس کے علاوہ مہذب معاشرہ سے وابستہ ایسے لوگ بھی ہیں جن کی خدمات لائق تحسین ہی نہیں قابلِ تقلید بھی ہیں۔ ان میں بعض ایسی شخصیتیں بھی ہیں جن پر طویل مضامین لکھے جا سکتے ہیں۔ میں نے اختصار کے ساتھ ان کی شخصیت اور خدمات کے کچھ نمایاں پہلوؤں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان شخصیتوں پر اپنے مراسم کی بنیاد پر جس طرح میں نے

انہیں محسوس کیا لکھا ہے۔ ان کے علاوہ شہر میں اور بھی لوگ ہیں جن پہ بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اگر حالات اجازت دیں تو انشاء اللہ بعض اور شخصیتوں پر بھی خامہ فرسائی کروں گا۔ یہ تمام مضامین میں نے قلم برداشتہ لکھے ہیں اور یہ صبح ۵ بجے سے چھ بجے کے دوران تخلیق ہوئے ہیں کتابت کو دینے سے پہلے جہاں ضرورت محسوس کی گئی مضامین میں جزوی کمی و بیشی کی گئی ہے۔ ان اشاراتی مضامین میں نہ صرف عصرِ حاضر کے حالات کی ہی عکاسی کی گئی ہے بلکہ تقریباً ۳۰ سالہ دور کے علمی و ادبی، سماجی و تہذیبی سرگرمیوں کا بھی احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان برسوں میں سب کچھ نہ سہی بہت کچھ بدل گیا ہے اس کتاب میں جن شخصیتوں پہ مضامین شامل ہیں وہ اپنے اپنے میدان میں سرگرم عمل ہیں۔ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ جو لمحے اپنے قبضہ میں ہیں ان سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتا چلئے اس لیے کہ آج میں کچھ لکھنے کے موقف میں ہوں ہو سکتا ہے کل لکھنے کے موقف میں نہ رہوں۔

اس کتاب سے پہلے سال گذشتہ میری دو کتابیں "خوشبو کے بھاراں" (جون ۲۰۰۱ء) اور "ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے" (نومبر ۲۰۰۱ء) شائع ہو چکی ہیں خوشبو کے بھاراں میں یہ قید حیات ۲۰ نامور شخصیتوں ڈاکٹر سید عبدالمنان، نواب شاہ عالم خان سید ہاشم علی اختر، ولی قادری، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، ڈاکٹر زینت ساجدہ

ڈاکٹر وسی نارائن ریڈی، پروفیسر جعفر نظام، ایم باگاریڈی، کنول پرشاد کنول، پروفیسر مغنی تبسم، زاہد علی خان، خلیل الرحمن، پروفیسر افضل محمد آصف پاشاہ، ڈاکٹر گنیانم سندر، ڈاکٹر وزارت رسول خان، شرمیلی روڈا منری، ڈاکٹر موہن لعل نگم اور تجمل حسین پر اور "ہمیں سوگ گئے داستاں کہتے کہتے" میں اوراق ماضی سے تعلق رکھنے والی ۳۱ ممتاز شخصیتوں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر حبیب الرحمن پروفیسر عبد القادر سروری، پروفیسر ابوظفر عبد الواحد، پروفیسر سید محمد، راجے جانکی پرشاد، عابد علی خان، محبوب حسین جگر، ڈاکٹر حسینی شاہد، بھارت چند کھنہ، علامہ حیرت بدایونی، مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، علامہ قدر عریضی، خورشید احمد جامی، اوج یعقوبی، سعید شہیدی، سلیمان اریب، امیر احمد خسرو، خیرات ندیم اور شاذ تمکنت پر مضامین شامل ہیں دونوں کتابیں بالترتیب ۱۹۶ اور ۱۸۶ صفحات پر مشتمل ہیں۔

میری پہلی کتاب "سلسلہ تصویروں کا" (۱۹۹۲ء) میں سکریٹریٹ کے ۴۳ اعلیٰ عہدہ داروں میں لے قادر، بھارت چند کھنہ، سید ہاشم علی اختر، غلام احمد، ایس لے واسع، محمد تاج الدین، پی این واگھرے ایس لے عزیز، صادق احمد، دمن راؤ، سید تراب الحق، خواجہ حمید احمد عبد المحمود، مقتدر احمد، رشید قریشی، سعد حسین سعید، غلام دستگیر قریشی نہیندر سونخر، ڈاکٹر حسن الدین احمد، خالد انصاری، لے کے گوئل، وینکٹ

رمنا چاری، نر سہارا ڈاور و بنکٹ راؤ کے علاوہ شگفتہ عبد القیوم صالحہ الطاف، ڈاکٹر صابرہ سعید، فاطمہ نسرین، انجم ثمر، سعیدہ انیس قیوم فیاض، نظر النساء ناز، کوتما کرن اور نفیسہ قادری پر مضامین شامل ہیں ۔ "پھر وہی پرچھائیاں" (۱۹۹۳ء) میں ڈاکٹر دسی نارائن ریڈی، رئیس اختر، ڈاکٹر صادق نقوی، ناصر کرنولی، رحمن جامی، ڈاکٹر مصطفےٰ کمال، سہپال سنگھ ورما، اکمل حیدرآبادی، ڈاکٹر طیب انصاری، عزیز بھارتی پر اور "کہکشاں" (۱۹۹۶ء) میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی، مومن خان شوق اور منوہر لال بہار پر مضامین شامل ہیں ۔ تا حال تقریباً ... کتابیں میری زیر نگرانی شائع ہو چکی ہیں زائد از ۲۰ ادبی میگزین میں نے مرتب کیے ہیں کچھ اور مضامین پر مشتمل کتاب اشاعت پذیر ہے جو تبصروں، دیباچوں اور تعارفی تحریروں کی شکل میں منظر عام پر آئے ہیں ماہنامہ خوشبو کا سفر کے منتخب اداریے بھی شائع کرنا چاہتا ہوں نعتیہ کلام کا ایک مختصر مجموعۂ کلام ترتیب پا چکا ہے ویسے غزلوں اور نظموں پر مشتمل کتاب بھی صورت گری کے مرحلوں سے گزر رہی ہے

میری کتابوں "سلسلہ پھولوں کا" "پھر وہی پرچھائیاں" اور "کہکشاں" میں جن شخصیتوں پر میرے تفصیلی مضامین شائع ہوئے ہیں اُن میں سے کچھ شخصیتوں پر نہایت مختصر تحریریں بھی اس کتاب میں شامل کی گئی ہیں تاکہ اس طویل فہرست میں ان کے نام

چکی ہیں۔

"روشنی، خوشبو، مہک" کے جدید بیرونِ ریاست اور بیرونِ ملک میں مقیم بعض ادبی شخصیتوں پر مضامین کی کتابی شکل اختیار کرنے والے ہیں۔ اضلاع آندھرا پردیش اور اضلاع حیدرآباد دکن سے تعلق رکھنے والی بعض ادبی و تہذیبی شخصیتوں پر مشتمل مضامین کی بھی ایک علاحدہ کتاب شائع ہوگی۔ جس میں بہ قید حیات نامور شخصیتوں کے علاوہ قابلِ احترام مرحوم شخصیتوں پہ لکھے گئے مضامین شامل کئے ہیں گے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میرے شعری مجموعوں کی طرح سال گذشتہ شائع شدہ کتابیں "خوشبوئے بہاراں" اور "ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے" کی ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی ہوئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خاص طور پر حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں میری یہ کتاب "روشنی، خوشبو، مہک" پسندیدہ نظروں سے دیکھی جائے گی۔

صلاح الدین نیّر

کہکشاں۔ جنت نشاں۔ ملے پلی
11-3-824/7
حیدبد ملے پلی۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۱

جسٹس سردار علی خان

(مایہ ناز دانشور۔ بصیرت نواز شخصیت۔ عظیم قانون داں)

حقیقی معنوں میں دانشوری کا لفظ بعض ایسی عالی قدر، اعلیٰ
... کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کے
... ں رہتی۔ عام طور پر وہ لوگ
... ے فہم و ادراک ہوتے ہیں
... ں تو کیا جاتا ہے لیکن حقیقی دانشور
... کر پاسکتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ
... مستند سمجھی جاتی ہے اور اُن کی
حیثیت رکھتی ہے۔ دانشوری
حاصل بھی ہوتی ہے لیکن وہ
... کا سرچشمہ ہوتی ہے ذہانت و

ہمارے شہر میں ہر شعبۂ حیات میں بہت سے دانشور ہیں گے جو اپنی خداداد صلاحیتوں کے سبب اونچی اڑان بھر نے لیے ہیں بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے رہے ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑتے چلے جا رہے ہیں اور وہ جس راستے سے بھی گذرتے ہیں وہاں صرف اجالا ہی اجالا دکھائی دیتا ہے۔

ہمارے شہر کے مشہور دانشوروں میں ایک ایسے قدآور دانشور بھی موجود ہیں جن کا ہر لفظ اور ہر جملہ نہ صرف دانشورانہ ہی ہوتا ہے بلکہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے بھی دل میں اتر تا چلا جاتا ہے

جسٹس سردار علی خان صاحب جہاں ایک اعلیٰ درجہ کے قانون داں ہیں وہیں منتخب و نمائندہ دانشوروں کی فہرست میں نمایاں مقام پر بھی ہیں۔ جسٹس سردار علی خان صاحب اکتسابی دانشوروں میں بھی شمار کیے جاتے ہیں اور الہامی دانشوروں میں بھی اور اُن دانشوروں میں بھی جن پر خدا کا خاص کرم ہوتا ہے اور جن کے ذہن و فکر کے تمام گوشے ہمیشہ روشن رہتے ہیں۔ سردار علی خان صاحب ایک کامیاب قانون داں کی حیثیت سے اسی وقت سے اپنی پہچان بنانے لگے جب انہوں نے شعبۂ قانون میں پہلا قدم رکھا۔ ایک ذہین و باشعور طالب علم کی حیثیت سے وہ اپنے تمام ساتھی طلباء میں الگ پہچانے جاتے تھے انہوں نے منفرد طالب علمانہ شناخت کے ساتھ اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا انگلستان کے تعلیمی ماحول میں بڑے بڑے قانون داں

اور دانشوروں سے ربط و ضبط اور بہترین اساتذہ کی تربیت نے ان
کی قانونی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ اور جب وہ قانون کی تعلیم سے آراستہ و
پیراستہ ہو کر حیدرآباد لوٹے تو انہیں قانون داں حلقوں میں ہاتھوں
ہاتھ لیا گیا۔ اُن کا خیر مقدم کیا گیا۔ وکالت کے ابتدائی پر کشش
محنت طلب لمحوں سے گذرتے ہوئے کافی شہرت پائی۔ یہاں تک کہ
آندھرا پردیش ہائیکورٹ کے کارگذار چیف جسٹس بھی رہے۔ مرکزی اقلیتی
جسٹس سردار علی خان صاحب ہمار
ہیں سے ایک ہیں جنھیں پروردگار
یلیے جسٹس سردار علی خان نہ صر
شت سے ہی یاد کیے جاتے ہیں
و ثقافتی محفلوں میں بھی امتیازی
بٹس سردار علی خان انگریزی
ں جتنی روانی سے اردو بولتے ہیں
ں خاص طور پر اردو تقریر سننے
ر متاثر ہوتے ہیں کہ ایک لمحہ
ں نہیں ہوتی۔ یوں محسوس ہوتا
ت ہو رہی ہے۔ کانوں میں
پُر اثر ہوتی ہے۔ جسٹس صاحب
ینہ دار رہتا ہے تقریر کے دوران

اُن کی آنکھیں بھی بولنے لگتی ہیں۔ چہرہ کی رنگت اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ وہ اپنی بات مدلل انداز میں کہتے جائیں گے

خدا نے انہیں بھرپور اظہارِ بیان کی طاقت عطا کی ہے کثرتِ مطالعہ اُن کی فطری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ جسٹس سردار علی خان کا علمی سرمایہ قابلِ رشک ہے انہیں کسی بھی موضوع پر اظہارِ خیال کے لیے کسی خاص تیاری کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تقریر کی بہترین صلاحیتوں کا اظہار اُس وقت پورے شباب پر ہوتا ہے جب کسی ایک خاص موضوع پر برجستہ خطاب کے لیے دعوت دی گئی ہو۔ سردار علی خان صاحب کے مشاہدات و تجربات میں ہم آہنگی ہے۔ جسٹس سردار علی خان اُردو زبان اُردو شعر و ادب اور اُردو تہذیب سے والہانہ وابستگی رکھتے ہیں اُردو کے جلسوں میں اپنے معلومات آفریں خیالات سے حاضرینِ محفل کو مسحور کر دیتے ہیں جسٹس صاحب کی تقریر اُس وقت دو آتشہ ہو جاتی ہے جب وہ دورانِ خطاب اُردو کے بہترین شعر سناتے ہیں۔ سردار علی خان صاحب کو شعر و ادب سے بھی بے حد لگاؤ ہے۔ مشاعروں کے بے حد شوقین ہیں۔ میں نے سردار علی خان صاحب کو پہلی دفعہ اُس وقت دیکھا تھا جب وہ ایک سامع کی حیثیت سے ۳۰ سال پہلے نمائش سوسائٹی کے زیرِ اہتمام نمائش کلب میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں بہ حیثیت سامع موجود تھے۔ مشاعرہ میں سامعین کے کے لیے فرش کا انتظام کیا گیا تھا جسٹس صاحب شہ نشین کے بالکل قریب مقابل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں شہر کے شاعروں کے ساتھ شہ نشین پر بیٹھا ہوا

تھا جسٹس صاحب ہر اچھے شعر پر کھل کر داد دے رہے تھے اُس مشاعرہ میں میں نے بھی اپنا کلام سنایا تھا میری غزل کو بھی جسٹس صاحب نے داد و تحسین سے نوازا تھا۔ اُس پہلی ملاقات کے بعد جسٹس صاحب سے مختلف مشاعروں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی کبھی عیدگاہ معظم جاہی مارکٹ کی سیڑھیوں کے قریب بھی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ جسٹس صاحب کا آفس عیدگاہ کے ایک کمرہ میں آج بھی موجود ہے۔ میں اُن دنوں زندہ دلان حیدرآباد اور فائن آرٹس اکیڈیمی سے وابستہ اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے کبھی کبھی وہاں جایا کرتا تھا۔ میں بھارت نیوز کو بھی اپنی ادبی انجمنوں کی نیوز کے سلسلے میں جاتا تھا۔ سردار علی خان صاحب ملک کے مشہور و مستند قانون داں کی حیثیت سے بعض سرکاری و غیر سرکاری اداروں سے وابستہ رہے اور اب بھی وابستہ ہیں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ قانون سے بھی ان کا تعلق رہا ہے اس کے علاوہ جامعہ کی مختلف کمیٹیوں میں بھی رہے ہیں۔ جسٹس سردار علی خان صاحب کے قانونی مضامین "سیاست" میں چھپتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب سے ملاقات کے لیے سیاست آفس آتے تھے۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ نگران کمیٹی کے بعض قانونی نکات پر مشورہ کے لیے انہیں عابد علی خان صاحب یاد کیا کرتے تھے۔ عابد علی خان صاحب نگران کمیٹی کے رکن تھے۔ جسٹس صاحب شہر کے مختلف علوم و فنون کے اداروں کے علاوہ دینی و ملی انجمنوں سے بھی وابستہ ہیں۔ جن کی بہترین مشاورت اور عمدہ تجاویز سے کئی انجمنیں بہتر طریقے سے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھی ہوئی

ہیں۔ میری اور رئیس اختر کی شاعری کے بھی وہ دلدادہ ہیں۔ ہم دونوں سے مل کر، ہمارا کلام سن کر وہ مسرت محسوس کرتے ہیں۔ میرا شہر میرے لوگ کے جلسوں میں جسٹس سردار علی خان کبھی صدر اور کبھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو رہتے ہیں۔ میری کتابوں کی رسم اجرا تقاریب میں بھی وہ مدعو رہے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں جسٹس سردار علی خان، رئیس اختر اور مجھ کو جدہ کے ایک عظیم الشان مشاعرہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ سکریٹری بزم عثمانیہ جدہ جناب عارف قریشی داعی محفل تھے۔ جب انہوں نے فون پر مجھ سے مشورۃً یہ دریافت کیا کہ مشاعرہ کی صدارت کے لیے حیدرآباد سے کس شخصیت کو مدعو کیا جا سکتا ہے! میں نے کہا کہ سردار علی خان صاحب موزوں رہیں گے آپ انہیں مدعو کیجئے۔ میں نے اس سلسلے میں بزم عثمانیہ جدہ کے ایک رکن مظہر الدین التمش صاحب سے جو ان دنوں حیدرآباد آئے ہوئے تھے اور رئیس اختر سے مشورہ کیا۔ دو دن کے بعد میں نے جسٹس سردار علی خان صاحب کو عارف قریشی کے حوالے سے مدعو کیا۔ ہم تینوں حیدرآباد سے ذریعہ ہوائی جہاز ممبئی روانہ ہوئے۔ ممبئی میں ویزا کے حصول میں دو دن کی تاخیر ہوئی ہم دو دن ممبئی میں رکے رہے۔ ہندوستان کے دیگر مدعو شاعروں کو جدہ لے جانے کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی جن میں خمار بارہ بنکوی بھی تھے۔ ہم تمام جب جدہ پہنچے تو ایرپورٹ پر ہمارا خیر مقدم کیا گیا ہم ایرپورٹ سے ایک ہوٹل میں پہنچے جہاں ہمارے لیے ایک دن کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا دوسرے دن ہم تمام عارف قریشی کے ہاں چلے گئے۔ سردار علی خان صاحب کے ایک رشتہ دار انہیں اپنے گھر لے گئے۔ مشاعرہ سے ایک دن قبل ہم نے عمرہ کی

اصلاح حاصل کی۔ مشاعرہ کے دوسرے دن میں اور رئیس اختر دربار رسالت
میں حاضری دینے کے لیے مدینہ چلے گئے۔ دن بھر مدینہ میں رہے جب ہم
شاپنگ کے لیے بازار پہونچے تو قریب چلنے کے ایک نامعلوم
ہندوستانی نے ہم سے کہا کہ بابری مسجد شہید کر دی گئی ہے اور سارا ہندوستان
فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ ہم مدینہ سے جدہ واپس ہوگئے۔ جدہ
میں ہم تینوں کا قیام مظہر الدین التمش صاحب کے پاس تھا ہم تینوں ایک
ساتھ ایک کمرہ میں رہے۔ ہم اس سانحہ کے تیسرے دن ممبئی پہونچے۔ جب ہم
ایرپورٹ پہونچے تو معلوم ہوا کہ ممبئی کے حالات بہت خراب ہیں ہر طرف لوٹ
مار، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے۔ ہم بہت پریشان ہوئے۔ ممبئی سے
حیدرآباد کے لیے ٹکٹس کنفرم نہیں تھے۔ بڑی مشکلوں سے ہم نے ٹکٹس حاصل
کیے۔ جب حیدرآباد پہونچے تو معلوم ہوا کہ شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے ایرپورٹ
پر ہم نے کرفیو پاس حاصل کر لیا۔ میں اور رئیس اختر ایک ٹیکسی کے ذریعہ
اپنے اپنے گھروں کی راہ لی۔ خیر و عافیت سے حیدرآباد پہونچنے پر ہم نے سجدہ
ادا کیا۔ جب شہر کے حالات نارمل ہوئے تو شہر میں پھر ادبی محفلوں
اور مشاعروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر سردار علی خان صاحب سے ملاقاتیں
ہوتی رہیں۔ سردار علی خان صاحب سے راج بھون کی تقاریب میں
بھی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ جناب کرشن کانت گورنر آندھرا پردیش
کے زمانہ میں راج بھون میں شعری و تہذیبی محفلیں عروج پر تھیں۔
حبش صاحب نے ان محفلوں کے علاوہ راج بھون کی بعض خاص محفلوں

ئوں سے بھی کبھی کبھی ملاقات ہوا کرتی تھی۔
شہر کے بلند مرتبت دانشوروں میں سردار علی خان صاحب اپنی
خصوصی شناخت کے ساتھ شہرت رکھتے ہیں۔ قابل فرزند جناب محمد
شاہد نے اپنی خداداد صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لاتے ہوئے صحافت میں
اپنا ایک اہم اور ناقابلِ فراموش مقام بنا لیا ہے۔ میری اللہ تعالیٰ سے
دعا ہے کہ ان کے درجات اور ان کی عظمتوں میں اور اضافہ کرے۔

محمود بن محمد

(نامور دانشور، صاحب فہم و ادراک ممتاز شخصیت)

خاندانی آدمی کی پہچان اس کی ذاتی شرافت، اس کے رکھ رکھاؤ اور اس کے طرزِ زندگی سے خود بہ خود عیاں ہو جاتی ہے۔ معاشرہ میں اپنی ایک الگ پہچان کے ساتھ اپنی شخصیت کو پروان چڑھانے والے لوگ جہاں بتدریج ارتقاپذیر عوامل سے آشنا رہتے ہیں وہیں اختلاطِ فکر و خیال و اسباب پر بھی نظر رکھتے ہیں زندگی کے مرحلوں سے سرسری گذرنے والے لوگ اپنی وسعتِ نظر کا مظاہرہ پوری طرح نہیں کر سکتے۔ حالات کی کشاکش، جہدِ مسلسل اور کچھ پانے اور کچھ کر دکھانے کی لگن، دھن ایک انسان کو شہرت کی بلندی تک لے جاتی ہے اور ایسا شخص جو اعتدال پسند طبیعت کا محور رہا ہو وہ ہر مرحلہ کو صبر و تحمل کے ساتھ سہہ جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے رنگ و نور کی کہکشاں بن کر پھیل جاتا ہے۔ اس کی روشنی ذہن و فکر کو بھی منور

نہیں کرتی بلکہ اطراف و اکناف کے ماحول کو بھی جگمگا چوند کر دیتی ہے ذہانت فکر و آگہی کے چراغوں کو بجھنے نہیں دیتی۔ لاکھ آندھیاں آتی رہیں۔ ہوائیں چلتی رہیں فہم و ادراک کا چراغ جلتا ہی رہے گا۔ ہمارے شہر کے نامور دانشور، قابل اڈمنسٹریٹر ممتاز شہری محمود بن محمد ہماری محفلوں کے لیے ایک ایسا روشن چراغ ہیں جن کی روشنی اس تمہیدی عبارت سے گہرا واسطہ رکھتی ہے ـــــ ان تمام عوامل کی جانب بلا واسطہ اشارہ کیا گیا ہے جو ایک قابل انسان کی نشو و نما میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔

محمود بن محمد ایک اصولی، ذمہ دار اور معقولیت پسند انسان ہیں جن کی عملی زندگی کا آغاز ایک اسکول ٹیچر کی حیثیت سے ہوا۔ اپنی اعلیٰ تعلیمی صلاحیتوں کے سبب اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں اور ایک دن آئی پی ایس آفیسر بن گئے۔ ڈپٹی کمشنر کرائمس کے علاوہ محکمہ پولیس کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ سکریٹریٹ میں ڈپٹی سکریٹری ہوم ڈپارٹمنٹ بھی رہے اور جب قسمت نے یاوری کی تو وہ سفیر ہند برائے سعودی عرب بن گئے۔ محمود بن محمد انگریزی زبان کے بہت اچھے شاعر و ادیب ہیں جس زمانے میں سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی ادبی و تہذیبی سرگرمیاں عروج پر تھیں اُن دنوں شریک معتمد سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن جناب شکیل احمد جو ہوم ڈپارٹمنٹ میں بہ حیثیت اسسٹنٹ سکشن آفیسر کام کرتے تھے مجھ سے ایک دن کہا کہ محمود بن محمد انگریزی زبان کے شاعر ہوتے ہوئے بھی اردو زبان و ادب اور شعر و شاعری کیلئے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جب میں نے اپنے رفقاء کے تعاون سے

سکریٹریٹ میں ۱۹۶۹ء میں سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تو مشروع ہی سے یہ بات پیش نظر رکھی گئی کہ ہماری اسوسی ایشن کی حیثیت ترتیبی ہو گی۔ اسوسی ایشن کی سرگرمیوں کی طرح منفرد رہے۔ چنانچہ ہم نے سکریٹریٹ کے ہر محکمے کے اعلیٰ عہدہ داروں (آئی اے ایس، آئی پی ایس) کو سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے نائب صدر کے عہدوں پر فائز رہنے کے لیے آمادہ کیا۔ محمود بن محمد نے بھی ہماری خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم میں شامل ہو گئے۔ اسوسی ایشن کے بعض مشاعروں میں حصہ لیا اور اپنی انگریزی نظمیں سنائیں۔ محمود بن محمد سے میری پہچان اردو اسوسی ایشن کی وساطت سے ہوئی۔ جب وہ سفیر ہند برائے سعودی عرب مقرر کیے گئے تو سارے شہر میں خاص طور پر مسلم معاشرہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حیدرآباد میں اس مسرت میں کئی غیر منعقد جلسے ہوئے۔

میں ایک یادگار تہنیتی جلسہ جناب جیلانی میراں نے ہوٹل نیلم رتن میں اعلیٰ پیمانے پر منعقد کیا تھا۔ شہر کے بہت سے معززین شریک محفل تھے۔ شاید سیٹھے بھی سرشام محفل آراستہ کی گئی تھی۔ اس محفل میں جیلانی صاحب نے مجھے اور رشید قریشی کو مدعو کیا تھا۔ ہم دونوں نے تہنیتی نظمیں سنائیں جو پسند کی گئیں۔ محمود بن محمد کے سفیر بننے کے بعد ایک لمبے عرصے تک ان سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ جلیل پاشاہ صدرنشین کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے جلسوں میں ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کی بیسیوں تقاریب میں محمود بن محمد صاحب نے عالمانہ خیالات سے حاضرین محفل کو

مستفید کیا اور یہ سلسلہ ڈاکٹر یہیں آج بھی جاری ہے جلیل پاشاہ کے زیرِ انتظام ہونے والی تقریباً ہر تقریب میں محمود صاحب شرکت کرتے ہیں محمود بن محمد صاحب کو ہیں نے اپنے زیرِ انتظام کئی ادبی جلسوں میں مدعو کیا ہے۔ محمود بن محمد صاحب کو فارسی ادبیات سے بھی گہری وابستگی ہے محمود بن محمد صاحب کے شعری و ادبی مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ انگریزی ادبیات کے ساتھ ساتھ اردو ادبیات سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں محمود بن محمد صاحب کی تقریر سننے سے تعلق رکھتی ہے بڑی روانی کے ساتھ اپنے شستہ و شگفتہ اندازِ خطاب سے پوری محفل کو متوجہ کر دیتے ہیں۔ دورانِ تقریر اردو اساتذۂ سخن کے برمحل اشعار بھی پیش کرتے ہیں جس سے اُن کی تقریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ محمود صاحب کے مزاج میں مزاح کا پہلو بھی در آتا ہے کچھ اس طرح لطیف مزاح کا سہارا لیتے ہیں کہ ساری محفل لالہ زار بن جاتی ہے۔ وہ ایسے دانشور ہیں جن کے فکر و خیال کی خوشبو مہکنے لگتی ہے۔ اپنے موضوع سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں اظہارِ خیال پر ملکہ حاصل ہونے کی وجہ سے اپنی بات مکمل کر لیتے ہیں اور تمام حاضرینِ محفل اُن کے معلومات آفریں خیالات سے استفادہ کرتے ہیں۔ ادبی جلسوں میں اس انداز سے آتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شہر کی ایک باکمال شخصیت رونق افروز ہو رہی ہے جن لوگوں کو اپنے میدان میں شخصیت بن چکی ہے انہیں محفل کی کسی بھی صف میں بٹھا دیا جائے وہ الگ پہچانے جاتے ہیں جس کسی محفل میں بھی محمود بن محمد

دکھائی دیں گے تو حاضرینِ محفل کو یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ یا تو صدرِ محفل ہیں یا مہمانِ خصوصی۔ شاید ہی انہوں نے ایک عام معزز کی حیثیت سے کسی ادبی و علمی تقریب میں حصہ لیا ہو۔ محمود صاحب کھلے دل و دماغ کے انسان ہیں ہر مسئلہ کو حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور منصفانہ رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ جناب محمود بن محمد اگرچہ اردو ادبیات کے طالبِ علم نہیں رہے لیکن وہ اردو زبان سے تعلق رکھنے والے اہم جلسوں میں مدعو رہتے ہیں محمود صاحب شہر کی مختلف ادبی، تعلیمی و فلاحی انجمنوں سے تعلق رکھتے ہیں محمود صاحب ایک اصول پسند شخص ہیں پابندیٔ وقت کو اہمیت دیا کرتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنی تقریباً تمام کتابوں کی رسمِ اجرا تقریب میں بہ حیثیت مہمانِ خصوصی مدعو کیا ہے حیدرآباد کے شاعروں میں رشید اختر اور میں ان کے بہت قریب ہیں انہیں ہماری شاعری پسند ہے کبھی کبھی اپنی تقریر میں ہم دونوں کی شاعری کا تذکرہ کرتے ہوئے بڑے اچھے انداز میں ہماری حوصلہ افزائی کرتے ہیں ــــ یوں تو حیدرآباد میں مختلف تنظیموں سے تعلق رکھنے والے اصحاب سے ان کی رسم و راہ ہے لیکن وہ جلیل پاشاہ کی تعلیمی و تہذیبی سرگرمیوں کو زیادہ پسند کرتے ہیں انہوں نے جلیل پاشاہ کے زیرِ اہتمام منعقدہ ہر بڑے جلسے کو مخاطب کیا ہے محمود بن محمد صاحب کئی برسوں سے نظامس ٹرسٹ کے ایک شعبہ کے ٹرسٹی ہیں ایک ٹرسٹی کی حیثیت سے بھی اپنی قابلیت و لیاقت کا انہوں نے لوہا منوالیا ہے۔ تمام رسیٹیز میں محمد بن محمد خصوصیت کے حامل ہیں۔ مختلف علوم و فنون سے کماحقہ

واقفیت کی وجہ سے بھی وہ اس قابل رہتے ہیں کہ اپنی بات سلیقے سے پیش کرسکیں۔ محمود بن محمد کو تک انگریزی کے ایک صاحب طرز ادیب ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں سیاسی شعور اور آگہی کے چراغ ہر جگہ روشن ملتے ہیں۔ سابق ریاست حیدرآباد کے نظم و نسق اور حسن انتظام کے وہ ہمیشہ معترف رہے ہیں۔ محمود بن محمد صاحب مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے صدر نشین ہیں ان کی زیر سرپرستی انسٹیٹیوٹ کی جانب سے آئے دن مختلف موضوعات پر جلسے ہوا کرتے ہیں۔ شہر کی بعض نمائندہ شخصیتیں ارکان انسٹی ٹیوٹ ہیں شامل ہیں جناب کمال الدین علی خان، انسٹی ٹیوٹ کے اعزازی سکریٹری ہیں ہم نے مولانا آزاد انسٹی ٹیوٹ میں کئی ادبی تقاریب منعقد کی ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد ہم پھر اپنے جلسوں کے لیے ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ کی خدمات حاصل کر رہے ہیں محمود بن محمد کی طرح کمال الدین علی خان صاحب کا بھی تعاون ہمیں حاصل ہے۔ ہمارے معاشرہ میں آج بھی کچھ ایسی فعال شخصیتیں موجود ہیں جو اپنی عمر کا طویل راستہ طے کرنے کے بعد بھی علمی و ادبی، فلاحی و تہذیبی سرگرمیوں کی سرپرستی کیا کرتی ہیں ان میں ایک نام محمود بن محمد کا بھی ہے اس طرح کے محترم لوگ جب تک ہمارے معاشرہ میں موجود رہیں گے یہ احساس ہوتا رہے گا کہ زندگی رواں دواں ہے اور زندگی کا ہر لمحہ بامعنی گذرتے ہوئے پل کا تسلسل ہے۔ محمود بن محمد جیسی شخصیتوں کی جتنی بھی قدر کی جائے کم ہے اس طرح کی شخصیتیں ہی معاشرہ کے اہم کردار ہوتے ہیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے معاشرہ کی بہتری کے لئے کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

سیّد رحمت علی

(ممتاز سیاست داں، نامور صحافی، شعلہ بیان مقرّر)

جن لوگوں کی زندگی نرم و گرم ماحول سے گزرتی رہتی ہے وہ زندگی کے سفر کے دوران دم لینے اور رک رک کے چلنے سے گریز کیا کرتے ہیں۔ مسلسل چلتے رہنا زندگی کی مثبت علامت سمجھی جاتی ہے۔ چلتے چلتے تھک کے بیٹھ جانے والے لوگ کبھی کبھی اپنی منزلِ مقصود کو نہیں پہونچ سکتے۔ دورانِ سفر ٹھنڈی چھاؤں کی تلاش میں رہنے والے لوگ اپنے سفر کی دوریوں کو گھٹاتے نہیں، بڑھاتے ہیں۔ اس طرح کے پس منظر میں سانس لینے والے لوگ ہمیں معاشرہ کی ہر سطح پر مل جاتے ہیں لیکن حالات کا یہ غائر جائزہ لینے والے لوگوں کے تیور ہی کچھ اور ہوتے ہیں۔ یک، در گیر محکم گیر کے نظریہ پر قائم رہنے والے لوگ شاید ہی زندگی کے سفر میں ناکام رہے ہوں بلکہ ہم نے دیکھا ہے کہ وہ لوگ جو کچھ کر دکھانا چاہتے ہیں معاشرہ میں اپنی شناخت

اکو باقی رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ مرحلہ وار اپنی زندگی کی بہترین صورت گری کا آئینہ بنا لیتے ہیں۔ اُن کے ہر عمل سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنی پہچان کی برقراری کے لئے تساہلی و لاپرواہی سے کام نہیں لیتے۔ جہدِ مسلسل، سخت محنت اور اپنے نقطۂ نظر کی برقراری و توسیع کے لئے باوقار طرزِ حیات کا اعلیٰ نمونہ بنے رہتے ہیں اس طرح کی خصوصیات کی آئینہ دار ممتاز شخصیتوں میں سید رحمت علی صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے سیاسی زندگی میں سرگرم عمل رہنے سے پہلے رحمت علی صاحب ہفت روزہ ترجمانِ دکن نیا سنسار کے نام سے نکالا کرتے تھے اپنے دور کے نوجوان صحافیوں میں اپنا مقام بنا چکے تھے۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں سیاسی، سماجی و فلاحی کاموں میں حصہ لیتے رہے۔ جیسے ہی وہ کانگریس پارٹی سے وابستہ ہوگئے اپنی سیاسی زندگی میں رنگ بھرنے لگے۔ ایک کانگریسی کارکن اور پھر ایک قائد کی حیثیت سے مصروف رہنے لگے۔ اپنے ابتدائی دور میں سماجی و تہذیبی کئی چھوٹی چھوٹی ادبی و تہذیبی انجمنوں سے وابستہ ہونے لگے۔ ایک روشن خیال کانگریسی کارکن کی طرح عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے لگے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۴۰ برس پہلے رحمت علی صاحب مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں بڑی دلچسپی لیتے تھے۔ خاص طور پر آزادیٔ ہند، قومی یکجہتی تقاریب کے سلسلے میں بڑے ہی اہتمام سے مشاعروں کا

اہتمام کرتے تھے ـــــ میں اور رئیس اختر مشاعروں میں مدعو کیئے جاتے تھے رحمت علی صاحب شہر کے اُس دور کے مشاعروں میں ہماری مسلسل حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ رحمت علی صاحب جب روزنامہ ملاپ سے وابستہ ہوگئے تو ایک رپورٹر کی حیثیت سے بہت جلد مدیر ملاپ جناب یدھ ویر کی نظروں میں آگئے۔ یدھ ویر جی رحمت علی صاحب کو اپنا ایک یا اعتماد رسا تھی سمجھتے تھے۔ رحمت علی صاحب کئی برسوں تک ملاپ سے وابستہ رہے۔ چونکہ ترقی کی منزلیں طے کرنا ان کی قسمت میں تھا اس لیئے وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ انہوں نے کانگریس پارٹی میں اپنا ایک اہم مقام بنالیا یہاں تک کہ وہ ڈپٹی اسپیکر ریاستی اسمبلی کے ذمہ دارانہ خدمت پر بھی فائز رہے۔ پھر وہ رکن راجیہ سبھا رہے۔ اِن دنوں ریاستی کانگریس پارٹی کے اقلیتی سل کے صدر نشین ہیں۔ کانگریس پارٹی کے مختلف شعبوں میں خوش اسلوبی کے ساتھ کام کرتے رہے۔ آج بھی وہ سرگرم عمل ہیں۔ رحمت علی صاحب کو میں مشاعروں کی وساطت سے جانتا ہوں۔ ان سے میری پہلی پہچان کا واحد وسیلہ شعری محفلیں ہیں وہ مجھ سے دوستانہ خوشگوار موڈ میں گفتگو کرتے ہیں۔ نہایت نڈر، بے خوف و بے باک مقرر ہیں۔ ایک شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں سیاست کے ہر موضوع پر سیر حاصل تقریر کرنے کے موقف میں رہتے ہیں۔ شعری و ادبی محفلوں سے ان کی وابستگی پہلے

بھی تھی اور اب بھی ہے۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے رکن عاملہ ہیں
جناب عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر سے ان کے بہت اچھے
مراسم تھے۔ جناب زاہد علی خان صاحب سے بھی اچھے مراسم ہیں
ایک زمانے میں روزنامہ ملاپ میں ان کے سیاسی و ادبی مضامین شائع
ہوتے تھے۔ ملاپ کے بعد روزنامہ سیاست میں ان کے سیاسی و ادبی
مضامین شائع ہوا کرتے ہیں جو قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں
"سیاست" کے ہفتہ واری کالم میں کچھ عرصہ تک ان کے ادبی، سیاسی و سماجی
مضامین شائع ہوتے رہے۔ ادارۂ سیاست کی جانب سے ان کے مضامین
پر مشتمل مجموعہ "سرفروشانِ وطن" شائع ہو چکا ہے رحمت علی صاحب
ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ اپنی گرجدار، پر اثر آواز سے اپنی تقریر
کو دو آتشہ بلکہ سہ آتشہ بنا دیتے ہیں، ہر موضوع پر بلا کسی مصلحت
کے کھل کر اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ کانگریس پارٹی نے ان کی شعلہ بیانی اور
اُن کی پُر اثر تقریر سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے۔ اب بھی فائدہ اٹھا
رہی ہے۔ اب بھی وہ مسلم اقلیتی سیاسی قائد کی حیثیت سے نہ صرف ملک
کے عام مسائل پر برملا اظہار کرتے ہیں بلکہ مسلمانوں کے مسائل پر بھی ملک
کے سربراہوں کو جھنجھوڑتے رہتے ہیں۔ رحمت علی صاحب اردو اکیڈیمی
آندھرا پردیش کے ۱۹۹۲ء میں صدر نشین رہ چکے ہیں۔ جن کی صدر نشینی
کے زمانے میں مجھے یہ اعزاز حاصل تھا کہ میں رکن بورڈ آف گورنرس رہا۔ تمام
ارکانِ بورڈ ہم خیال تھے رحمت علی صاحب نے اپنے دورِ صدر نشینی میں اردو اکیڈیمی

گلا بہت سی اسکیمات کو روبہ عمل میں لایا اور بغیر کسی شکایت کے خاص طور پر شاعروں، ادیبوں کے ساتھ تعاون کیا۔ ان کے دورِ صدارت میں شہر اور اضلاع کے تمام اہلِ قلم حضرات اور اردو اداروں کے سربراہ مطمئن رہے۔ شہر کے علمی، دینی و ادبی، شعری و تہذیبی جلسوں میں کبھی تو صدر کی حیثیت سے اور کبھی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیے جاتے ہیں اور اپنی پُر اثر تقریر سے جلسہ کو کامیاب بناتے ہیں کانگریس پارٹی سے وابستہ سیاسی قائدین میں شامل ان کے قریب ترین دوستوں میں سابق وزیر قانون جناب آصف پاشاہ ہیں۔ ان دونوں کی دوستی ہم خیالی اور ذہنی ہم آہنگی پائیدار اور مضبوط ہوتی چلی گئی۔ جناب سید رحمت علی ایوانِ پرنس معظم جاہ شجیع کے مشاعروں میں بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کرتے ہیں اور اپنی معلومات آفرین عمدہ تقریر سے حاضرینِ محفل کو حیدرآباد کی پچھلی روایتوں، اعلیٰ قدروں اور اس زمانے کی گنگا جمنی تہذیب کی یاد دلاتے ہیں۔ ہمارے شہر کے سینیئر ترین مسلم قائدین میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ رحمت علی صاحب جہاں ایک باشعور سیاسی قائد ہیں وہیں ایک بہترین شہری کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ شہر کے تقریباً تمام شاعروں، ادیبوں سے واقف ہیں سیاسی قائدین خاص طور پر مسلم سیاسی قائدین کی خدمات اور اُن کے کارناموں سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ اپنی تقریروں اور تحریروں میں انھوں نے ہمیشہ بے باکی سے کام لیا۔ بڑی جرأت و حوصلہ کے ساتھ

کسی مصلحت کو درمیان میں لائے بغیر بھرپور اعتماد کے ساتھ۔
تمام سیاسی، تہذیبی و ادبی حلقوں میں رحمت علی صاحب کی عزت کی جاتی ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ حیدرآباد کے سینیئر کانگریسی قائدین میں نواب میر احمد علی خان کی قیادت کے وہ قدرداں تھے۔ رحمت علی صاحب نے اپنی سیاسی و سماجی زندگی اپنی ذاتی محنت، لگن اور مسلسل جد و جہد سے بنائی ہے اگرچیکہ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی میں بعض قائدین سے تعاون حاصل کیا ہے۔ انھوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو ہی حرفِ اول کی حیثیت دی ہے۔
میں گولکنڈہ کی نمائندہ شخصیت منظور ظفر اور حیدرآباد کی فعال و متحرک شخصیت غلام صادق الدین کا نام بھی ان کے احباب کی فہرست میں نمایاں ہے۔ سیاسی قائدین میں ڈاکٹر ایم چنا ریڈی اور ٹی انجیا، ایم ایم ہاشم، وینکٹ سوامی ان کے ہمیشہ معاون رہے۔ تمام سیاسی قائدین رحمت علی صاحب کی عزت کرتے ہیں۔ آج بھی ان کی کافی اہمیت ہے۔
رحمت علی صاحب اپنی تقریر کے دوران اردو اشعار کا برمحل استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی تقریر کا اثر دوبالا ہو جاتا ہے۔ سیدھے سادے شریف النفس، روشن دماغ انسان ہیں ان کا سیاسی و تہذیبی رتبہ ہمیشہ اعلیٰ اقدار کا ترجمان رہا ہے۔ رحمت علی صاحب حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ ان کے ملنے والوں میں ہر سطح کے لوگ شامل ہیں ہر شخص سے اُس کے مرتبہ کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ملتے ہیں ہمارے عہد سیاست کیلئے رحمت علی صاحب کا وجود ایک سایہ دار درخت کی طرح ہے جو اپنی ٹھنڈی چھاؤں سے تھکے ماندے مسافروں کو راحت پہنچاتا رہتا ہے۔

ڈاکٹر مجید خان

(نامور ماہر نفسیات۔ ممتاز صاحب طرز ادیب)

ممتاز ماہر نفسیات ڈاکٹر مجید خان صاحب سے میری تا حال صرف دو شخصی ملاقاتیں رہی ہیں۔ ویسے ان کا نام شہر کی بعض ممتاز شخصیتوں کے ساتھ ہر اعلیٰ سوسائٹی میں خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا ایسی محفلوں میں بھی تذکرہ ہوتا رہتا ہے جہاں پیشۂ ڈاکٹری سے تعلق رکھنے والے لوگ نہیں رہتے۔ پیشۂ مسیحائی ایک اعلیٰ و ارفع پیشہ ہے خدمت خلق کا ایک اہم شعبہ ہے۔ اگر کوئی ڈاکٹر اپنے پیشہ سے ایمانداری کے ساتھ وابستہ رہے تو اس کی عظمتوں اور رفعتوں کی حد قائم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹری کا پیشہ، جذبۂ انسانیت و خدمت خلق کے لیے ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں ڈاکٹر اور مریض کی شکلیں ایک دوسرے کے لیے سوالیہ نشان بن جاتی ہیں۔ اگرچہ ہر ڈاکٹر کی یہ کوشش رہتی ہے کہ اس کا مریض مکمل شفا پائے لیکن مریض اپنی مکمل صحت یابی تک تذبذب کا شکار رہتا ہے۔ مختلف امراض کے مخصوص

ڈاکٹر ہوا کرتے ہیں۔ لیکن بعض ایسے بھی ڈاکٹر ہیں جو ہر قسم کا علاج کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر سید عبدالمنان۔ ڈاکٹر سید عبدالمنان صاحب کے ہاں جتنے مریض آتے ہیں۔ ان کی تشخیص صرف اور صرف نبض پر ہاتھ رکھ کر کی جاتی ہے۔ ہر قسم کے ٹسٹ کی رپورٹ کی ان کے ہاں قطعی اہمیت نہیں رہتی۔ وہ مریض کتنے خوش نصیب ہوتے ہیں جو ڈاکٹر مجید خان صاحب کے زیر علاج رہتے ہیں۔ ماہر نفسیات و عارضہ دماغ کی حیثیت سے ڈاکٹر مجید خان صاحب کا نام حیدرآباد کے ڈاکٹروں میں نمایاں ہے۔ خاص طور پر مسلم معاشرہ اور اردو حلقوں میں ڈاکٹر مجید خان صاحب کا نام بہت زیادہ روشن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اکثر مریضوں کی صحت یابی ڈاکٹر صاحب کی تسلی آمیز باتوں سے ہی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے فن میں ید طولیٰ رکھتے ہیں نہایت کامیاب مسیحا ہیں۔ ڈاکٹر مجید خان صاحب ایک صاحب طرز ادیب بھی ہیں ان کے مضامین برسوں سے اخبار سیاست میں شائع ہو رہے ہیں جو نہایت دلچسپ و معلومات آفریں ہونے کے علاوہ پر اثر تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک اچھے مقرر بھی ہیں نفسیات کے موضوع پر انہوں نے بہت سے عمدہ عمدہ لکچر دیئے ہیں جن کا ثبوت اخبارات میں شائع شدہ جلسوں کی روئیدادیں پیش کرتی ہیں۔ سیاست اخبار میں اُن کے مضامین بڑی دلچسپی اور توجہ کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں ان کے زیادہ تر مضامین اُن کے تمام تر مشاہدات و تجربات کے آئینہ دار ہوتے

ہیں۔ میرے دل و دماغ پر گذشتہ ۲۵۔۳۰ برسوں سے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا گہرا اثر ہے۔ پہلی بار میں نے ڈاکٹر صاحب کو سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے میوزیکل پروگرام میں دیکھا تھا جس کا میں جنرل سکریٹری تھا۔ ان سے میرا تعارف صدر اسوسی ایشن جناب صادق احمد اسسٹنٹ سکریٹری محکمۂ قانون نے کروایا تھا۔ وہ سکریٹریٹ کی تہذیبی تقریب میں جناب صادق احمد کی دعوت پر آئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب اردو شعر و ادب کے علاوہ محفل موسیقی کی شائستہ و منتخب محفلوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جب کبھی میں حیدرآباد کے اہم ترین مسلم ڈاکٹروں کا ذکر کرتا ہوں تو ڈاکٹر سید عبدالمنان، ڈاکٹر حمید رضان اور ڈاکٹر مجید خان کے نام خود بہ خود میرے لبوں پر آجاتے ہیں یہ تینوں ڈاکٹر اپنی اپنی شائستہ مزاجی اور اپنے اپنے طریقۂ علاج کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر مجید خان صاحب سے میری دوسری ملاقات آپ کے کلینک (آدرش نگر) میں ہوئی تھی جہاں میں اپنے ایک عزیز کو اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ میں نے اپنے وزیٹنگ کارڈ کے ساتھ اپنے دوسرے مجموعۂ کلام "زخموں کے گلاب" کی ایک جلد بھجوائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے فوری طلب کیا۔ میں نے مریض کو ڈاکٹر صاحب کے حوالے کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مریض کی تشخیص کی فیس نہیں لی۔ ڈاکٹر صاحب کی شاعر نوازی کا میں ہمیشہ ممنون رہوں گا۔ میں کچھ اور دماغی اور نفسیاتی مریضوں کو سفارشی خط کے ساتھ بھجوایا تھا ڈاکٹر صاحب نے پوری دلچسپی کے ساتھ رہنمائی کی تھی۔

کچھ شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اُن کی جانب لوگ کھنچے چلے جاتے ہیں۔ ہمبسکو کی محفلوں میں ڈاکٹر صاحب اکثر شرکت کیا کرتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے ایک بہت ہی اچھا لکچر "شکی شوہر شکی بیوی" کے زیر عنوان دیا جو زیر اہتمام ادارۂ سیاست منعقد کیا گیا تھا۔ اس مضمون کا اقتباس میں نے "خوشبو کا سفر" شمارہ مارچ ۲۰۰۲ء میں شائع کیا ہے۔ وقتاً فوقتاً خوشبو کا سفر میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ سیاست اخبار میں مختلف موضوعات پر خاص طور پر دماغی امراض اور نفسیات کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر مجید خان صاحب جہاں ایک کامیاب ڈاکٹر ہیں وہیں ایک صاحب طرز بہترین ادیب بھی ہیں۔ عموماً کچھ لوگ صرف اپنے پیشے ہی میں معروف رہتے ہیں۔ ڈاکٹر مجید خان صاحب جیسے ڈاکٹر بہت کم ہوں گے جو اپنے پیشہ میں شہرت رکھنے کے علاوہ اردو شعر و ادب میں بھی مشہور ہیں۔ مجھے یہ لکھتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے میری سفارش کی پذیرائی کی۔ بین الاقوامی سطح پر بھی ڈاکٹر صاحب نے سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لئے کئی بیرونی ممالک کا سفر کیا۔ جہاں ان کے پیش کردہ مضامین / مقالات کو بے حد پسند کیا گیا۔ جناب محبوب حسین جگر صاحب ڈاکٹر مجید خان صاحب سے سیاست میں اشاعت کے لیے مضامین روانہ کرنے کی خواہش کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کا رشتہ آج بھی سیاست سے برقرار ہے۔

پروفیسر احمداللہ خاں

(شاہین نظر، روشن دماغ، دلِ پُر نور، معتبر انسان)

جب ہم کسی صحنِ چمن میں پہنچ جاتے ہیں تو مختلف اقسام کے پھول ہمارا استقبال کرتے ہیں مختلف رنگوں کے پھول گلستان رنگ و بو کی رونق بڑھانے کے لیے تبسم ریز رہتے ہیں۔ ہر پھول بادِ صبا کی رعنائیوں اور شبنم کی پرورش کا سپاس گزار رہتا ہے۔ بہتے موسم کی پہلی خوشبو کی طرح سارا چمن مہکنے لگتا ہے۔ عطر بیز فضائیں احاطۂ چمن کی حد تک ہی محدود نہیں رہتیں۔ بلکہ دور دور تک پھیل جاتی ہیں۔ آجائے چاہے وہ دیوارِ زنداں میں رہیں کہ آزاد فضاؤں میں رہیں کبھی قید نہیں رہتے۔ اگر روشنی کو قید کرنے کی کوشش کی بھی جائے تو وہ روزنِ زنداں سے چھن چھن کر نکلتی ہے۔ اگر کسی ارتقاء پذیر شخصیت میں خوشبو اور روشنی کی آمیزش ہو اور اس کے فکر و خیال میں وسعتیں ہوں تو ایسا شخص ایک نہ ایک دن ہمارے معاشرہ کے لیے پیکرِ خوش جمال اور

صاحبِ نظراں بنا رہے گا۔ پروفیسر احمد اللہ خان حیدرآباد کے اُن قابل ترین، باشعور و باصلاحیت دانشوروں میں سے ایک ہیں جن کا نام مہذب معاشرہ کی پہلی فہرست میں نمایاں ہے۔ پروفیسر صاحب کے اندازِ گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی پس منظر بھی ان برگزیدہ شخصیتوں کا ایک ایسا تسلسل ہے جو سارے معاشرہ کے لیے نیکی کا پیغام لے کر آتا ہے۔ پروفیسر احمد اللہ خان صاحب کا ذہنی و فکری سفر سارے ماحول کو عطر بیز بنا رہا ہے۔ ہر انسان کو اپنی زندگی میں ہر قسم کے حالات سے گزرنا پڑتا ہے لیکن جن لوگوں کے ہاتھ میں وقت کی نبض ہوتی ہے وہ صراطِ مستقیم کے راہ رو کہلاتے ہیں۔ پروفیسر احمد اللہ خان صاحب کی حیثیت ایک میر کارواں کی بھی ہے اور قافلہ میں شریک ایک راہی کی بھی ہے دونوں صورتوں میں راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے مستقل مزاجی کے ساتھ رواں دواں رہتے ہیں۔ پروفیسر صاحب جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ قانون کے ایک لائق استاد ہیں۔ جن کا اعلیٰ درجہ کے ماہرین قانون میں شمار ہوتا ہے ان کی علمی بصیرت سے بے شمار تشنگانِ علم و فن مستفیض ہو چکے ہیں ہمارے شہر میں جو لوگ اپنی راستگوئی، اپنے علمی مرتبہ اور اپنی اعلیٰ قابلیت کی وجہ سے شہرت پا چکے ہیں ان میں ایک بڑا نام پروفیسر احمد اللہ خان صاحب کا بھی ہے شہر کے ممتاز شہریوں میں اپنی شرافت اپنے خلوص، اپنی قابلیت اور اپنے شائستہ طرزِ حیات کی وجہ سے مقبول ہیں نہایت اعلیٰ ظرف، شریف النفس، باکردار، قابلِ اعتبار اور

باوقار شخصیت کے حامل ہیں۔ مسکراتے ہوئے ان کا گفتگو کرنا مخاطب کو متاثر کر دیتا ہے۔ شائستہ مزاجی، شگفتہ طبیعت، طرح داری اور وضع داری ان کا خاص وصف ہے۔ احمد اللہ خان صاحب ہر بات نئے نئے انداز میں کہتے ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ ہو مختلف دلیلوں کے ذریعہ اس سلیقے سے سلجھاتے ہیں کہ کوئی مسئلہ مسئلہ ہی نہیں رہتا۔

پروفیسر صاحب کی قابلیت نہ صرف شعبۂ قانون کی حد تک ہی محدود ہے بلکہ مختلف علوم و فنون کے گہرے مطالعہ نے انہیں اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ہر موضوع پر جامع انداز میں اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کی کسی محفل میں آمد سے پہلے ہی ان کی خوشبو پہنچ جاتی ہے اور جب وہ محفل میں داخل ہوتے ہیں تو سارا ماحول مہکنے لگتا ہے۔ پروفیسر احمد اللہ خان صاحب کا شمار ایسی ہی معدودے شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ میں نے پروفیسر صاحب کو کئی علمی و ادبی جلسوں میں سنا ہے۔ جب وہ تقریر کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک دریا ہے کہ بہتا جا رہا ہے میں اپنی کتابوں کی رسم اجراء تقاریب کے علاوہ خوشبو کا سفر کے سالانہ جلسوں اور اپنے بعض متاثر دوستوں کی کتابوں کی رسم اجراء تقاریب میں انہیں اظہارِ خیال کے لیے دعوت دیا کرتا ہوں۔ محفل کے تمام تجزیہ کاروں میں احمد اللہ خان صاحب اپنی ایک الگ پہچان کے ساتھ جلوہ افروز رہا کرتے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے ہوں کہ کسی شخصیت کے کارناموں کا جائزہ اجلاس صدر ڈاکٹر صاحب حاضرین مجلس کو مایوس نہیں کرتے۔ ان کی گفتگو میں

نفتنع نہیں ہوتا کھری کھری بات صاف صاف لفظوں میں کہہ جاتے ہیں ان کا لب و لہجہ پُراثر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اردو زبان کی حماقت اردو تہذیب کی وقعت اور اردو شعر و ادب کی عظمت کا پوری طرح ادراک ہے ڈاکٹر صاحب کو مختلف علوم و فنون سے دلچسپی ہے ایک بہترین اور باشعور مقرر ہونے کی وجہ سے کوئی بھی موضوع کیوں نہ ہو جم کر اظہارِ خیال کرتے ہیں اردو ادبیات کے علاوہ انہیں شرعی و قانونی علوم پر بھی قدرت حاصل ہے ان کی تحریریں بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں سیاست کے شعبۂ اشاعت کی جانب سے ڈاکٹر صاحب کے سیاست میں شائع شدہ مضامین کا ایک مجموعہ لیگل گائیڈنس کے نام سے منظرِ عام پر آچکا ہے سیاست اخبار میں ڈاکٹر صاحب کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جو زیادہ تر شرعی، قانونی اور سیاسی مسائل پر مبنی رہتے ہیں سیاست اخبار سے ڈاکٹر صاحب کو بہت زیادہ لگاؤ ہے مجھے یاد ہے کہ خاص خاص مواقع پر جناب محبوب حسین جگر صاحب سیاست کے لیے ڈاکٹر صاحب سے مضامین لکھنے کے لیے کہتے تھے۔ اردو حلقوں میں پروفیسر احمد اللہ خان صاحب کی ادبیانہ پہچان میں سیاست اخبار کا بڑا حصہ ہے۔ میں جب اپنے وطن ہمنایاد (ضلع بیدر) سے اعلیٰ تعلیم کے لیے حیدرآباد آیا تو اپنے پھوپھی زاد بھائی کے ہاں محلہ گھانسی میاں بازار میں مقیم رہا۔ اُن دنوں احمد اللہ خان صاحب میرے پڑوسی تھے ان کے والد محترم محمد وحید اللہ خان کا اس محلہ کے سربراہوں میں شمار ہوتا تھا جو صدر شعبۂ قانون ہائی

عثمانیہ تھے اور ایک عرصہ تک کالج کے پرنسپل کے عہدہ پر فائز رہے۔ پروفیسر احمد اللہ خان نے اپنے والدِ محترم اور دیگر اہلِ خاندان کے تعلیم یافتہ ماحول میں اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا۔ جامعہ عثمانیہ کے قابل فرزندوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جانے والے ہیں فرزند جامعہ عثمانیہ کی حیثیت سے ان کا نام بھی جامعہ عثمانیہ کی تاریخ میں ہمیشہ روشن رہے گا۔ پروفیسر احمد اللہ خان اعلیٰ سوسائٹی کی قابلِ قدر شخصیت ہیں شہر کے مختلف اداروں کی جانب سے منعقد ہونے والی اعلیٰ سطح کی علمی و ادبی، دینی و فلاحی تقاریب میں انہیں خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے۔ احمد اللہ خان صاحب کا خطاب پُر اثر ہوتا ہے شرکائے محفل اُن کے ہر جملہ سے مستفید ہوتے ہیں اس قدر روانی سے تقریر کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ معلومات کا خزانہ لٹایا جا رہا ہے شریک محفل کوئی بھی شخص ان کا خطاب سُن کر خالی ہاتھ نہیں لوٹتا اُس کو بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے بہترین اور کامیاب وہی مقرر ہوتا ہے جس کے ساتھ سامعین ہم سفر رہتے ہیں ایک مقرر کے لیے یہ ایک اعزاز کی بات ہے کہ جب وہ کسی محفل میں تقریر کرتا ہے تو وہ تنہا نہیں رہتا ساری محفل اس کی ہم زبان ہو جاتی ہے اس کی تقریر کا ایک حصہ بن جاتی ہے پروفیسر صاحب کو ملک کی مختلف علمی و ادبی و قانونی اداروں کی جانب سے مدعو کیا جاتا ہے ملک کی مختلف درس گاہیں، دانش کدے اور جامعات اُن کی علمی و تعلیمی قانونی و تہذیبی صلاحیتوں سے استفادہ کرتی ہیں ڈاکٹر صاحب نے بے شمار سیمینار، سمپوزیم میں حصہ لیا۔ اندرون ملک کے علاوہ بیرونِ ملک کے دانش کدوں میں بھی مدعو رہتے ہیں عثمانیہ یونیورسٹی

کی مختلف کمیٹیوں میں بھی کہیں نورکن کی حیثیت سے اور کہیں سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے شہر کے بعض علمی و ادبی اداروں سے ان کی وابستگی ہے پروفیسر صاحب اپنی غیر معمولی علمی مصروفیات کی وجہ سے مختلف تقاریب میں شرکت کے لئے وقت نہیں دے سکتے لیکن وہ لوگ اور وہ منتظمین تقریبا قابل مبارکباد ہیں جو ڈاکٹر صاحب کی خدمات سے استفادہ کرتے ہیں ڈاکٹر احمد اللہ خان صاحب اپنی قابلیت اور میرٹ کی بنیاد پر مولانا ابوالکلام اردو یونیورسٹی کے متوقع وائس چانسلر تھے باوثوق ذرائع سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ پروفیسر احمد اللہ خان صاحب کا نام بھی وائس چانسلری کے پیانل میں موجود تھا لیکن نتیجہ وہی ہوا جو عموماً ادنی اور اعلیٰ ترین کرسیوں کے لیے ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب اس طرح کے لوگوں میں نہیں ہیں جو بہت کچھ کرنے اور سب کچھ ہونے کی سیاست سے دلچسپی رکھتے ہیں ۔ وہ ایک بے نیاز شخص کی طرح سیاست کے داؤ پیچ سے بہت دور رہتے ہیں۔ مجھے اس بات پر بے حد مسرت ہے کہ پروفیسر صاحب خاص طور پر مسلم معاشرہ کی نمائندہ و برگزیدہ شخصیت ہیں ۔ جہاں تک میری شاعری اور میری شعری و ادبی سرگرمیوں کا تعلق ہے انھیں جہاں کہیں موقع ملتا ہے اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہیں۔ ادبی محفلوں میں بھی کھل کر میری شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اگر میری کوئی غزل سیاست میں شائع ہوتی ہے تو وہ اپنے تاثرات کا اظہار ذریعہ فون کرتے ہیں ۔ گجرات کے حالیہ فسادات کے پس منظر

میں ۲۸ مارچ ۲۰۰۲ کو میری غزل سیاست میں شائع ہوئی تھی غزل پڑھتے ہی انھوں نے مجھے بے ساختگی کے ساتھ داد و تحسین سے نوازا۔ میری غزل کے ہر ایک شعر کو سراہا۔ جس کے دو شعر اور مقطع کچھ اس طرح ہے

کل جو شامل تھے یہاں شہر کے شہکاروں میں
وہ تو سب قتل ہوئے گلیوں میں بازاروں میں

خوں بہا مانگنا چاہیں بھی تو کس سے مانگیں
شہر کا شہر ہے قاتل کے طرفداروں میں

تم کو ہے جن سے بھلائی کی توقع نیّر
وہ تو اک عمر سے شامل ہیں گنہ گاروں میں

پروفیسر احمد اللہ خان صاحب ہمارے شہر کے دانشوروں میں اپنی ایک الگ پہچان کے ساتھ جانے جاتے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ اپنی قابلیت، اپنی شرافت، اپنی منکسر المزاجی اور اپنی نیکیوں اور خوبیوں کی وجہ سے پسند کیے جاتے رہیں گے اور ان کے شائستہ لب و لہجہ کی خوشبو دور دور تک پھیل جائے گی۔

منوہر راج سکسینہ

(سیکشن آفیسر ہائیکورٹ - ماہر قانون داں ، اُردو کے بے لوث خدمت گذار)

حیدرآباد میں آج بھی بہت سے ایسے غیر مسلم گھرانے موجود ہیں جو اپنے اسلاف کی روایت پر چلتے ہوئے اپنی اقدار کی پاسداری کر رہے ہیں جو نہ تو اپنی روایات سے منحرف ہیں اور نہ ہی موسم کا رخ دیکھ کر موسم کے ساتھ چلنے والے ہیں بلکہ اپنے راسخ الارادہ اور اپنے غیر متزلزل کردار کی وجہ سے اپنی شائستہ روش پر قائم ہیں ۔ حیدرآباد کی ملی جلی تہذیب ، آپسی بھائی چارگی اور روایت پسندی کی نمایاں خصوصیات ان کے مزاج اور اُن کے طرز حیات میں جذب ہو چکی ہیں ۔ کئی موسم آتے رہے ، جاتے رہے کبھی ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہیں تو کبھی گرم ہوائیں اور کبھی معتدل ہوائیں چلتی رہیں لیکن ان لوگوں نے اپنے چلنے کا انداز نہیں بدلا ۔ وہی کیا اور وہی کر رہے ہیں جو اُن کے اسلاف کیا کرتے تھے ۔ اس طرح کی حیدرآباد کی ایک نمائندہ شخصیت منوہر راج سکسینہ صاحب کی بھی ہے جو مسلم

معاشرہ سے بہت قریب ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں ہے بلکہ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے تب ہی سے وہ روشن خیال ہیں۔ حیدرآباد میں جہاں کہیں بھی گنگا جمنی تہذیب کی پاسداری کی جاتی ہے وہاں منوہر راج سکسینہ صاحب کا نام بھی خصوصیت کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ منوہر راج سکسینہ کائستھ گھرانے کے ایک فرد ہیں۔ ان کے خاندان کے بہت سے لوگ، اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ حیدرآباد میں کائستھوں کی پہچان ان کے اعلیٰ کردار، ان کی اعلیٰ تہذیب اور ان کی شریفانہ زندگی کے حوالے سے برقرار ہے۔

منوہر راج سکسینہ ایک مشہور قانون داں ہیں لیکن ان کی حیثیت ایک محبِ اُردو کی بھی ہے اُردو تحریک سے برسوں سے وابستہ ہیں۔ سٹی انجمن ترقی اُردو کے صدر، ادبی ٹرسٹ کے ٹرسٹی، اور ریاستی انجمن ترقی اُردو کے رکن عاملہ ہیں۔ شہر کی بہت سی ادبی، تہذیبی، فلاحی، انجمنوں اور اداروں سے بھی وابستہ ہیں۔ اُردو زبان کے تحفظ و بقاء کے لیے سرگرم عمل رہا کرتے ہیں۔ اُردو ادیبوں اور شاعروں میں عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ زائد از ۵۰ برسوں سے اُردو کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

منوہر راج سکسینہ صاحب کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب میں شعری و ادبی سرگرمیوں سے وابستہ ہوگیا تھا یعنی کوئی ۳۵، ۳۶ برس پہلے کی بات ہے۔ اکثر ادبی جلسوں میں سکسینہ صاحب سے ملاقات

ہوتی رہتی ہے کئی ادبی جلسوں میں مجھے سکسینہ صاحب کے ساتھ تقریر کرنے کا موقع ملا ہے۔ منوہر راج سکسینہ صاحب اُردو زبان، اُردو تہذیب کی بقاء کے لیے مخلصانہ لگاؤ رکھتے ہیں، بہترین مقرر ہیں ان کی تقریر سنجیدہ بھی ہوتی ہے اور پُر مزاح بھی۔ محفل کے مزاج اور موضوع کے اعتبار سے تقریر کرنے میں ماہر ہیں۔ ان کی تقریر دلچسپی سے سنی جاتی ہے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، کالیداس کاشیکر اور نہپال سنگھ ورما کی طرح منوہر راج سکسینہ بھی اُردو کے بہی خواہوں میں ایک اچھا مقام رکھتے ہیں سکسینہ صاحب بے تعصب اور روشن خیال انسان ہیں، نا انصافی اور ظلم و استبداد کے خلاف آواز اُٹھاتے ہیں۔ ادبی محفلوں کے علاوہ سماجی فلاحی اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں، اپنے عمدہ اور متوازن خیالات سے متاثر کرتے ہیں چونکہ کھلے دل اور کھلے دماغ کے انسان ہیں اس لیے ان کی باتیں دل پر اثر کرتی ہیں۔

منوہر راج سکسینہ صاحب اگرچہ بائیں بازو کے خیالات کے حامل ہیں لیکن اُن کے خیالات میں شدت نہیں ہے اپنے لب و لہجے میں اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال کے قائل ہیں۔ کمیونسٹ پارٹی کے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں بڑے بڑے جلسوں کو مخاطب کرتے ہیں اُن کی باتوں میں توازن ہوتا ہے اس لیے اُن کی باتوں میں اختلاف کی بہت کم گنجائش رہتی ہے۔ پرانے شہر کے ادبی جلسوں، خاص طور پر اُردو گھر میں ہونے والے ادبی جلسوں میں انہیں خصوصیت کے ساتھ مدعو

کیا جاتا ہے۔ سکینہ صاحب کو بیس تے ادارۂ میرا شہر میرے لوگ کے ادبی جلسوں میں بھی مدعو کیا ہے۔ اُردو کی بقا و تحفظ سے متعلق جہاں کہیں کوئی محفل آراستہ ہوتی ہے وہاں سکینہ صاحب کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ سکینہ صاحب کو اخبار سیاست، عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب سے گہری وابستگی رہی ہے۔ ان کے مضامین سیاست میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر یوم جمہوریۂ ہند اور یوم آزادی ہند کے موقع پر ان کے مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ دستورِ ہند اور قانون سے تعلق رکھنے والی تحریریں بھی نظر سے گذرتی ہیں۔ سکینہ صاحب کو اردو زبان و ادب سے بے حد دلبستگی ہے۔

اُردو گھر مغل پورہ کا کتب خانہ بھی ریاست میں قائم تمام کتب خانوں میں ایک عصری کتب خانہ کی حیثیت رکھتا ہے جہاں جدید و قدیم کتابوں کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔ اس لائبریری کو قائم کرنے کا سہرا عابد علی خان صاحب کے سر جاتا ہے۔ اُردو گھر کی سرگرمیوں کو پروان چڑھانے میں ادارۂ سیاست کا کافی تعاون رہتا ہے۔ برصغیر سے شائع ہونے والی کتابیں جو تبصرہ کے لیے سیاست میں آتی ہیں اردو گھر لائبریری کے لیے دے دی جاتی ہیں۔ اُردو گھر کے انتظامیہ کو نئی کتابیں خریدنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ سکینہ صاحب کی راست نگرانی میں اُردو گھر کی لائبریری کام کرتی ہے اُردو گھر کے لائبریرین جناب یوسف الدین صاحب کی خدمات بھی ناقابلِ

فراموش نہیں بلکہ یہی یہاں تک کہنے کے موقف میں ہوں کہ
یوسف الدین صاحب اردو گھر لائبریری کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔
اردو گھر میں مختلف اداروں اور انجمنوں کی جانب سے مختلف موضوعات
پر جلسے ہوا کرتے ہیں بڑی بڑی شخصیتوں نے اردو گھر میں قدم رکھا ہے
سکینہ صاحبہ ایک کامیاب قانون داں ہیں اپنے محلہ شاہ علی بنڈہ کے سربراہ ہیں
کئی اہل غرض ان کی سفارشوں سے فیضیاب ہوا کرتے ہیں ضرورت
مندوں اور مستحق لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ علمی و ادبی خدمات کے صلے
میں کئی ایوارڈز پا چکے ہیں۔ رواں دواں شخصیت کے مالک ہیں طبیعت
میں مزاح کا پہلو نمایاں ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے میں انہیں
ملکہ حاصل ہے خوش مزاج، نفیس انسان ہیں پیشہ وکالت سے تعلق
رکھنے والے افراد سے بھی ان کے بہترین مراسم ہیں۔ وکلا کی سرگرمیوں
اور ان کے مسائل سے دلچسپی لیا کرتے ہیں۔ ادبی جلسوں میں شرکت
کے لیے شیروانی ان کا مخصوص لباس رہتا ہے جلسوں کی نوعیت کے لحاظ
سے پوشاک بدل لیتے ہیں۔ اپنے دوستوں سے خندہ پیشانی سے ملتے
ہیں۔ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے امین ہیں۔ خاص طور پر
مسلم اقلیتوں سے بہت زیادہ قربت رکھتے ہیں انہیں اردو زبان
اردو تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے اردو کے فروغ و ترقی میں دلچسپی
رکھتے ہیں

سید شاہ نور الحق قادری

ملنسار، خوش مزاج، با اخلاق۔ فراخ دل شخصیت

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ با اختیار و مقتدر شخصیتوں کی زیر سرپرستی جب فراخ دلی کے ساتھ پھولوں کی بارش ہونے لگتی ہے تو خاص طور پر کچھ افراد ان امرت نواز شخصیتوں کے اطراف شہد کی مکھیوں کی طرح جمع ہو کر بہت کچھ حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ بسا اوقات ایسے لوگ دربار الطاف و عنایات میں آتے تو ہیں خالی ہاتھ، لیکن جب لوٹتے ہیں تو ان کا دامن بھرا ہوا رہتا ہے۔

صدر نشین اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش جناب سید شاہ نور الحق قادری صاحب سے میں تقریباً ۱۲ برسوں سے واقف ہوں۔ پہلی دفعہ میں نے انہیں شناخرِ میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعرہ میں دیکھا تھا وہ مخصوص مدعوئین کے ساتھ نشستوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ حسن اتفاق سے اس مشاعرہ میں میرا کلام بہت پسند کیا گیا تھا جب میں نے غزل

سنا کر اپنی نشست سنبھالی تو سنہ نشین کے قریب تشریف فرما تھے سامعین نے بھی بہت کلام کو سراہا تھا قادری صاحب کو اردو شعر و ادب سے کافی دلچسپی ہے۔ کہیں نہ کہیں کبھی کبھی ان سے ملاقات ہوا کرتی تھی انہوں نے جب سیاسی میدان میں قدم رکھا تو مجھے ان کے بارے میں زیادہ واقفیت ہوئی۔ حکومت آندھرا پردیش نے جب سید شاہ نورالحق قادری صاحب کو صدر نشین اردو اکیڈیمی نامزد کیا تو مجھے بہت مسرت ہوئی کہ حکومت نے ایک ادب دوست شخصیت کو اردو کی خدمت کے لیے مامور کیا ہے۔ قادری صاحب سے اردو اکیڈیمی میں مختلف مواقع پر ملاقات ہوتی رہی ہیں ان کے علاوہ اپنے دوستوں ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی جناب مسعود بن سالم اور پی آر او اردو اکیڈیمی جناب حسن فرخ سے ملتے آیا کرتا تھا۔ میں مسعود بن سالم صاحب سے اپنے حلقے کے شاعروں، ادیبوں اور ادبی انجمنوں کی سرگرمیوں اور ان کے مسائل کی یکسوئی کے لیے تعاون حاصل کیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بھرپور تعاون کیا کرتے تھے میں ان کے دور نظامت میں دو چار مرتبہ میں شعراء کے مسودات کی منظوری اور شعری مجموعوں پر انعامات کے لیے جج مقرر کیا گیا تھا۔ مسعود صاحب کے دور میں شہر کے تقریباً تمام منتخب اہل قلم حضرات و خواتین اکیڈیمی کی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ مسعود صاحب دو مرتبہ اکیڈیمی کے ڈائرکٹر رہے۔ ان کی بہتر کارکردگی کے اعتراف میں حکومت نے ان کی مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع کی۔ ان کے دور میں اکیڈیمی کی بہت سی اسکیمات بحسن و خوبی انجام پائیں۔

میں قادری صاحب کو اکیڈیمی کی بہترین سرگرمیوں کی جانب پیش رفت کے لیے مشورہ دیا کرتا تھا میری اکیڈیمی کی بہتر سے بہتر کارکردگی کے سلسلے میں قابل قبول مشاورت کی وجہ سے قادری صاحب کا مجھ پر اعتماد بڑھتا گیا اور انھوں نے میرے مشوروں کو اہمیت دینی شروع کی۔ بعض شعری مجموعوں اور مسودات کے سلسلے میں میری بروقت توجہ دہانی کے سبب کچھ مستحق قلمکاروں کو ان کا حق مل گیا۔ قادری صاحب نے میرے کسی بھی مشورہ کو رد نہیں کیا کیونکہ میری ہر سفارش قابل اعتنا اور جائز ہوتی تھی۔ اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مشاعروں کے سلسلے میں میری ترتیب دی ہوئی شعراء کی فہرست پر مثبت انداز سے غور کیا جاتا رہا۔ میرے دیرینہ رفیق ممتاز شاعر جناب حسن فرخ صاحب پی آر او بھی اکیڈیمی کی مختلف کمیٹیوں اور شاعروں کے مسودات و مطبوعات کے سلسلہ میں جج کی حیثیت سے میری شمولیت کے حامی رہے۔ اکیڈیمی کے سینئر اسٹاف میں محمد محی الدین شریف صاحب اکاونٹس آفیسر اور محمد عمر صاحب سینئر سوپروائزر نے اپنے مکمل تعاون سے مجھے متاثر کیا میں نے محسوس کیا کہ یہ دونوں حضرات اکیڈیمی کی سرگرمیوں میں کافی تن دہی کے ساتھ مصروف رہتے ہوئے اکیڈیمی کی بہتری کے لیے نمایاں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جس زمانے (۱۹۹۲ء) میں سید رحمت علی صاحب صدر نشین اردو اکیڈیمی تھے میں دو سال تک اردو اکیڈیمی کا رکن بورڈ آف گورنرس رہا۔ جناب سید شاہ نورالحق قادری صاحب نے اپنی کوششوں اور اپنے سیاسی اثر و رسوخ سے اردو اکیڈیمی کے بجٹ میں کافی اضافہ کروایا۔ ان کی شخصی دلچسپی کی وجہ سے اکیڈیمی

کی بہت سی اسکیمات کو روبہ عمل لایا گیا۔ شاعروں، ادیبوں، صحافیوں اور اردو کے خدمت گزاروں کو انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ قادری صاحب نے اضلاع میں اردو گھر، دارالمطالعوں کے قیام کے لیے بھی اہم رول ادا کیا۔ حکومت آندھرا پردیش نے قادری صاحب کو تین سال کے لیے صدر نشین اردو اکیڈیمی کی حیثیت سے نامزد کیا۔ نومبر ۲۰۰۱ء میں صدر نشینی کی مدت کے اختتام کے بعد ان کے عہدہ کی مدت میں توسیع کی گئی۔ قادری صاحب کی دلچسپی سے اردو اوپن اسکول کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا تھا لیکن اردو اوپن اسکول کی سرگرمیوں پر نظر ثانی کے بعد اسکولوں کی تعداد گھٹا دی گئی۔ صدر نشین صاحب کا اپنے اسٹاف کے ساتھ بہت ہی اچھا سلوک ہے اسٹاف میں محمد محی الدین شریف صاحب اور محمد عمر صاحب جیسے کارکرد اور سرگرم ملازمین اردو اکیڈیمی کے پی آر او جناب حسن فرخ صاحب کو بھی اسٹاف کا تعاون حاصل ہے۔ جناب سید شاہ نور الحق قادری صاحب شہر کے برگزیدہ مشائخ خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کے والد محترم جناب حفیظ الحق صاحب قابلِ احترام، عالم دین اور ایک صاحبِ اثر بزرگ تھے۔ قادری صاحب نے اپنی صدر نشینی کے دوران بعض بہت ہی اہم کارنامے انجام دیئے ہیں۔ مثال کے طور پر مخدوم ایوارڈ کی رقم ۲۵ ہزار روپیوں کو بڑھا کر ایک لاکھ روپے کر دیئے گئے۔ اور یہ مخدوم ایوارڈ سال گذشتہ حیدرآباد کے استادِ سخن جناب خواجہ شوق کے حصہ میں آیا۔ مخدوم ایوارڈ کے سلسلے میں قادری صاحب کو شہرہ

دیا کرتا تھا کہ مخدوم ایوارڈ صرف اور صرف حیدرآباد کے ہی کسی ایک شاعر
کو دیا جانا چاہیے۔ ایوارڈ کے لیے میں نے حیدرآباد کے تین اہم شاعروں
ڈاکٹر علی احمد جلیلی، سعید شہیدی اور خواجہ شوق کے نام پیش کیے تھے
میں نے حیدرآباد کے کسی ایک شاعر کو مخدوم ایوارڈ دینے کا مشورہ
اس لیے دیا تھا کہ قومی سطح پر حیدرآباد کے شاعروں کو ہمیشہ نظر انداز
کیا جاتا رہا ہے۔ قادری صاحب بار بار اپنی تقریروں میں میری تجویز کو
سراہتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ صلاح الدین نیر صاحب کے مشورہ سے
مجھے اتفاق ہے کہ اس سال مخدوم ایوارڈ حیدرآباد کے کسی ایک شاعر کو
دیا جانا چاہیے۔ قادری صاحب نے سال گزشتہ کارنامہ حیات ایوارڈ [illegible]
کا تعارف بھی پیش کیا [illegible] توقع ہے کہ سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی مختلف شعبوں سے تعلق
رکھنے والی شخصیتوں کو اعزازات سے نوازا جائے گا [illegible] کی تقریب تمام [illegible]
[illegible] جلسوں کے لیے [illegible] ایک [illegible]
[illegible]
[illegible] کی اشاعت کا کام مسعود بن سالم
صاحب کے زمانے میں شروع ہوا تھا [illegible] ڈاکٹر [illegible] کی [illegible]
کے لیے غیر معمولی دلچسپی لی تھی۔ اسی طرح ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی کتاب [illegible]
[illegible] بھی مسعود صاحب کی شخصی دلچسپی سے صورت گری کے مراحل [illegible]
[illegible] کے مجموعہ کلام [illegible] کی اشاعت کا کام [illegible]
مسعود بن سالم کے زمانے میں شروع ہوا تھا مسعود بن سالم کی خواہش [illegible]

اس مجموعۂ کلام کے لیے میں نے پیش لفظ لکھا ہے۔ یہ کتابیں صدر نشین
صاحب کی زیر سرپرستی زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہیں۔ اکیڈمی اور شہر کے
محبانِ اُردو کے لیے یہ ایک اعزاز ہے کہ جناب سید شاہ نورالحق قادری
ملک کی تمام اردو اکیڈیمیوں کی [illegible] کمیٹی کے متفقہ طور پر صدر نشین منتخب کیے گئے ہیں۔
یہ بات بھی قابلِ ستائش ہے کہ اکیڈمی نے سالِ رواں کل ہند مخدوم ایوارڈ کے علاوہ
چیف منسٹر صاحب کے اعلان کے بموجب چار اور ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ ایوارڈس
"قلی قطب شاہ ایوارڈ"، نواب میر عثمان علی خاں ایوارڈ، مہاراجہ
کشن پرشاد ایوارڈ اور صفی ایوارڈ کے نام سے موسوم کیے جائیں گے۔
یہ چاروں ایوارڈ بھی ایک ایک لاکھ روپیوں کے ہوں گے جو مختلف
اصناف ادب کے ماہرین کو دیئے جائیں گے۔ حال ہی میں زیر اہتمام
اردو اکیڈیمی ۱۲ر فروری ۲۰۰۲ء کی شام جوبلی ہال میں اعلیٰ پیمانے
پر گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ تلگو اردو کے نامور شاعر پدم بھوشن ڈاکٹر
سی۔ نارائن ریڈی سنارے کے اردو مجموعۂ کلام "بہتا ہوا نغمہ"
کی رسم اجراء تقریب منعقد ہوئی۔ جس کی صدارت صدر نشین اردو
اکیڈمی جناب سید شاہ نورالحق قادری صاحب نے کی تھی مہمان
خصوصی کی حیثیت سے نائب صدر نشین راجیہ سبھا ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ
صاحبہ نے شرکت کی تھی۔ اس شاندار تقریب کو ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ
جسٹس سردار علی خاں، پروفیسر مغنی تبسم، صلاح الدین نیر، قطب سرشار
اور مسٹر مدھو سودن نے مخاطب کیا تھا۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی نے

اظہار تشکر کیا۔ ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ نے رسم اجرا انجام دی۔ صدر نشین اُردو اکیڈیمی جناب سید شاہ نور الحق قادری نے خیر مقدمی و صدارتی تقریر کی اور اُردو اکیڈیمی کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی۔ ڈی۔ آر۔ او اُردو اکیڈیمی جناب حسن فرخ اجلاس کے کنوینر تھے۔ اُردو، تلگو کے نامور دانشوروں نے اس پُر اثر تقریب میں شرکت کی تھی۔ اکیڈیمی کی سرگرمیوں میں شامل کل ہند صنعتی نمائش کے موقع پر اُردو اکیڈیمی کا ایک بک اسٹال قائم کرنا بھی ہے اس سال بھی نہایت سلیقہ کے ساتھ بک اسٹال قائم کیا گیا تھا جس میں ملک بھر کے قلمکاروں کی اہم کتابوں کے علاوہ حیدرآباد کے نمائندہ شاعروں، ادیبوں کی کتابیں بھی بغرض نمائش و فروخت رکھی گئی تھیں۔ صنعتی نمائش کے موقع پر ۲۳ جنوری کی شب نمائش کلب میں بہ تعاون نمائش سوسائٹی اُردو اکیڈیمی کا مشاعرہ ہوا جس کی صدارت صدر نشین اُردو اکیڈیمی جناب سید شاہ نور الحق قادری نے کی۔ ڈی آر او اُردو اکیڈیمی جناب حسن فرخ ناظم مشاعرہ تھے۔ اس مشاعرہ میں شہر کے مختلف مکتب خیال کے منتخب شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا جناب حسن فرخ نے حسب مراتب شعراء کو دعوت سخن دی تھی توقع ہے کہ جناب سید شاہ نور الحق قادری صاحب صدر نشین اُردو اکیڈیمی کی راست نگرانی میں سال رواں بھی کارنامۂ حیات ایوارڈ کے علاوہ علمی و ادبی اداروں اور انجمنوں کے مسائل کی بھی بہتر انداز میں یکسوئی کی جائے گی اور اکیڈیمی کے فیصلے شہر کے تمام مستحق قلمکاروں کے حق میں رہیں گے اور ان فیصلوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا۔

ڈاکٹر علی احمد جلیلی

(کم آمیز، کم سخن اور قابلِ احترام استاد شاعر)

جو لوگ بے تاج بادشاہوں کی طرح علم کی دولت، فکر و خیال کی خوشبو دل و دماغ کی روشنی، ذہن و فکر کی شگفتگی، صبح کے اجالوں کی طرح لوگوں میں تقسیم کرتے ہیں، کم کم نظر آتے ہیں لیکن اس انحطاط اور گرتے ہوئے انسانی و اخلاقی معیار کے باوجود تخلیق کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا بھی چلتی رہتی ہے۔ ریگ زاروں کے طویل اور لامتناہی سفر کے دوران کبھی کبھی ٹھنڈے پانی کے چشمے مل جاتے ہیں گھٹن اور حبس کے ماحول میں تازہ ہوا کے جھونکے مشامِ دل و جاں کو فرحت بخشتے ہیں۔ یہ ہوائیں تپتے ہوئے حالات میں تازہ دم ہو کر سفر جاری رکھنے کی تلقین کیا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد جلیلی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے لیکن میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان کی زندگی کے ہر پہلو سے کماحقہٗ واقفیت رکھتا ہوں ان کے کلام کی خوبیوں کی تہوں تک پہنچ چکا ہوں۔ ان کی فکر اور ان کی

خیال کے سرچشمہ تک میری رسائی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے ڈاکٹر علی احمد جلیلی کو میں نے پہلی بار محبوب نگر کے ٹاؤن ہال میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں دیکھا تھا غالباً وہ صدرِ مشاعرہ تھے جناب عبدالرزاق صوفی ایڈوکیٹ نے مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ یہ بات ۳۰ برس پہلے کی ہے۔ ایک ایسا شاعر جو برسوں کلاسیکی ادب سے مانوس رہا، ایک ایسا شاعر جو شاعری کے جملہ رموز و نکات سے واقف ہو۔ فنِ عروض پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اعلیٰ درجہ کے استادانہ شعر کہتا ہو، ایسے محترم شاعر کے پاس جدید رنگ کے بھی بے شمار اشعار ملتے ہیں۔ حیدرآباد ہی کیا برصغیر کے صفِ اول کے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ علی احمد جلیلی شریف النفس، منکسر المزاج انسان ہیں ان کی نرم گفتاری، سبک خرامی، اِن کا ٹھہر ٹھہر کر بات کرنا، ان کا اپنا ایک انداز ہے۔ اِن کا یہ ایک ایسا رویہ ہے جو ان کی ذات کا ایک حصہ بنا ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو میں نے آج تک کسی بھی شخص کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ گفتگو کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اُن کا انداز ہمیشہ مخلصانہ رہا ہے۔

کثرتِ مطالعہ نے ڈاکٹر صاحب کو روشن خیال بنا دیا ہے صاف گوئی اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ معتبر شاعر، منفرد ادیب، با شعور نقاد اور متوازن محقق ہی نہیں ایک نفیس انسان بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے شاعرانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں اُن کی شاعری عظمت کی شہرت نہ صرف ہندوستان و پاکستان تک ہی محدود ہے بلکہ اردو دنیا میں ان کی شاعری کے چرچے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایسے شاعر ہیں جو دامانِ شعر و ادب میں ہمیشہ مہکتے رہیں گے گُلِ تازہ کی طرح ۔ (طویل مضمون سے اقتباس کہکشاں ۱۹۹۶ء)

خواجہ شوق

(وضع دار ۔ صوفی منش ۔ کہنہ مشق شاعر)

حیدرآباد کے دورِ حاضر کے اساتذۂ سخن میں حضرت خواجہ شوق بھی ایک اہم اور مستند شاعر کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ زائد از ۵۰ برسوں سے اپنی منفرد پایان کے ساتھ شعری و ادبی محفلوں میں اپنی شاعرانہ عظمت و فضیلت کا بھرپور احساس دلا رہے ہیں۔ حضرت خواجہ شوق ایک خاموش طبع، منکسر المزاج، وضع دار صوفی منش شاعر ہیں جو کلاسیکی شعر و ادب کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں، مختلف ذہن اور فکر کے شاگردوں کی سرپرستی کرتے ہیں۔ ان کے شاگردوں کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ شوق صاحب کے علاوہ ہمارے شہر کے شاعر تلامذہ حضرت اوج یعقوبی، سعید شہیدی، ڈاکٹر علی احمد جلیلی اور امیر احمد خسرو کے نام بھی خصوصیت کے ساتھ لیے جاتے ہیں۔ ان چار شاعروں میں حضرت اوج یعقوبی، سعید شہیدی اور امیر احمد خسرو ہم میں نہیں رہے

برسوں یہ شاعر حیدرآباد کے سب سے بڑے کل ہند مشاعروں
ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میں لازماً مدعو کئے جاتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر علی احمد
جلیلی اور تنویر شوق اب بھی مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ خواجہ تنویر
شوق کو ان کی شاعرانہ عظمت کے اعتراف میں اردو اکیڈمی آندھراپردیش کی جانب
سے ۲۰۰۱ء میں کل ہند مخدوم ایوارڈ سے نوازا گیا ہے ویسے بھی شوق
صاحب کو ان کی شعری خدمات کے سلسلے میں مختلف اردو اداروں اور
انجمنوں کی جانب سے ایوارڈز ملتے رہے ہیں لیکن مخدوم ایوارڈ ان تمام
ایوارڈز کے مقابلے میں ایک باوقار اور اہم ایوارڈ ہے شوق صاحب
غزلیں بھی کہتے ہیں، نعتیں اور منقبتیں بھی۔ ان کا کلام ان کے
استاد حضرت صفی اورنگ آبادی کے اسکول کی نمائندگی کرتا ہے۔
شوق صاحب کا حضرت صفی کے مخصوص اور جید شاگردوں
میں شمار ہوتا ہے نہایت قابل و دیدہ ور شاعر ہیں۔ ان کے نعتیہ کلام
کا مجموعہ "صل علیٰ" کے نام سے شائع ہو کر کافی مشہور ہو چکا ہے۔ ان کے
ہاں غزلوں کا بھی کافی ذخیرہ موجود ہے شوق صاحب کی منتخب غزلوں کا مجموعہ
کلام ۱۹۸۴ء میں "چشم نگراں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔
صاحب اعلیٰ درجہ کی نعتیں اور منقبتیں کہتے ہیں ان کا مذہبی کلام
عقیدت و احترام اور محبت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے انھیں بزرگان
دین سے گہرا لگاؤ ہے، صوفیائے کرام کا احترام کرتے ہیں بیسیوں
اولیائے کرام کی درگاہوں کی زیارت سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔

شاگردوں کی زائد از شعری مصروفیات سے اُن کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ شاعروں کے کسی بھی گروہ سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ جہاں اچھے لوگ ہوتے ہیں اچھی محفلیں سجتی ہیں وہاں جانا پسند کرتے ہیں آداب محفل کے معاملے میں اپنی آپ مثال ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ وضع داری صرف ان کے حصے میں آئی ہے بڑے سیدھے سادے انسان ہیں معاملات چاہے کسی بھی قسم کے ہوں اپنے اصول پر کاربند رہتے ہیں۔ شوق صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع ہوگا لیکن شاعروں کا حلقہ اتنا وسیع نہیں ہے شوق صاحب کے روابط بہت سوں سے ہو سکتے ہیں لیکن دوستانہ روابط بہت ہی کم لوگوں سے ہیں۔ استادِ سخن حضرت اوج یعقوبی بھی ان کے قریب ترین دوستوں میں سے ایک تھے شوق صاحب کے بعض باضابطہ شاگرد ہیں اور کچھ صرف مشورۂ سخن کرتے ہیں شوق صاحب نغمے بھی کلام سناتے ہیں۔ ۲۴ برس پہلے ترنم سے کلام سنانے تھے نظامس ٹرسٹ سے منتظم کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ صرفِ خاص میں کئی برس ملازم رہے اس زمانے میں کئی ایسے شاعروں نے بھی اُن سے اپنے کلام پر اصلاح لی جو خانوادۂ آصفیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ شوق صاحب کا ایک اہم ادبی کارنامہ حضرت صفی اورنگ آبادی کے مجموعۂ کلام کی اشاعت ہے یہ مجموعۂ کلام پراگندہ کے نام سے ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعۂ کلام کی رسمِ اجراء تقریب شاندار پیمانے پر ڈیوڑھی مکرم الدولہ بیتھر گٹی میں منعقد ہوئی تھی۔ اس رسمِ اجراء تقریب کے سلسلے میں

کل ہند مشاعرہ بھی ہوا تھا جہاں شاعروں میں اُردو کے دو عظیم شاعر فراق گورکھپوری اور نذیر بنارسی نے شرکت کی تھی۔ ہندی کے شاعر کالی داس گپتا راہی بھی اس مشاعرہ کے داعیان میں سے ایک تھے شوق صاحب حیدرآباد کے واحد شاعر ہیں جو ہمیشہ عطر بیز رہتے ہیں۔ محفل میں آتے ہی ساری محفل کو خوشبو سے مہکا دیتے ہیں۔ سفید شیروانی ان کا مخصوص لباس ہے شہر کے اکثر مشاعروں میں ان سے ملاقات ہوتی رہتی ہے اضلاع کے کئی مشاعروں میں ساتھ رہا ہے کم گو ہوتے ہوئے بھی خوش مزاج اور سنجیدہ رہا کرتے ہیں۔ مشاعروں میں بہ پابندی وقت شرکت کرتے ہیں ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعروں میں پابندی سے مدعو کئے جاتے ہیں حیدرآباد کے صفِ اول کے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے داد و تحسین سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ مشاعروں میں انہیں کہیں بھی، کسی وقت بھی پڑھایا جائے پڑھتے ہیں۔ تقدیم و تاخیر کا کوئی خیال نہیں رکھتے ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی کے مشاعروں میں ان کی نشست ہمیشہ صفِ اول میں ہوتی ہے۔ شوق صاحب کے ہم عصر سینئر اساتذہ سخن میں علامہ نجم آفندی، حیدر پاشاہ، حضرت قدر عریضی، مولانا کامل شطاری، سعید شہیدی، اوج یعقوبی، علی احمد جلیلی، سیف حموی، لانا معز ملتانی بھی قابلِ ذکر ہیں۔ حضرت شوق، نعیتہ اور منقبتی شاعروں میں خصوصیت کے ساتھ مدعو کئے جاتے ہیں۔ شوق صاحب کا

شاعر عروض کے ماہرین میں شمار رہے لیکن عموماً وہ علمی ادبی و عروضی مباحثوں میں دخل نہیں دیتے لیکن کوئی انہیں بحث کے لئے مجبور کرے تو وہ اپنے قلم کو جنبش دیتے ہیں۔ شوق صاحب کی زندگی وضع داری میں کٹ رہی ہے شہر کی نامور شخصیتوں سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں شاعروں ادیبوں کے تمام حلقے شوق صاحب کو پسند کرتے ہیں ان کی قدر کرتے ہیں شوق صاحب ۴۰ برس پہلے شام کے وقت نیا پل سے متصل ہوٹل تفریح دکن میں استادِ سخن حضرت ادیب یعقوبی کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے شوق صاحب نہایت پاکردار و پاک و صاف انسان ہیں۔ ہم نے اپنی ۴۰ سالہ شاعرانہ زندگی میں کسی سے بھی یہ نہیں سنا کہ انہوں نے کسی شاعر کی مخالفت کی ہو۔

انہیں شاعرانہ نام و نمود سے بھی دلچسپی نہیں ہے۔ جرائد کے لئے اپنا کلام نہیں بھیجا نے۔ کبھی کبھی "خوشبو کا سفر" میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے روزنامہ سیاست میں بھی ان کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے شوق صاحب جب کبھی مشاعروں میں آتے ہیں تو اُن پر نہ صرف شعرا کی بلکہ سامعین کی نظریں بھی جم جاتی ہیں اور دل ہی دل میں ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ کبھی کبھی مکمل غزل سے پہلے مختلف غزلوں کے کچھ منتخب شعر سناتے ہیں۔ شوق صاحب برسوں رہنمائے دکن کے شعری کالم کے انچارج رہے۔ رہنمائے دکن کے مدیر جناب وقار الدین صاحب سے ان کے اچھے مراسم ہیں۔ شوق صاحب کھلے دل و دماغ کے انسان ہیں پاک و صاف زندگی گذارنے کے عادی ہیں۔ اپنے انداز سے اپنے

ہیں ویسے تو ہر قسم کے شاعروں سے انہیں سابقہ پڑتا ہے لیکن اپنی مخصوص روش پر کاربند رہتے ہیں۔ اور ان کی وہ روش اُن کی شرافت، نفاست اور انسان دوستی ہے شوق صاحب میری اور میرے بعض ساتھی شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ حوصلہ افزائی میں بخالت سے کام نہیں لیتے ہیں اپنے زیر اثر محفلوں میں آپ کی شاعرانہ عظمت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کبھی صدر مشاعرہ کی حیثیت سے تو کبھی مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے مدعو کیا کرتا ہوں اور وہ بہ خوشی شرکت کرتے ہیں۔

خواجہ شوق صاحب ہمارے شہر کے اساتذۂ سخن میں سے ایک ہیں جن کی دل و جان سے قدر کی جاتی ہے۔

محمد متوّر علی

(وابستگی کی روشن مثال، نامور سینئر ادیب و صحافی)

جو لوگ وابستگی کے معنیٰ و مفہوم کو پوری دیانت داری کے ساتھ اپنی شخصیت میں سموتے ہوئے اپنے جسم و جان کا ایک اہم حصہ بنا لیتے ہیں اُن کا نام بھی اعلیٰ ظرفوں کی اولین فہرست میں نمایاں رہتا ہے۔ ایک خاص نقطۂ نظر سے کسی شخص یا کسی ادارہ سے وابستگی بھی ایک ایسا خوش گوار عمل ہے جو زندگی کے ہر موڑ پر سرخ روئی کے ساتھ سرسبز و شاداب رہا کرتا ہے۔ مستقل مزاجی ہر اُس شخص کا طرّہ امتیاز ہوتی ہے جس کے قدم کوئی بھی موسم کیوں نہ ہو کبھی نہیں لڑکھڑاتے۔ اِدھر اُدھر ہونے والے لوگ کبھی مطمئن زندگی نہیں گذار سکتے۔ زندگی کے ابتدائی سفر میں جو خوشبو، دل و دماغ کو مہکاتی رہی ہے۔ اُس خوشبو کو تہذیب گل تر کی طرح نس نس میں سمو لینا باکردار لوگوں کی زندگی کا اعلیٰ وصف سمجھا جاتا رہا ہے۔ زندگی کے سفر میں ایک انسان کو نت نئے حالات سے

آنکھ ملانا پڑتا ہے۔ دوران سفر کئی موسم آتے بھی ہیں اور جاتے بھی ہیں لیکن جو لوگ صحیح وقت پر صحیح فیصلے کرتے ہیں اُن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ چشمۂ آب رواں کی طرح حیات جاوداں بن جاتا ہے۔ معاشرہ میں اپنے انداز سے جینے والے لوگ اپنی ساری زندگی کو آئینہ صفات بنالیتے ہیں۔ متوازن زندگی، نظم حیات اور اعتدال پسندی انسان کو ہمیشہ بلندی سے ہمکنار کردیتی ہے (ارفع و اعلیٰ مقام پر پہنچا دیتی ہے) جو لوگ دیانتداری، فرض شناسی اور جذبۂ وابستگی کے ہر شائستہ عمل کو ہر صبح کی پہلی کرن سمجھتے ہیں ان کا ایک ایک پل اُجالوں کا ہم سفر رہتا ہے۔ اس طرح کی خصوصیات و کیفیات کی آئینہ دار شخصیت جناب محمد منور علی کی بھی ہے۔ جن کا ہر عمل مثبت انداز کی پاسداری کیا کرتا ہے۔ ملک کے عظیم اخبار "سیاست" سے منور علی صاحب کا اٹوٹ رشتہ ہے۔ وہ زائد از ۴۵ برسوں سے سیاست سے جڑے ہوئے ہیں۔ سیاست سے اُن کی وابستگی مثالی ہے۔ اُن کی وابستگی کا ایک ایک لمحہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے ہمیشہ سیاست کی بہتری و برتری اور اُس کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لئے دیانتداری و فرض شناسی کے ساتھ اپنے اٹوٹ رشتہ کو باقی رکھا ہے۔ وہ "نئی روشنی" کے چشمۂ نور سے اکتساب کرتے ہوئے سیاست سے اپنی گہری دلبستگی اور وفاداری کا بھرپور ثبوت دے رہے ہیں منور علی صاحب اس وقت سیاست اخبار کے سب سے سینئر صحافی ہیں۔ بلاوقفہ ان کی خدمات "سیاست" کے لیے جاری ہیں۔

ہیں ۱۹۵۹ء میں سیاست اخبار سے محفلِ شعر کے کالم کی وساطت سے وابستہ ہوا۔ سیاست اخبار سے میری والہانہ وابستگی آج تک بھی برقرار ہے۔ منور علی صاحب مجھ سے سینیئر ہیں۔ وہ ایک جونیئر صحافی سے لیکر سینیئر صحافی تک کی خدمات کے تمام مرحلوں میں ایک قابل ترین صحافی کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب نے ان کی قدر و منزلت کو محسوس کرتے ہوئے انہیں سیاست سے وابستہ بہت سے اہم کالم میں بھی دخیل رکھا تھا منور علی صاحب نے اپنی صحافتی زندگی میں سیاست کے لیے بے شمار انٹرویوز، فیچرز، تجارتی اور موضوعاتی مضامین لکھے ہیں۔ مختلف اوقات میں سیاست کے ہر شعبہ سے اُن کا گہرا تعلق رہا ہے۔ سب سے اہم یہ بات ہے کہ منور علی صاحب کی ساری ملازمت اعتماد کی فضاء میں گذری۔ جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب سیاست کے ہر اہم مسئلہ پر اُن سے بھی نہ صرف مشورہ کرتے تھے بلکہ اُن کی مشاورت سے استفادہ کرتے تھے۔ میں نے بہت قریب سے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کا سلوک منور علی صاحب کے ساتھ کبھی بھی ماتحتین کی طرح نہیں رہا۔ ہمیشہ اپنے ایک بہترین رفیق کار کی طرح اُن کی عزت کرتے تھے ان دونوں محترم شخصیتوں کی زیر سرپرستی انہوں نے اپنی تمام صحافتی زندگی نیک نامی کے ساتھ گذار دی۔ سیاست کے بھرپور تعاون سے منعقد ہونے والے ادبی ٹرسٹ کے کل ہند مشاعروں کے انتظامی اُمور کے سلسلے میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہا

کرتے ہیں مشاعروں کی ابتدائی تیاریوں سے لے کر اختتام مشاعرہ تک وہ ادبی ٹرسٹ سے بھرپور تعاون کرتے رہے۔ آج بھی مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں اُن کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا ہے مشاعروں کی آمدنی کا ایک اہم ذریعہ سووینیر کے لیے اشتہارات کا حصول ہے جناب عابد علی خان صاحب کی راست نگرانی و ہدایت کی روشنی میں اشتہارات کے لیے منور علی صاحب کی خدمات اہم رہیں ہیں ــــ شعبۂ اشتہارات سے ہٹ کر مشاعروں کے دیگر توجہ طلب اُمور کی یکسوئی کے لیے بھی وہ بھرپور تعاون کیا کرتے تھے۔ جناب عابد علی خان صاحب کے دولت خانے (عابد منزل) پر ہونے والے تہذیبی پروگرام کے سلسلے میں وہ سرگرم عمل رہا کرتے تھے۔ عابد علی خان صاحب کے تمام افرادِ خاندان منور علی صاحب کی قدر کرتے ہیں۔ جناب عابد علی خان صاحب سے وابستہ ہر تقریب میں منور علی صاحب موجود رہے ہیں۔ جناب محبوب حسین جگر نے اپنی علالت کے آخری دنوں میں سیاست کے اتوار ادبی ایڈیشن کی ذمہ داری منور علی صاحب کو سونپی تھی، جگر صاحب کی سونپی ہوئی ذمہ داری کو منور علی صاحب، جناب زاہد علی خاں صاحب کی زیرِ نگرانی بہ حُسن و خوبی انجام دے رہے ہیں جگر صاحب کے انتقال کے بعد زاہد علی خان صاحب نے مختلف ایڈیشنوں کا سیاست میں اضافہ کیا۔ ہر ایڈیشن بہترین انداز میں شائع ہو رہا ہے۔ جس سے اخبار کی مقبولیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ایک ماہر صحافی اور نباضِ وقت کی طرح جناب زاہد علی خان صاحب

سیاست کی مقبولیت کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔ آئے دن سیاست کے زیر اہتمام مختلف نوعیت کی ادبی، ثقافتی، فلاحی، دینی و ملی تقاریب منعقد ہوا کرتی ہیں۔ سیاست کا تمام اسٹاف پوری دیانتداری اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف رہا کرتا ہے۔ زاہد علی خان صاحب کو باصلاحیت، ایماندار اسٹاف کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ نہ صرف دفتر کے ہر شعبہ میں کام کرنے والے ہی دیانتدار اور فرض شناس ہیں بلکہ تمام رپورٹرس، سب ایڈیٹرس اور نامہ نگاروں کے علاوہ دیگر ملازمین بھی خوش دلی کے ساتھ اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ منور علی صاحب میں اتنے بڑے ادارے سے وابستہ ہونے کے باوجود غرور، تکبر اور انانیت جیسی نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ ایک نیک صفت سادہ مزاج، اصول پسند، پاک و صاف انسان ہیں۔ ان کی وضعداری مثالی ہے۔ کچھ اس انداز سے اپنی خدمات انجام دیتے رہے ہیں کہ ان سے کسی کو بھی شکایت نہیں ہے۔ نہایت سنجیدہ طبیعت ہونے کے باوجود اپنے مخصوص حلقۂ احباب میں کھل کر قہقہہ لگاتے ہیں آداب گفتگو کا لحاظ اور شائستہ طرز تکلم ان کا مخصوص وصف ہے منور علی صاحب ہر کس و ناکس کے ساتھ گھل مل جانا پسند نہیں کرتے۔ دفتر کے تمام ساتھیوں سے ان کے خوشگوار تعلقات ہیں۔ شعبۂ ادبی و تہذیبی ایڈیشن سے تعلق رکھنے والے متعلقہ افراد کا بھی انہیں مکمل تعاون حاصل ہے۔ زاہد علی خان صاحب کا سلوک ان کے ساتھ دوستانہ ہے۔ زاہد صاحب، منور علی صاحب کی نہ صرف

عزت کرتے ہیں بلکہ ان پر مکمل بھروسہ کرتے ہیں۔ زاہد علی خاں صاحب کی یہ بھی ایک اعلیٰ ظرفی ہے کہ وہ اپنے والدِ محترم جناب عابد علی خاں صاحب اور چچا جناب محبوب حسین جگر صاحب سے قریب رہنے والوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ زاہد علی خاں صاحب کا مربیانہ، مشفقانہ، سلوک، ان کی باوقار شخصیت کا غماز رہا کرتا ہے۔ تمام اسٹاف سے دوستانہ ماحول و خوشگوار فضاء میں کام لیتے ہیں۔ منور علی صاحب کی شہر کے تقریباً تمام دانشوروں، شاعروں، ادیبوں سے مراسم ہیں۔ وہ بہت کم لوگوں سے بے تکلف ہوتے ہیں۔ سیاست کے اتوار ایڈیشن کے مرتب کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کو نہایت عمدگی سے نبھا رہے ہیں۔ منور علی صاحب کی سیاست میں شائع شدہ ادبی، سیاسی و تہذیبی تحریروں کو اکٹھا کیا جائے تو کئی کتابیں شائع ہو سکتی ہیں۔ منور علی صاحب مستند ادیب کی حیثیت سے منظرِ عام پر آنے کے مستحق ہیں لیکن اس سلسلے میں ان کی افتادِ طبع ہمیشہ حائل رہا۔ اگر منور صاحب کی منتخب تحریریں شائع ہوں تو اردو کے ادبی سرمایے میں ایک خوشگوار اضافہ ہوگا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ صبح کبھی تو آئے گی لیکن کب آئے گی نہیں معلوم۔ کسی ادارہ سے اتنی لمبی مدت تک کے ساتھ وابستہ رہنا خوش نصیب لوگوں کے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔ میں ہمیشہ اس بات کا قائل رہا ہوں کہ ہر انسان کو اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں کو یاد رکھنا چاہیے۔ بہترین مستقبل کا دارومدار اپنی بنیادوں کا مرہونِ منت رہتا ہے جو زندگی کے

سفر میں ایک ایک پل ساتھ رہتا ہے۔ منور علی صاحب کی سیاست سے والہانہ دیانتدارانہ وابستگی قابل تحسین ہے۔ اس طرح کے کشادہ دل و دماغ رکھنے والے لوگوں کے صبح و شام خدائے قدوس کے دربار میں سرخ رو رہنے کے لیے شکر بجا لایا کرتے ہیں۔

چندر سری واستو

(بے باک ذہین صحافی۔ نامور دانشور)

ہمارے شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں ہر دور میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں نے اپنی اپنی صلاحیتوں سے اپنے اپنے میدان میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ کوئی ایک دور بھی تہی دامن نہیں رہا۔ اگر ہم دورِ حاضر کے ذہین صاحبانِ فکر و خیال باکمال شخصیتوں اور نمایاں خصوصیات کے حامل اربابِ فہم و ادراک کے بارے میں غور کریں تو بہت سے لوگوں میں سے ایک اہم نام ذہن و خیال کے افق پر ابھر کر آئے گا جس کو ہم چندر سری واستو کے نام سے جانتے ہیں۔ چندر سری واستو صاحب ایک ذہین صحافی کی حیثیت سے اپنے شعبہ میں اپنی غیر معمولی ذہانت و صلاحیت کا ثبوت دیتے آئے ہیں نہایت قابل و باخبر سینئر صحافی ہیں۔ جناب چندر سری واستو نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز "رہنمائے دکن" اور "بھارت نیوز" سے کیا۔ وہ

رہنمایانِ دکن کی طرح بھارت بیوز سے بھی برسوں وابستہ رہے ہیں۔ اُردو
تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ انجمن تحفظ اُردو کے نام
سے ایک فعال اور کارکرد انجمن کا قیام عمل میں لایا جس کے وہ بانی
جنرل سکریٹری ہیں۔ جناب ایم باگا ریڈی سابق ریاستی وزیر صدر
اور ڈاکٹر مصطفیٰ کمال جوائنٹ سکریٹری ہیں۔ ایک زمانے میں
انجمن تحفظ اُردو کی سرگرمیاں بامِ عروج پر تھیں۔ اُردو کے مسائل
پر حکومتِ وقت کے ساتھ آنکھ میں آنکھ ملا کر بات کرنے والی
شخصیتوں میں چندرسری واستو پیش پیش رہتے تھے۔ اُردو زبان
اور تعلیم اور اس سے متعلق مختلف امور کے سلسلے میں ہمیشہ متحرک
رہے۔ خاص طور پر پی وی نرسمہا راؤ کے زمانے میں انجمن تحفظ اُردو
نے اپنی بہترین کارکردگی کا ثبوت دیا۔ چندرسری واستو صاحب
اُردو کے تصفیہ طلب مسائل کی یکسوئی کے سلسلے میں ہمیشہ اُردو والوں
کے ساتھ صفِ اول میں رہے۔ ڈائرکٹر اُردو اکیڈیمی کی حیثیت سے بھی
کی سرگرمیاں نیز تر ہو گئی تھیں۔ چندرسری واستو صاحب فائن آرٹس
اکیڈیمی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کی سرگرمیوں سے بھی دلچسپی لیتے رہے
کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے جلسہ رحمت للعالمین اور نعتیہ مشاعروں کے انعقاد
کے سلسلے میں بھی اہم رول ادا کرتے رہے۔ اب بھی وہ مجلس اتحاد المسلمین
سے وابستہ ہیں۔ چندرسری واستو کا شمار میرے قریبی کرم فرماؤں اور
دوستوں میں ہوتا ہے۔ اُن سے میرے مراسم تقریباً ۳۵ برس سے ہیں۔ یہ

اس بات کا اندازہ ہے کہ وہ ہمیشہ میری قدر افزائی کرتے رہتے ہیں
مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب وہ ڈائرکٹر اکیڈیمی تھے تو انہوں نے حیدرآباد
کے شاعروں، ادیبوں سے اکیڈیمی کی سرگرمیوں اور اس کی بہتر
کارکردگی کے بارے میں رائے مانگی تھی۔ میں نے ایک طویل خط
مختلف تجاویز کی شکل میں روانہ کیا تھا اس خط میں وضاحت طلب باتیں
بھی تھیں مجھے خوشی ہوئی کہ انہوں نے میری تجاویز پر مثبت انداز میں
غور کیا اور مجھ سے ایک ملاقات میں کہا کہ آپ حیدرآباد کے پہلے شاعر
ہیں کہ آپ نے واضح طور پر بلا کسی تحفظِ ذہنی، اپنی تجاویز پیش کی ہیں
جیندر صاحب میری شعری و ادبی مصروفیات سے ہمیشہ باخبر رہے۔ انہیں
یہ بھی یاد ہے کہ میں پرانے شہر کی مشہور بزم شعر و سخن کا۔ بزم جیون کا
معتمد تھا جس کے بانی جیون لعل تھے جن کی پتھر گٹی پر کپڑے کی ایک بڑی
دوکان تھی۔ اس زمانے میں اس بزم کے زیر اہتمام ہونے والے
مشاعروں کی کافی دھوم تھی۔ میری خواہش پر ایک مشاعرہ کی صدارت
مخدوم محی الدین صاحب نے بھی کی تھی۔ شہر کے مختلف مکتبِ خیال کے شعراء
ان مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے سالانہ
کل ہند نعتیہ مشاعرے کے سلسلے میں مجھے جیندر رسری و استوا صاحب کا تعاون
حاصل رہا کرتا تھا۔ میں نے مجلس کے زیر اہتمام منعقدہ کئی مشاعروں
کی معتمدی کے فرائض انجام دیئے ہیں پہلے یہ مشاعرے مجلس کے آفس
کی عمارت میں ہوتے تھے جس میں صرف حیدرآباد کے شعراء کلام

سُنتے تھے اور مشاعرے جناب عابد علی خان صاحب کی زیرِ نگرانی ہوتے تھے
عابد علی خان صاحب نے ہی مجلس کے سالانہ جلسہ رحمۃ اللعالمین کے موقع پر
کُل ہند نعتیہ مشاعرہ کا آغاز کیا۔ کئی برس تک عابد علی خان صاحب مجلس کے
مشاعروں کے نگران رہے۔ ۳، ۴ سال پہلے دو تین مشاعروں کے سلسلے
میں چند صاحب سے شعراء کی فہرست کو قطعیت دینے کے وقت مجھے
بڑی مدد ملی۔ جب نواب شاہ عالم خان صاحب مجلس استقبالیہ کے صدر
تھے تو اُس مشاعرہ اور انتظامات کے سلسلے میں وقتاً فوقتاً اجلاس
ہوا کرتے تھے۔ میں جب مشاعرہ کا معتمد نامزد کیا گیا تو کمیٹی نے اختیار
دیا تھا کہ میں اپنے طور پر شعراء کی فہرست مرتب کروں۔ چنانچہ میری دی
ہوئی فہرست کو منظوری حاصل ہو جاتی۔ چند برسوں سے وہ مستقل ہی اجلاس
میں رہتے۔ وہ مسرت محسوس کرتے تھے کہ ناظم مشاعرہ کی حیثیت سے میری
خدمات حاصل کی جا رہی ہیں۔

۴ سال جشن حیدرآباد تقاریب جدہ میں بھی اُن کا ساتھ رہا۔ وہ
جناب سلطان صلاح الدین اویسی صاحب کے ہمراہ شرکت کے لیے آئے تھے
اس عالی شان تقریب میں جناب عابد علی خان صاحب، جناب محبوب حسین
جگر صاحب، ہاشم علی اختر صاحب، جناب صلاح الدین اویسی صاحب
نے بھی شرکت کی تھی۔ شہر کے مختلف شعراء حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ
طالب خوندمیری، صبغتہ اللہ بھباٹے لوگس حیدرآبادی، علی الدین نوید
اور میں نے بھی شرکت کی تھی

جناب چندر سری واستو کا تعلق شہر کے شریف النفس کائستھ گھرانے سے رہا ہے۔ شرف بہ اسلام ہونے کے بعد انہوں نے اپنا نام حسین علی رکھا ہے۔ چندر سری واستو صاحب کو عمرہ کی سعادت بھی حاصل ہوئی اور انہیں زیارت رسالت مآبؐ کا بھی شرف حاصل ہوا۔ جب وہ رہنمائے دکن میں ایک سینئر صحافی کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہے تھے تو اُن دنوں انہیں شہر کے مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی سیاسی، ادبی، سماجی، تہذیبی، علمی و ملی شخصیتوں سے ملاقات کا موقع ملتا رہا۔ شہر کے تقریباً تمام مشاہیر سے ان کی رسم و راہ ہے مدیران رہنمائے دکن لطیف الدین قادری صاحب اور وقار الدین قادری صاحب کے دست راست کی حیثیت سے رہنمائے دکن سے وابستہ رہے۔ جناب وقار الدین کی زیر سرپرستی قائم انڈو عرب سوسائٹی کی سرگرمیوں میں کلیدی رول ادا کیا۔ چندر صاحب نے عراق اور ایران کا بھی دورہ کیا ہے چندر صاحب چیف منسٹر آندھرا پردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی کے منظور نظر رہے۔ جناب ایم باگا ریڈی سابق رکن پارلیمنٹ سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں۔ چنا ریڈی صاحب کی چیف منسٹری کے زمانے ہی میں چندر صاحب ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی مقرر ہوئے۔ بھارت نیوز کے ایڈیٹر جناب اعجاز قریشی ان کے قریبی دوست ہیں۔ بھارت نیوز کے کمرہ میں ہی جناب سلیمان اریب کی ادارت میں ہونے والے ادبی رسالے "صبا" کا دفتر تھا جہاں شہر کے نمائندہ شاعر و ادیب، اریب صاحب سے ملاقات

کے لیے آتے تھے۔ جناب چندر سری واستو ایک نڈر و بے باک صحافی ہیں
بلا خوف و خطر اپنی صحافتی خدمات انجام دیتے رہے۔ اب بھی ان کی خدمات
کا تسلسل باقی ہے۔ جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب
سے بھی اُردو کے مسائل پر رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ مدیر سیاست جناب زاہد
علی خان صاحب سے ان کے اچھے مراسم ہیں۔ چندر صاحب کبھی کبھی سیاست
آفس آتے ہیں۔ اگر میں موجود رہوں تو مجھ سے ضرور مل لیتے ہیں۔ ہر ملاقات
میں زبان و ادب سے میری دلچسپی کو سراہا کرتے ہیں۔ چندر صاحب بہت ہی
صاف گو، اصول پسند اور دیانت دار انسان ہیں۔ انھوں نے اپنے اثر و
رسوخ سے کئی ضرورت مندوں کی مدد کی ہے۔ میرے ہم خیال شاعر دوستوں
میں ناصر کرنولی اور رئیس اختر کو بہت پسند کرتے ہیں۔ مشاعروں اور ادبی
جلسوں میں بہت کم شرکت کرتے ہیں۔ لیکن انھیں حیدر آباد کے
شاعروں، ادیبوں کی قدر و قیمت کا اندازہ ہے۔ شہر کے تقریباً تمام اہم
شاعروں سے ان کے خوشگوار مراسم ہیں۔ پرانے شہر کے شاعروں میں اوج
یعقوبی صاحب اور سعید شہیدی صاحب اُن کے پسندیدہ شاعر تھے۔ فائن
آرٹس اکیڈمی کے سربراہ حمایت اللہ، شگوفہ کے مدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال اور
بھارت نیوز کے ایڈیٹر جناب اعجاز قریشی کی اہمیت کو وہ محسوس کرتے
ہیں۔ اُن کے رفقائے کار میں حسن فرخ صاحب اُن سے بہت قریب ہیں
چندر صاحب جس زمانے میں اُردو اکیڈمی کے ڈائرکٹر تھے اسی زمانے میں
انھوں نے اُردو اکیڈمی کے پی۔ آر۔ او کی حیثیت سے جناب حسن فرخ صاحب

کا تقرر کیا۔ ان کے زمانے میں جناب اختر حسن اور جناب رشید قریشی بھی اُردو اکیڈمی سے وابستہ تھے۔ اِن دنوں چندر سری واستو صاحب اپنی خرابئ صحت کی وجہ سے محفلوں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے فکر و خیال اور ان کی ذہانت و فطانت کی روشنی کا ہمیں احساس ہوتا رہتا ہے ہر دور میں کچھ لوگ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے بہت سوں کے لیے سرمۂ نظر بنتے رہتے ہیں۔ آج بھی چندر سری واستو جیسے لوگ ہمارے معاشرہ میں موجود ہیں۔ میں دل کی گہرائیوں کے ساتھ چندر صاحب کی اس لیے قدر کرتا ہوں کہ وہ نہایت کھرے، سچے، بے باک، بے خوف، خوددار اور بہترین انسان ہیں۔ جو لوگ اپنے نصب العین اور اپنے مسلک پر قائم رہتے ہیں وہ ہر دور میں اپنی مقبولیت و اہمیت کے ساتھ یاد کیے جاتے رہیں گے۔ چندر صاحب کی قابلیت و صلاحیت مروت و دوستی کی خوشبو دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہے اور یہ خوشبو میرے فکر و خیال کو بھی مہکا رہی ہے۔

اُردو شعر و ادب اور اُردو تہذیبی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتے تھے میرے سینئر اور جونیئر ساتھیوں میں محمد عمر، محمد سعید، محمود نواز (علم تعلیمن) کے علاوہ رحیم الدین عزیزی، محمد افضل عبدالرحیم، محمد علی عابدی، شانتی کمار، خواجہ معین الدین، خواجہ بہاءالدین، علیم الدین افضل حسین، بی ایس واگھرے، نرسمہا راؤ، پیربھاکر راؤ، علی نواز خان، کشٹا کرن اور ارجن راؤ وغیرہ شامل تھے یہ تمام میرے ہم خیال تھے جو پلاننگ، پنچایت راج ڈپارٹمنٹ سکریٹریٹ کے مختلف سکشنوں میں متعین کیے گئے۔

میری تعیناتی صیغۂ انتظامی میں عمل میں آئی۔ منتظم مسٹر لالا جوگا راؤ تھے یو ڈی سی پی نرسمہا راؤ۔ یہ دونوں نہایت نفیس، شریف النفس انسان تھے جو دیگر آندھرائی ملازمین سے بالکل مختلف تھے۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ حیدرآبادی ملازم سرکار جاگیردارانہ نظام کے پروردہ ہیں، نواب زادے ہیں جو آرام طلب ہیں آفس کے کام سے ناواقف ہیں، کام سے عدم دلچسپی رکھتے ہیں (حالانکہ یہ ساری باتیں غلط تھیں) ہمارے محکمہ کے پہلے سکریٹری مسٹر پی نرسمہم تھے جو انتہائی متعصب اور سخت گیر انسان تھے۔ انہوں نے ایک دن تلنگانہ سے تعلق رکھنے والے ملازمین (یل ڈی سی سے لے کر منتظم تک) کو اپنے اجلاس پر طلب کیا۔ جیسے ہی ہم لوگ سکریٹری صاحب کے روم میں پہنچے۔ انہوں نے ایک سرسری نظر ہم پر ڈالی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ پھر انہوں نے ڈانٹنے کے انداز میں ہم سے کہا کہ تم لوگوں کو میرے ہاں آتے ہی اپنا تعارف کرانا چاہیئے۔ چنانچہ ہم لوگوں نے جو ایک صف میں روم کی دیوار سے لگے کھڑے تھے اپنا تعارف کروایا۔ دراصل وہ اپنے اس رویہ سے یہی

ہمیں مرعوب کرنا چاہتے تھے سکریٹری صاحب کے اس اہانت آمیز رویہ سے میں بہت متاثر ہوا اور مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ "زمین اپنی قدم دوسروں کے" حقیقت یہ ہے کہ تلنگانہ ملازمین نے ملازمت کی ہر سطح پر اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ سکریٹریٹ میں میں اپنے مخصوص حیدرآبادی لباس (شیروانی) پہن کر یہ احساس دلاتا رہا کہ میں حیدرآبادی ہوں اور مسلمان ہوں۔ میں سکریٹریٹ میں اپنی ۳۲ سالہ ملازمت کے دوران صرف اور صرف ــــ پنچایت راج ڈپارٹمنٹ میں ہی مامور رہا۔ میری ملازمت کا زیادہ حصہ اکاونٹس اور آڈٹ سکشن میں گزرا۔ مجھے بعض تلنگانہ کے ملازم ساتھیوں کے ساتھ ۱۹۵۷ء میں بہ حیثیت یو ڈی سی ترقی ملی۔ پھر میں سکشن آفیسر ہوا اور اسی عہدہ پر ریٹائر ہوا۔ ان تمہیدی باتوں کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ اس زمانے میں سکریٹریٹ میں کس طرح کا ماحول تھا۔ سکریٹریٹ میں محبان اردو کی کافی تعداد تھی ــــ لیکن کوئی ادبی انجمن موجود نہیں تھی۔ ان دنوں سکریٹریٹ میں آندھراپردیش کلچرل اسوسی ایشن سرگرم عمل تھی جس کے سالانہ جلسے ایک ہفتہ تک جاری رہتے۔ کلچرل اسوسی ایشن سے تلنگانہ کے ملازمین بھی وابستہ تھے چونکہ یہ آندھرائی ملازمین اور تلنگانہ ملازمین کی مشترکہ تہذیبی انجمن تھی۔ ہم اپنی کوششوں سے ان سات روزہ پروگرام کے دوران اردو پروگرام کے لئے ایک دن حاصل کر لیا کرتے اس میں بھی ہمیں صرف نصف گھنٹہ کا وقت دیا جاتا تھا لیکن پھر بھی ہم نے

ایک گھنٹہ کا پروگرام بھی پیش کیا۔ ایک پروگرام میں ہم نے مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا تھا جس کا میں کنوینر تھا اس مشاعرہ میں شہر کی نمائندہ شاعروں نے شرکت کی تھی۔ اردو پروگرامس میں کبھی محفل موسیقی ہوتی تو کبھی قوالی۔ لطیفہ گوئی، ڈرامہ بھی آراستہ کیا جاتا تھا۔ اردو کلچرل پروگرامس کے سربراہ خواجہ بہاء الدین، عباس ہاشمی، محمد حسین افضل حسین، بہادر علی، شکیل احمد وغیرہ ہوتے تھے۔ اس ماحول میں میں نے تہیہ کر لیا کہ کسی طرح سکریٹریٹ میں اردو اسوسی ایشن قائم کی جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے دوستوں خواجہ بہاء الدین، عباس ہاشمی، علیم الدین، افضل حسین، بی این دا گھرے، شکیل احمد، کشنا کرن پربھاکر راؤ، نرسمہا ریڈی کے مشورہ اور تعاون سے سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے نام سے ایک ادبی و تہذیبی ادبی انجمن کا قیام عمل میں لائے۔ جس کے پہلے صدر بھارت چند کھنہ آئی اے ایس، غلام احمد (مشہور کرکیٹر) اسٹنٹ سکریٹری رشید قریشی اسٹنٹ سکریٹری اور جیا راؤ ڈپٹی سکریٹریٹ نائب صدور نامزد کئے گئے۔ مجھے بانی جنرل سکریٹری نامزد کیا گیا۔ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے زیر اہتمام بے شمار پروگرام ہوتے رہے۔ میں نے سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن سے سکریٹریٹ کے تقریباً تمام محبان اردو بشمول عہدہ داران سکریٹریٹ کو وابستہ کیا اس دوسرے تمہیدی نوٹ کے بعد میں ایم اے نعیم ڈپٹی سکریٹری مینارٹیز ڈپارٹمنٹ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی کی سکریٹریٹ کی ابتدائی ملازمت اور

ان کے ادیبانہ ذوق و شوق کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔
جناب ایم اے نعیم سکریٹریٹ میں مجھ سے جونیر تھے جن کا تقرر ۱۹ نومبر ۱۹۶ کو ریونیو ڈپارٹمنٹ میں ہوا تھا اب وہ ڈپٹی سکریٹری مینارٹیز ڈپارٹمنٹ ہونے کے علاوہ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ نعیم صاحب جامعہ عثمانیہ سے بی۔کام اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ میں نے نعیم صاحب کو پہلی دفعہ ریونیو ڈپارٹمنٹ میں دیکھا تھا جہاں وہ کارگزار تھے۔ نعیم صاحب نہایت خاموش، کم آمیز اور ایک شریف النفس انسان کی طرح اپنی سرکاری ذمہ داریوں کو سلیقے سے نبھا رہے ہیں نہایت باصلاحیت، اصول پسند، دیانت دار، فرض شناس عہدہ دار ہیں یہ خوبیاں ان میں ان کی ابتدائی ملازمت کے زمانے سے ہی ہیں۔ میں نے سکریٹریٹ میں ان کی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں یہ محسوس کیا تھا کہ وہ اپنے کام سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں۔ سکریٹریٹ میں ریونیو ڈپارٹمنٹ بڑی اہمیت کا محکمہ ہوتا ہے۔ نعیم صاحب کی ساری ملازمت یعنی ڈپٹی سکریٹری کے عہدہ تک بے داغ اور شفاف آئینہ کی طرح رہے ہے۔ پاک و صاف ان کا سروس ریکارڈ ہے نہایت ملنسار، با اخلاق بامروت شخصیت کے حامل ہیں۔ نعیم صاحب ایک دیندار، پابند صوم و صلوٰۃ نیک انسان ہیں نعیم صاحب جب ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی مقرر ہوئے تو مجھے اس لئے بھی زیادہ مسرت ہوئی کہ میرے سکریٹریٹ کے ایک ساتھی اکیڈیمی کے ایک اہم عہدہ پر فائز ہیں۔ ایک فرض شناس

ایماندار اور بے پُردقار شخصیت کو حکومت نے ڈائرکٹر اکیڈیمی کی حیثیت سے مامور کر کے ایک اچھا اقدام کیا ہے صدر نشین اُردو اکیڈیمی جناب سید شاہ نورالحق قادری صاحب کو نعیم صاحب کا بھرپور تعاون حاصل ہے دونوں میں خوشگوار مراسم ہیں دونوں کی یہ دلی خواہش ہے کہ اُردو اکیڈیمی بہتر سے بہتر انداز میں سرگرم عمل رہے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ پی آر او اُردو اکیڈیمی ممتاز شاعر جناب حسن فرخ کے علاوہ چیف اکاونٹس آفیسر محمد محی الدین شریف، سینیئر سوپروائزر جناب محمد عمر کا بھی نو ... کہ نکا تعاون حاصل ہے یہ تینوں ارکان ان کے با اعتماد رفیق

ان کی فرض شناسی، احساس ذمہ داری اور بہترین
نہ کرتے ہیں ممکن ہے کہ دیگر اسٹاف سے بھی وہ مطمئن
میں نے محسوس کیا ہے تینوں شخصیتیں خراج تحسین
ں۔ نعیم صاحب انتہائی سادگی پسند، پُرخلوص، آئینہ
حامل ہونے کے علاوہ بلند کردار معتبر انسان ہیں۔
خاص طور پر ہر اس شخص کے لیے اپنا دامن
و نیک نامی کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر طے کرتا
تے پھولوں اور لہلہاتے ہوئے موسم گل کی طرح۔
دیب بھی ہیں) ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں افسانوں
" کے نام سے اور مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "گھر کا نہ گھاٹ کا"
کتابیں ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوئیں ہیں۔

جیلانی بیرک

(ہمہ رنگی پیکر۔ رواں دواں شخصیت)

زندگی کے کسی ایک خاص رنگ میں ڈھلنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہمہ رنگی پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے ایک ایسے گلدستہ کی تشکیل کی جائے جو مختلف خوشبوؤں کی آمیزش کا مظہر ہو۔ ہمہ اقسام کے پھولوں کو جب ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے تو ہر پھول اپنی علاحدہ خوشبو، اپنی علاحدہ پہچان کے ساتھ اپنے وجود کو برقرار رکھتا ہے اور بہ حیثیت مجموعی ایک شکل نمودار ہوتی ہے جو اپنا الگ وجود رکھتے ہوئے بھی ایک مکمل وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔ ہمارے معاشرہ میں کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوتے ہیں اور ایسے بھی بہت سے لوگ مل جاتے ہیں جو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ ہو جاتے ہیں لیکن ایسے لوگ جو زندگی کے ایک ایک پل میں ڈھل جاتے ہیں ان کی پہچان ان کے مخصوص رستہ ہیں، ان کی مختلف خصوصیات اور ان کی مختلف نوعیت

سرگرمیوں کی وجہ سے باقی رہتی ہیں۔ ایسی ایک شخصیت ہم سب کی نظر میں ہے جن کو ہم سب جیلانی بیبراک کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جیلانی بیبراک کی رنگارنگ طبیعت اور بوقلمونیت ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ جیلانی صاحب ہمیں ہر محفل میں دکھائی دیں گے، ایسے مقامات پر بھی نظر آئیں گے جہاں دھوپ اور چھاؤں کے علاحدہ علاحدہ مسکن ہیں اور جہاں دھوپ اور چھاؤں سے مانوس اور غیر مانوس افراد بھی سانس لیا کرتے ہیں۔ دونوں مقامات پر جیلانی بیبراک صاحب نمایاں رہیں گے جیلانی صاحب ہمارے معاشرہ کا ایک ایسا متحرک کردار ہیں جو سیلانی ہی نہیں ہے سیماب صفت بھی ہے جیلانی صاحب کی شہرت ان کی ہمہ رنگی ادبی، فلاحی، تہذیبی سرگرمیوں کی ہی وجہ سے نہیں ہے بلکہ ہر ماحول میں اپنے آپ کو جذب کرنے کی ان کی اپنی صلاحیت کی وجہ سے بھی ہے انہیں یہاں وہاں ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں ہے وہ پلک جھپکتے ہی آپ کی آنکھوں کے سامنے جلوہ گر رہیں گے۔ بلکہ جیسے ہی آپ اُن کے بارے میں سوچیں گے وہ اُسی وقت سے آپ کے ہم رکاب رہیں گے۔ آپ کے ہم سفر رہیں گے۔ جیلانی صاحب کی مقبولیت کا ایک اہم راز یہی ہے کہ وہ سب کے لیے ہیں کسی ایک کے لیے نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بیبراک صاحب کی شخصیت ہمارے معاشرہ میں اہمیت کی حامل ہے۔ جیلانی بیبراک صاحب کو میں تا ندازاً ۲۴ برس سے جانتا ہوں بلکہ یوں کہا جا سکتا ہے کہ میں انہیں ۱۹۶۶ء سے جانتا ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ آج ۳۴ سال پہلے جیلانی صاحب

نے رٹز ہوٹل کے احاطہ میں موجود سومنگ پول کے کنارے پر مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں اس دور کے ایک ابھرتے ہوئے جوان سال شاعر کی حیثیت سے میں بھی مدعو تھا۔ اس دور میں تیراک کی حیثیت سے جیلانی صاحب کی بڑی شہرت تھی۔ یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ جیلانی پیراک صاحب شاعر بھی ہیں۔ ان کی بعض غزلیں "سیاست" میں شائع ہو چکی ہیں محبوب حسین جگر صاحب کی خواہش پر ۱۹۵۹ء میں میں نے سیاست میں محفلِ شعر کے کالم کے مرتب کی حیثیت سے ذمہ داری قبول کر لی تھی پیراک صاحب اپنا کلام "سیاست" کے لیے روانہ کرتے تھے۔ پیراک صاحب، جگر صاحب اور عابد علی خان صاحب کے اچھے دوستوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ پیراک صاحب مجھے فون پر اپنی غزلیں لکھواتے تھے اور وہ غزلیں جگر صاحب کی منظوری کے بعد اشاعت پذیر ہوتی تھیں۔ جیلانی پیراک نے بہت کم شاعری کی ہے۔ میں نے انھیں سومنگ پول کے مشاعرہ کے علاوہ ایک دو بار ایلڈرس کونسل کے اجلاس میں سنا ہے۔

جیلانی صاحب مجھے اور رئیس اختر کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ہم بھی ان کا احترام کرتے ہیں۔ جیلانی صاحب نہایت مخلص انسان ہیں نوجوانوں کی حوصلہ افزائی میں کبھی تنگ نظری اور بخل سے کام نہیں لیتے۔ جیلانی صاحب نے کئی انجمنیں قائم کی ہیں قراءت سوسائٹی کے بانی جنرل سکریٹری بھی ہیں چنانچہ انھوں نے قراءت سوسائٹی کے حوالے سے بیرونی ممالک کا دورہ بھی کیا۔ ایلڈرس کونسل کے بھی بانی جنرل سکریٹری ہیں جس کے زیرِ اہتمام کئی

جلسے اور مشاعرے منعقد کر چکے ہیں۔ ایلڈرس کونسل کے ہر اجلاس میں مشاعرہ لازمی طور پر ہوتا ہے۔ میں مشاعرہ کا معتمد رہا کرتا ہوں ایلڈرس کونسل سے ہمارے شہر کی کئی نمائندہ شخصیتیں وابستہ ہیں۔ فیض انٹرنیشنل اسوسی ایشن کے اجلاس بھی کبھی کبھی ہوتے رہتے ہیں۔ ہر فن مولا کی اصطلاح کا اطلاق جیلانی صاحب کی شخصیت پر پوری طرح ہوتا ہے۔ چاہے وہ علمی و ادبی جلسے ہوں کہ فلاحی و تہذیبی تقریبات، ان میں جیلانی صاحب موجود رہتے ہیں شہر کی بعض انجمنوں اور اداروں سے بھی کسی نہ کسی حیثیت سے وابستہ ہیں۔ وہ زمانہ بھی مجھے یاد ہے کہ جیلانی صاحب، عابد علی خان صاحب سے ملاقات کے لیے ہر جمعہ کی صبح دس بجے "سیاست" آفس آتے تھے میں اپنے معمول کے مطابق صبح سکریٹریٹ جانے سے قبل ایک گھنٹہ سیاست میں رہتا۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کے ساتھ چائے نوشی ہوتی۔ جیلانی صاحب جیسے ہی "سیاست" آتے جگر صاحب سے پان کا بٹوا مانگتے اور اپنی مرضی سے پان نکال لیتے۔ جیلانی صاحب کا قلمی نام جیلانی بیراک ہے اور تخلص بیراک۔ اصلی نام سید محمد جیلانی۔ ان کی تاریخ و سن پیدائش ۵ رمئی ۱۹۳۶ء ہے مقام پیدائش حیدرآباد ہے۔ امریکہ و یوروپ، مشرق بعید کا دورہ کر چکے ہیں۔ ان کے رہائشی مکان کا نام ایوان بیراک ہے جو محلہ چلے بلی میں واقع ہے ان کے مشاغل میں ادبی و تہذیبی، صحافتی و فلاحی معروفیات شامل ہیں۔ جیلانی صاحب کے حلقۂ احباب میں بے شمار لوگ شامل ہیں۔ جیلانی صاحب نے بیٹراکی کے میدان میں بڑا نام کمایا ہے

حیدر آباد میں ہونے والی بیشتر علمی و ادبی و فلاحی و تہذیبی محفلوں میں شرکت کیا کرتے ہیں۔ جیلانی صاحب کے دوستوں، شناساؤں اور ملاقاتیوں میں ہر عمر کے لوگ ملیں گے۔ ہر ایک شخص سے اُس کے مرتبے اور اس کی حیثیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ملتے ہیں۔ جیلانی صاحب کسی زمانے میں حیدر آباد کے ایک قدیم اور مشہور اخبار میزان سے بھی وابستہ رہے ہیں جس کے ایڈیٹر حبیب اللہ اوج تھے۔ جیلانی صاحب مزاج کی ہمہ رنگی کیفیت کی وجہ سے تمام حلقوں میں مقبول ہیں۔ جیلانی صاحب ہمیشہ دوسروں کی بھلائی اور اُس کی بہتری کے لیے ہی سوچتے رہتے ہیں۔ صاف دل صاف گو انسان ہیں۔ اسپورٹس ان کا خاص میدان رہا ہے اسپورٹس کے موضوعات پر ان کے مضامین شہر کے اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف مسائل پر بھی ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بعض فعال، علمی، تعلیمی و تہذیبی اداروں سے وابستگی رکھتے ہیں مغل پیاہ ایجوکیشنل سوسائٹی کے بھی ایک رکن ہیں۔ اپنی عمر کا ایک ملیا سفر طے کرنے کے باوجود آج بھی وہ فعال و کارکرد کسی باشعور شخص کی طرح معاشرہ کا ایک اہم جزو بنے ہوئے ہیں۔ جیلانی پیرزادہ صاحب کو مختلف النوع تہذیبی و فلاحی خدمات پر ایوارڈز کے علاوہ سال گذشتہ اُردو اکیڈیمی نے کارنامۂ حیات ایوارڈ سے نوازا ہے جیلانی پیرزادہ صاحب کے ہاں مختلف موضوعات پر کئی مضامین موجود ہیں کیا ہی اچھا ہو کہ ان کے مختلف مضامین کا مجموعہ منظر عام پر آجائے جیلانی صاحب میری ادبی سرگرمیوں سے خوش ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک خاص انداز ہے اور

ان کا خاص انداز، ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے ایسے لوگ جو اپنی مخصوص پہچان کے ساتھ معاشرہ میں سانس لیتے ہیں وہ سب کی نظروں میں رہتے ہیں۔ جیلانی بیرک صاحب کے ذہن و فکر کی اڑان بہت اونچی ہے اونچی سطح پر رہ کر سوچتے ہیں اپنی سوچ اور فکر سے یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ اپنی شخصیت کے تعین کے لیے خود اعتمادی، حوصلہ اور جہد مسلسل کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ جیلانی صاحب کا احساس جوان ہے ان کے عزائم نمایاں ہیں ان کی شاہین نظر معاشرہ کے ہر شعبہ میں حرارت پیدا کرتی ہے کہتے ہیں کہ اگر معاشرہ میں باوقار انداز میں جینا ہے تو اپنی پہچان کو باقی رکھیں۔ انفرادیت متاثر نہ ہو۔ زندگی کا ہر پل اپنے وجود کا احساس دلاتے رہیے۔ آخری سانس تک اپنی آن بان باقی رہنے۔ جب کبھی جیلانی صاحب سے میری ملاقات ہوتی ہے تو ان کے عزائم کی روشنی میرے دل و دماغ کو روشن کر دیتی ہے۔ مجھے خوشی ہے اور فخر بھی ہے کہ جیلانی صاحب جیسی ہمہ گیر ہمہ رنگی شخصیت کا مجھے قرب حاصل ہے ؎

حمایت اللہ

فائن آرٹس اکیڈیمی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے رہنما مقبول شاعر

شہر محبت و رواداری حیدرآباد فرخندہ بنیاد نے ہر دور میں باکمال شخصیتوں کو جنم دیا ہے اس شہر میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی بعض ایسی نامور شخصیتیں بھی گذری ہیں جن کا نام نہ صرف انسانی رشتوں کے حوالے سے ہی روشن ہے بلکہ علوم و فنون، تہذیب و تمدن اور شرافت و محبت کے حوالے سے بھی جگمگاتا رہے گا۔ اس شہر دلنواز کی فضاؤں میں سانس لینے والے لوگ اس دور میں بھی اپنے فن اور اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا احساس دلا رہے ہیں۔ شعری، ادبی و تہذیبی شعور سے بہرہ ور لوگوں کی آج بھی ہمارے شہر میں کمی نہیں ہے۔ دکنی زبان اور اردو تہذیب کے نمائندہ شاعر حمایت اللہ بھی ایک ایسی با صلاحیت شخصیت کے حامل ہیں جو زائد از ۵۰ برس سے شعری و تہذیبی

محفلوں میں سرگرم عمل ہیں ۔ حمایت اللہ فائن آرٹس اکیڈیمی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کے بانیوں میں سے ہیں بلکہ فائن آرٹس اکیڈیمی اور زندہ دلانِ حیدرآباد کی نمائندہ شخصیتوں میں سب سے زیادہ متحرک و فعال ہیں حیدرآباد میں تہذیبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے سلسلے میں یہ واحد اکیڈیمی ہے جس کی شہرت نہ صرف ملک گیر ہے بلکہ بیرونِ ممالک میں بھی جہاں جہاں تہذیبی سرگرمیوں اور فنونِ لطیفہ سے وابستگی رکھنے والے لوگ موجود ہیں وہاں بھی ہے با صلاحیت فن کاروں کے لئے فائن آرٹس اکیڈیمی کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں ۔ بے شمار فن کاروں نے ان ۵۰ برسوں میں فائن آرٹس اکیڈیمی سے استفادہ کیا ہے آج بھی اکیڈیمی کے فیضان سے کئی نوجوان فن کار بلا تفریق مذہب و ملت مستفید ہو رہے ہیں چاہے وہ حکومتی سطح کے تہذیبی پروگرام ہوں کہ کسی غیر سرکاری اداروں اور انجمنوں کی محفلیں ہوں ۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے فن کاروں نے اپنی اہمیت کو منوا لیا ہے ۱۹۶۲ء میں جب حیدرآباد میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی پہلی کل ہند کانفرنس منعقد ہوئی تو حمایت اللہ صاحب بھی میر کارواں کی حیثیت رکھتے تھے ۔ گذشتہ ۳۵ برسوں میں زندہ دلانِ حیدرآباد نے اپنے ادبی ثقافتی سرگرمیوں اور مزاحیہ مشاعروں کے ذریعہ کافی شہرت حاصل کی ہے ۔ قیام زندہ دلان حیدرآباد کے بعد سے سالانہ تقاریب میں ہندوستان کا شاید ہی کوئی ایسا طنز و مزاح نگار (شاعر و ادیب) ہوگا جس نے شرکت نہ کی ہو ۔

پاکستان کے مزاحیہ شاعروں نے بھی شرکت کی ہے سینیر شاعروں کے ساتھ ساتھ جونیر شاعروں کو بھی زندہ دلان حیدرآباد نے اپنے دامن میں جگہ دی ہے۔ حیدرآباد کے علاوہ ملک کے بعض شہروں اور بعض بیرونی ملکوں میں بھی زندہ دلان حیدرآباد کے فن کاروں نے اپنے بہترین فن کا مظاہرہ کیا ہے زندہ دلان حیدرآباد کا جہاں کہیں بھی نام لیا جائے گا وہاں خاص طور پر مجتبیٰ حسین، حمایت اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کے علاوہ ان کے دیگر رفقائے کار مصطفےٰ علی بیگ، طالب خوندمیری اور دیگر ارکان کا نام بھی لیا جاتا رہے گا۔ زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان ماہنامہ شگوفہ طنزیہ و مزاحیہ ادب میں غیر معمولی خدمت انجام دے رہا ہے خدا رہے کہ یہ سلسلہ ۱۹۶۸ء سے جاری ہے لاتعداد شاعروں، ادیبوں نے شگوفہ کے ذریعہ طنزیہ و مزاحیہ ادب میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے ایک ہا کمر مدیر کی حیثیت سے شگوفہ کے معیار کو برقرار رکھا ہے۔ میں بھی سال تک شگوفہ کی مجلس ادارت سے وابستہ رہا ہوں۔ شگوفہ کا سارا کام مصطفیٰ کمال خود انجام دیتے ہیں البتہ کبھی کبھی نامور مزاح نگار مسیح انجم مرحوم بھی تعاون کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک رحیم الدین توفیق صاحب کمال صاحب کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ حمایت اللہ صاحب اپنے بہترین پروگراموں کی پیش کشی کی بدولت اپنے رفقائے کار کے ساتھ ساتھ ذاتی شہرت پا چکے ہیں وہ اپنی سرپرستی میں بے شمار پروگرام کر چکے ہیں حمایت اللہ کچھ برسوں سے دوردرشن کے لئے مختلف سیریل میں کام کر رہے ہیں پیشہ

گے اعتبار سے اسے کلاس کنٹرا کٹر ہیں حمایت صاحب اپنے دکنی کلام کے ذریعہ تقریباً ہر مشاعرہ میں کامیاب رہتے ہیں وہ آداب مشاعرہ سے خوب واقف ہیں مشاعروں میں دیر تک کلام سنانے سے گریز کرتے ہیں وہ نہیں چاہتے کہ دوسرے شاعروں کا وقت لیں۔ دیر تک مائک پر جمے رہنے کی کبھی انہوں نے خواہش نہیں کی البتہ عوام کے بے حد اصرار پر تھوڑا سا وقت سامعین کی نذر کرتے ہیں اپنا کلام کبھی تحت اللفظ میں کبھی ترنم میں سناتے ہیں لیکن زیادہ تر تحت میں ہی سناتے ہیں۔ حمایت صاحب ایک نیک دل شریف و ہمدرد انسان ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ساری زندگی کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ مقصد ہے دوسروں کی مدد کرنا۔ دوسروں کی مدد کرتے ہوئے انہیں بے حد خوشی ہوتی ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے آس پاس ان کے احباب اور ضرورت مند حضرات جمع رہتے ہیں ان کے احباب کا دائرہ کافی وسیع ہے ہر شعبۂ حیات کے لوگوں سے ان کی رسم وراہ ہے حمایت اللہ کی خوبیوں کے حامل ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کا کوئی ایک دوست بھی اپنے کسی دوست سے خفا نہ رہے۔ جشن حیدرآباد منعقدہ جدہ کے سلسلے میں حیدرآباد سے جناب عابد علی خان، محبوب حسین جگر، صلاح الدین اویسی، سرینیواس لوٹھر ڈاکٹر بیگم کے علاوہ شاعروں میں حمایت اللہ، صلاح الدین نیر، مصطفیٰ علی بیگ، طالب خوندمیری، علی الدین نوید، صبغت اللہ بہارت اور لوگس حیدرآبادی نے شرکت کی تھی۔ حمایت اللہ صاحب کی قیادت میں

ہم تمام شاعر عمرہ کے لیے خانہ بیت اللہ اور رسول پاک کے قدموں میں سر جھکانے مدینہ منورہ گئے تھے خانہ کعبہ کے احاطہ میں داخل ہونے سے پہلے تمام شاعروں نے اپنی اپنی ربر کی چپلیں اتار دیں۔ انہوں نے تمام شاعروں کی چپلیں خود ایک تھیلی میں ڈال لیں اور ایک مقام پر رکھ دیا واپسی میں انہوں نے بہت دور تک چپلوں کی تھیلی کسی اور شاعر کو لینے نہیں دی۔ ایسا ہی عمل انہوں نے زیارت روضہ رسول سرور عالم کے موقع پر کیا تھا۔ مکہ و مدینہ کے سفر میں حمایت اللہ صاحب نے ہمارے سالار قافلہ کی طرح ہمیں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کیں۔ ہم زائد از ایک ہفتہ جدہ میں رہے۔ اس جشن کے اہم منتظمین میں ڈاکٹر شمس بابر، سعید بن محسن باعشراں، ابو علی خان، عارف قریشی اور دیگر حیدرآبادی تھے میں نے حمایت اللہ کے ساتھ کئی کل ہند مشاعرے پڑھے ہیں حمایت صاحب کے ساتھ سفر کرنے میں بڑی سہولت رہتی ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کی ہر میٹنگ میں میں نے حمایت صاحب کو سنجیدگی سے گفتگو کرتے ہوئے پایا ہے ان کی بات میں وزن رہتا ہے میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ ہو اگر اس کی تائید حمایت اللہ صاحب کرتے ہیں تو دوسروں کو مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اخبار سیاست، عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب سے ان کا دیرینہ رابطہ خاص رہا ہے اب بھی وہ سیاست سے اٹوٹ رشتہ رکھتے ہیں اعلیٰ کردار کے حامل انسان ہیں۔ وہ ایک دل گیر محکم گیر کے قائل ہیں شہر کے دوسرے اخباروں کے سربراہوں سے اُن کے

اچھے مراسم ہیں لیکن جو ذہنی ہم آہنگی انہیں "سیاست" سے ہے وہ کسی اور اخبار سے نہیں ہے جب بھی حمایت اللہ صاحب "سیاست" آتے عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب انہیں دیکھ کر خوش ہوتے تھے ان سے مشفقانہ سلوک روا رکھتے تھے سیاست سے متعلق کوئی تہذیبی پروگرام ہو تو مشورہ کرتے تھے اور اُن سے ضروری تعاون حاصل کرتے تھے حمایت اللہ صاحب کے قریب ترین دوستوں میں مصطفٰے علی بیگ بھی ہیں۔ جن کی دوستی قابلِ رشک ہے۔ سے ہے دٹھل راؤ سے بھی کافی گہرے مراسم رہے ہیں۔ فائن آرٹس اکیڈیمی کے توسط سے بے شمار فن کاروں کو شہرت دلوائی۔ مدیر شگوفہ ڈاکٹر مصطفٰے کمال ان کے بہترین دوستوں میں سے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد کی ادبی تقاریب میں حمایت اللہ کے ساتھ ڈاکٹر مصطفٰے کمال بھی کلیدی رول ادا کرتے ہیں۔

یوگس حیدرآبادی اور مسیح انجم مرحوم بھی زندہ دلانِ حیدرآباد کے اہم ارکان میں سے تھے۔ عابد علی خان صاحب کے دولت خانہ پر جب کبھی کوئی محفلِ شعر یا محفلِ قوالی ہوتی تو حمایت صاحب کو لازماً مدعو کیا جاتا۔ حمایت اللہ صاحب کی شریکِ حیات ڈاکٹر رشید موسوی نہایت سنجیدہ طبیعت کی معزز خاتون ہیں۔ وینکٹ راما ریڈی ویمنس کالج میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔ حمایت اللہ صاحب کا تا حال کوئی ایک مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ حمایت اللہ صاحب مشاعروں کے سلسلے میں سعودی عرب کے علاوہ امریکہ کا بھی دورہ کیا ہے امریکہ ۴ دفعہ جا چکے ہیں لندن بھی گئے ہیں وہ ایک محنتی مہذب

احتو عملِ فن کار ہیں اور اُن کا سفر جاری ہے
اکثر یوں ہوا ہے کہ اگر کوئی نمائندہ ادبی و سیاسی شخصیت
حیدرآباد آجاتی اور اگر اُن کے مراسم جناب عابد علی خان سے ہیں تو عموماً
ڈنر کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ عشائیہ کے بعد محفلِ موسیقی ہوتی، محفلِ شعر
بھی ہوتی۔ ایسے موقع پر عابد علی خان صاحب کو حمایت اللہ صاحب کا
بھرپور تعاون حاصل رہتا ۔

راشد آذر

(صاف باطن ۔ روشن دماغ شاعر)

کائنات میں پھیلے ہوئے اندھیروں کو دور کرنے کے لئے جس طرح کسی کرشماتی اثر کو ضروری سمجھا جاتا ہے اسی طرح فکر و فن کے دھندلکوں کو بے اثر کرنے کے لئے روشن دماغ، دلِ پُر نور رکھنے والے فن کاروں کا وجود ضروری ہے ایسا تخلیق کار جو کائنات کے ذرّہ ذرّہ کو اپنے فکر و خیال کے دائرہ میں محصور کرنے کا فن جانتا ہے اور جو اپنی اعلیٰ فکر کی روشنی میں اپنے مشاہدات و تجربات کو تخلیقی توانائی عطا کرتا ہے۔ وہ اپنے فکر و فن کے ذریعہ نہ صرف اپنی ذات و صفات کو اجالوں کا سرچشمہ بنا دیتا ہے بلکہ انسانی رشتوں کی تہذیب کو بھی چار چاند لگا دیتا ہے فکر صحیح ہو تو تخلیق بھی پُر اثر ہوتی ہے مشاہدات میں بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کی بالادستی کو تسلیم کرنا بھی ایک کارِ نمایاں سمجھا جاتا ہے جن شاعروں، ادیبوں کے دل کی بات

دیانتداری کے ساتھ صفحۂ قرطاس کی آبرو بڑھائی ہے اُن جیسے فنکار دُنیا میں ہمیں یوں تو بہت سے مل جائیں گے جو راشدآزر جیسے باشعور شاعروں، ادیبوں کی صف میں رہتے ہوئے بھی کبھی سب کے ساتھ تو کبھی سب سے الگ دکھائی دیں گے۔ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ایک تنہا انسان، ہجوم میں رہ کر بھی تنہا رہتا ہے لیکن اس کی تنہائی میں ہجوم بھی کارفرما رہتا ہے۔ اس طرح کی متضاد کیفیات سے فنکاروں کو اکثر گذرنا پڑتا ہے۔ جن حالات میں شاعر کو اپنے باشعور ہونے کا احساس دلانا پڑتا ہے ایسے شاعروں میں بہت سے شاعر ہمارے شہر میں ملیں گے۔ لیکن راشد آزر کا شاعرانہ رتبہ خود ان کے لئے مرکز بنا رہتا ہے۔ جو شخص تمام زندگی سچ بولتا رہا ہو۔ مصلحت کوشی سے دور رہا ہو، سازشی ذہنوں کی سرزنش کرتا رہا ہو ظلم کے خلاف آواز اُٹھاتا رہا ہو اور کسی کے لئے بھی ضرر رساں نہ ہو ایسا شخص راشد آزر ہے جس کی پہچان ہمارے شہر کے شاعروں میں ایک صاف گو، پاک باطن اور روشن دماغ شاعر کی حیثیت سے باقی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ایسا نفیس شاعر ہمارے درمیان آج بھی اپنی شاعری کے ذریعہ نت نئے پھول کھلا رہا ہے۔ راشد آزر ایک ایسے وضع دار شاعر ہیں جن سے مراسم رکھنا، مراسم بڑھانا ہر کس وناکس کے لئے اتنا آسان نہیں ہے۔ راشد آزر خود بھی ایسے ہی شاعروں، ادیبوں کو اپنا دوست بناتے ہیں جو دوستی کی قدر و قیمت جانتے ہیں۔ رشتوں کی

پہچان رکھتے ہیں اور ایک مہذب شہری کی حیثیت سے معیار کی کسوٹی پر پورے اترتے ہوں۔

راشد آزر اپنے بہترین اوقات کو بہترین ماحول میں گذارنا پسند کرتے ہیں۔ اچھے خاندان، اچھے ماحول کے آدمی ہیں۔ پاک و صاف کردار کے انسان ہیں انسانی رشتوں کے قدردان ہیں دوسروں کی عزت کرنا جانتے ہیں۔ دوستوں کا حلقہ کچھ اتنا وسیع نہیں ہے لیکن جتنے بھی اچھے احباب ہیں اُن ہی پر اکتفا کرتے ہیں راشد آزر کا کہنا ہے کہ دوست کم ہوں لیکن ایسے ہوں جو بے ریا ہوں اور جن کی شخصیت شفاف آئینہ کی طرح ہو۔ معاشرہ کے لئے قابلِ قبول ہوں۔ وہ بہ ذات خود بہترین انسان ہوں۔ باشعور ہوں اچھے برے کی تمیز کرتے ہوں۔ راشد آزر کے دوستوں میں کون اہم ہیں کون غیر اہم، مجھے اس سے دلچسپی نہیں ہے وہ میرے دوست ہیں اور میں ان کا دوست ہوں میرے لئے یہی کافی ہے۔ ہماری دوستی شعر و ادب کے حوالے سے برقرار ہے۔ شعر و ادب ہی ہماری دوستی کی بنیاد ہے۔ راشد آزر کے ساتھ میں نے بیسیوں مشاعرے پڑھے ہیں لیکن انہوں نے ایسے ہی مشاعروں میں شرکت کرنا پسند کیا۔ جہاں کا ادبی ماحول ان کے مزاج کا آئینہ دار تھا۔ معیاری مشاعروں معیاری محفلوں سے وابستگی راشد آزر کا وتیرہ ہے۔ راشد آزر کا کلام میں نے پہلی دفعہ ماہنامہ صبا میں پڑھا تھا جو سلیمان اریب کی زیرادارت

شائع ہوتا تھا۔ راشد آذر کی بیشتر نظمیں اور غزلیں صبا میں شائع ہوتی تھیں آج کل، سب رس، شب خون اور دیگر ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ اخبارِ سیاست کی معرفت بھی ہم ان کے کلام سے مستفید ہو رہے ہیں اس وقت پروفیسر مغنی تبسم ان کے بہترین دوستوں میں شمار کئے جاتے ہیں راشد آذر نظم ہی نہیں غزلیں، قطعات اور رباعیات بھی کہتے ہیں ان کے تا حال حسب ذیل شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں نقشِ آذر۔ صدائے تیشہ۔ آئینہ خاکِ انا۔ زخموں کی زبان۔ منزلِ شوق۔ جمع و خرچِ وفا۔ اندوختہ ان میں سے بعض کتابوں پر ملک کی بعض اردو اکیڈیمیوں سے انعام مل چکا ہے حیدرآباد کے مرحوم شعراء میں سلیمان اریب، خیرات ندیم۔ وحید اختر۔ شاذ تمکنت، ابن احمد تاب، عزیز قیسی ان کے دوستوں میں شامل تھے ان کے سینیر شاعروں میں مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، سعید شہیدی، خورشید احمد جامی، اور امیر احمد خسرو ان کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ بہ قیدِ حیات شاعروں میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی ڈاکٹر مغنی تبسم، رئیس اختر سے ان کے گہرے مراسم اور دوستانہ روابط ہیں۔ میں بھی ان کی نظروں میں رہتا ہوں۔ راشد آذر شروع سے ہی مشاعروں میں کم کم شریک ہونے کے قائل ہیں ویسے وہ ادارہ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو کے علاوہ شہر کے بعض مخصوص مشاعروں میں کلام سناتے ہیں۔ ... آذر کو ... نے ادارہ میر ... شہر بھر کے لوگ۔"

بعض مشاعروں میں بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کی زحمت دی۔
راشد آذر سے شخصی ملاقات نہیں ہونے کے برابر ہے البتہ فون پر
گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ راشد آذر اور میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین
کی ادبی سرگرمیوں کو بلندیوں پر پہونچایا تھا۔ ہم دونوں تقریباً
۶ برس تک انجمن سے وابستہ رہے۔ راشد آذر معتمد تھے اور میں
شریک معتمد۔ ہمارے زمانے میں انجمن کے جلسے ہر ماہ نہایت پابندی
کے ساتھ ہوتے تھے۔ ابتداء میں کچھ جلسے اردو ہال میں ہوئے پھر
ہم نے مستقل طور پر اپنے جلسوں کے لئے ہسٹری ہارٹن انسٹیٹیوٹ کو
منتخب کیا۔ انجمن سے ہماری وابستگی کے زمانے میں حیدرآباد کی
ادبی انجمنوں میں انجمن ترقی پسند مصنفین ہی ایک ایسی انجمن رہی
جس کے جلسے ہر ماہ پابندی سے مقررہ وقت پر ہوا کرتے تھے۔ ایک
جلسہ تو ہم نے صرف ایک سامع کی موجودگی میں شروع کیا تھا۔ ابتداء
میں وقت کی پابندی مشکل ضرور رہی لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا
کہ تمام ارکان مقررہ وقت سے پہلے ہی موجود رہنے لگے۔ انجمن کے
جلسوں کے لئے ہم انجمن کے سرپرست ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے رہنمائی
حاصل کرتے تھے ان کے مشوروں اور ان کی رہنمائی کو اہمیت دیتے تھے
راشد آذر ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعروں
میں کلام سناتے رہے ہیں۔ اضلاع کے مشاعروں میں شرکت سے گریز
کرتے ہیں۔ شہر کے بعض مخصوص مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ دلی کے

ایک مشاعرہ میں جو آل انڈیا ریڈیو دہلی کی جانب سے اسٹوڈیو
میں منعقد ہوا تھا حیدرآباد سے راشد آذر اور راقم الحروف نے
شرکت کی تھی۔ اس وقت زبیر رضوی ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو تھے
اس مشاعرے میں ایسے ہی شاعروں کو مدعو کیا گیا تھا جن کی پہچان
(ادبی رسائل اور ان کی تصانیف کی وجہ رہی ہے)۔ راشد آذر نے
بیرون ملک برطانیہ اور امریکہ میں بھی مشاعرے پڑھے ہیں۔ شہر کے
نامور شاعروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ میر کی غزل گوئی ایک تجزیہ زیر عنوان
نثر میں ان کی ایک بہت ہی عمدہ کتاب شائع ہوئی ہے راشد آذر
کو تمام اصناف سخن میں شعر کہنے کا ملکہ حاصل ہے آزاد موا نظمیں
بڑی روانی کے ساتھ کہتے ہیں رباعیات کا ایک مجموعہ بھی شائع ہوا
ہے۔ راشد آذر ماہر علم عروض ہیں فارسی زبان پر بھی قدرت رکھتے
ہیں۔ انھیں انگریزی ادب سے بھی گہرا لگاؤ ہے۔ ادبی مباحثوں میں بھی
کبھی کبھی حصہ لیتے ہیں۔ آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کی مختلف کمیٹیوں
سے بھی وابستہ رہے۔ زمرہ شاعری میں جج کے فرائض انجام دے
چکے ہیں۔ ان کی کتابوں پر انعام اول ملتا رہا ہے۔ ادبی محفلوں میں
نہایت شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آداب محفل کا خیال رکھتے ہیں
بیرونی شاعروں میں مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی
اختر الایمان اور جاں نثار اختر سے ان کے شخصی مراسم رہے۔ شہریار
زبیر رضوی سے بھی اچھا خاصہ یارانہ ہے۔ راشد آذر کے والد پیر فقیر

حسین علی خاں صاحب انگریزی کے ایک لائق ترین استاد تھے جو نظام کالج سے وابستہ تھے ان کی والدہ محترمہ معصومہ بیگم ریاستی وزیر تھیں جو کانگریسی تھیں۔ راشد آزر ترقی پسند رجحانات کے حامل روشن خیال اور روشن ضمیر شاعر ہیں۔ حیدرآباد کے ترقی پسند ماحول سے بہت قریب رہے ہیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند خیالات تو ہیں ہی لیکن کلاسیکی شعریت کا اثر بھی بہت زیادہ ہے۔ میر تقی میر کے کلام کے عاشق ہیں۔ میر کے بیسیوں اشعار انھیں یاد ہیں۔ غالب کے پرستاروں میں ہیں ساتھ ہی انھیں مومن کی کج کلاہی بھی پسند ہے فیض کی طرح انھیں مجروح، علی سردار جعفری اور مخدوم کے بانکپن نے بھی متاثر کیا ہے۔ وہ فراق، جگر اور جوش کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں۔ حسرت موہانی اور علامہ اقبال کی شاعری بھی ان کے دل و دماغ کو روشنی عطا کرتی ہے۔ سیاست، عابد علی خاں صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب سے ان کی وابستگی رہی۔ سیاست اخبار سے اب بھی ان کی ذہنی ہم آہنگی برقرار ہے۔ ہمارے شہر کے لئے ایسے شاعروں کا وجود بھی سرچشمۂ فیضان سمجھا جاتا ہے جن کی شاعری انسانیت کا پیغام دیتی ہے۔ ظلم و استبداد کے خلاف آواز بلند کرنے والی راشد آزر کی شاعری دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی رومانی نظمیں، لطیف جذبات کو تسکین عطا کرتی ہیں۔ بعض نظمیں دلوں کو چھو لینے والی ہیں۔

راشد آذر نے مسائلی نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کی رومانی نظموں کی

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

صاحبِ طرز ادیب و نقاد — معتبر شاعر — ممتاز ماہرِ تعلیم

علمی و ادبی معاملات میں بھی اربابِ فکر و دانش کردار ہی سے شخصیت کا تعین نہیں کرتے۔ کئی برس تک اعلیٰ مرتبت تخلیق کاروں، صاحبانِ علم و آگہی کی صلاحیتوں کو پرکھا جاتا ہے ان کی تخلیقات کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ اُن کے ذہن و فکر کی وسعتوں پہ گہری نظر رکھی جاتی ہے ان کی صلاحیتوں کی ہمہ رنگی کیفیت پر برسوں غور کیا جاتا ہے تب ہی کسی اہلِ قلم کو دانشورانِ شعر و ادب کی اعلیٰ صف میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ اُس کے رشحاتِ قلم اور اس کی فکر کی گہرائی کا بہ غور تجزیہ کیا جاتا ہے تب کہیں جا کے باکمال قلمکاروں کے فن اور شخصیت کو تسلیم کیا جاتا ہے تجزیہ نگاروں کی نظروں میں اس طرح کی خصوصیات کے حامل صاحبِ طرز نامور اور ممتاز شاعر و نقاد بہترین ماہرِ تعلیم اور باشعور، مہذب شہری ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید جیسی شخصیتیں بھی رہا کرتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید زبان اور شعر و ادب کے ایک خاموش

خدمت گذار رہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ درس و تدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ رہ کر گذارا۔ مادر جامعہ عثمانیہ کے لائق فرزندوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صدر شعبہ اردو سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی کی حیثیت سے بے شمار تشنگان علم کی پیاس بجھا کر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ہیں۔ پروفیسر جاوید آج بھی یونیورسٹی کے زمانے کی مصروفیات کی طرح علم و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ تحقیق و تنقید کے موضوعات پر ان کی کتابیں تمام ارباب علم و دانش سے خراج حاصل کرتی رہتی ہیں۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نہ صرف اعلیٰ درجہ کے ادیب ہیں بلکہ لاجواب صحافی بھی ہیں۔ رہنمائے دکن میں ان کے شائع شدہ اداریئے آج بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں جس وقت وہ ایم اے کے طالب علم تھے تب ہی انہوں نے رہنمائے دکن سے اپنے آپ کو وابستہ کیا۔ انھیں اپنے شعری، ادبی و صحافتی مصروفیات کے سلسلے میں کئی مقامات پر کام کرنا پڑا۔ اپنی ابتدائی زندگی کے زمانے میں کافی کدو کاوش اور مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ مسلسل کشمکش حیات سے گذرتے ہوئے انہوں نے سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی کے شعبہ اردو سے وابستگی کے بعد سکون کی سانس لی۔ جہاں وہ لکچرار رہے ریڈر اور پھر پروفیسر رہے۔ سلیمان اطہر جاوید کو ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے سربراہ قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کے علمی کارناموں اور ان کی قابلیت سے استفادہ کے لئے مختلف سمیناروں، سمپوزیم اور جامعات کی مختلف کمیٹیوں میں شامل کیا گیا ... ان کے زیر نگرانی بہت سے طالب علموں نے پی ایچ ڈی کی

ڈگری حاصل کی۔ جاوید صاحب قابل ترین استاد کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقوں اور جامعات کی محفلوں میں پسند کئے جاتے ہیں۔ اس تاثراتی مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ میں ان کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر کچھ زیادہ معلومات فراہم کرسکوں۔ سچ تو یہ ہے کہ جاوید صاحب کی زندگی کا ہر لمحہ فکر و دانش کے آئینوں کو چمکانے میں مصروف رہا کرتا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید سے یقیناً میری ابتدائی شاعرانہ زندگی کے دوران ملاقاتیں رہی ہوں گی لیکن مجھے کوئی ایسا واقعہ یاد نہیں ہے جہاں سے میں ان کی ملاقات کے سلسلے کو نبیاد بنا سکوں۔ البتہ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ ۱۹۶۰ء میں جب وہ رہنمائے دکن کے لئے اداریئے لکھتے تھے اس وقت میں ان کے نام اور کام سے واقف ہوا تھا۔ وہ اداریئے شوق سے پڑھتا تھا پھر جب انہوں نے رشید احمد صدیقی ”شخصیت اور فن“ پر پی ایچ ڈی کے لئے مقالہ لکھا تو ان کی ادبی شہرت میں اضافہ ہونے لگا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی میرے بہت ہی پسندیدہ ادیب رہے ہیں۔ میں نے اپنا طالب علمی کے زمانے میں اردو فاضل، بی او ایل اور ایم او ایل کے نصاب کے مطالعہ کے دوران رشید احمد صدیقی کی تحریروں کا بہ غور مطالعہ کیا تھا۔ ان سے نیاز حاصل کرنے کا بھی اعزاز حاصل ہے جبکہ وہ انجمن ترقی اردو کے ایک سالانہ جلسے میں حیدرآباد تشریف لائے تھے انجمن ترقی اردو کی جانب سے اردو ہال میں پروفیسر رشید احمد صدیقی کا شایانِ شان خیرمقدم کیا گیا تھا۔

پروفیسر جاوید کی قابلیت کا شہرہ علمی و ادبی حلقوں میں ان کی طالب علمی

کے زمانے سے ہی ہوا۔ ان کی ادبی تحریریں ملک کے معیاری ادبی رسائل میں شائع ہونے لگیں جن سے بے شمار محبانِ اردو اور لائق قلم کاروں اور دانشوروں کو ان کی علمی و ادبی حیثیت کے بارے میں غور کرنے کا موقع ملا اور آج الحمدللہ ملک اور بیرونِ ملک کے تمام علمی و ادبی حلقوں میں ڈاکٹر جاوید کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر جاوید سے میری ملاقات بہت کم رہی۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حیدرآباد میں بہت کم رہتے تھے سری وینکٹیشورا یونیورسٹی تروپتی نے انہیں اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ حیدرآباد کی ادبی محفلوں میں موجود رہا کریں۔ جب بھی وہ حیدرآباد آتے کہیں نہ کہیں ادبی جلسوں میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کی مختلف کمیٹیوں میں ایکسپرٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ میری ابتدائی ادبی زندگی کے زمانے میں میرے دو شعری مجموعوں پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ ان کا ایک تبصرہ جو انہوں نے میرے شعری مجموعۂ "شامِ گل تازہ" پر ۳۰ سال پہلے رہنمائے دکن کے لئے لکھا تھا میری کتاب "قافلہ چلتا رہے گا" میں شامل ہے جب کسی بھی موضوع پر گفتگو کیجئے آپ کو مطمئن کر دیں گے ادب کے تمام شعبوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے اکثر مضامین اس بات کے غماز ہیں کہ وہ تبحرِ علمی کے ایک شاہکار ہیں ادب کا شاید ہی کوئی ایسا موضوع ہوگا جس پر جاوید صاحب نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ ان کے تبصروں اور ان کی تنقید کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ممتاز نقاد پروفیسر احتشام حسین کے

اسکول کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کتابوں پر جاوید صاحب کے تبصرے توازن کا دامن نہ چھوٹنے دیتے ہیں۔ اگر کسی کو، تحریر یا شاعری میں کوئی فنی سقم ہو تو اس سلیقے سے نشاندہی کرتے ہیں کہ صاحب تصنیف ان کا احسان مند رہتا ہے۔ جاوید صاحب وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہونے کے بعد جب حیدرآباد آئے تو کچھ دنوں کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے۔ ان دنوں وہ روزنامہ سیاست کے لئے ادبی ڈائری میں اپنا کوئی ایک مضمون ہفتہ واری کالم کے لئے لکھتے ہیں۔ ادبی جلسوں کی روئیداد کی پیشکشوں کے علاوہ ادب کے مختلف موضوعات پر ان کے مضامین وابستگان شعر و ادب کے دل و دماغ کو اجالوں کی سرزمین سے روشناس کراتے ہیں جاوید صاحب نہایت سادگی پسند انسان ہیں اپنے مخصوص دوستوں میں اپنی منفرد پہچان کے ساتھ اپنے وجود کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔ پاک و صاف ذہن و فکر کے ادیب ہیں علمی و ادبی مباحث میں اپنا نقطۂ نظر نہایت عمدگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ اپنی بات اس ماہرانہ انداز سے کہتے ہیں کہ مخاطب ان کے لب و لہجہ کی مٹھاس سے متاثر ہوتا ہے مرنجان مرنج انسان ہیں کسی کے لین دین میں نہیں رہتے۔ سیدھے سادے سے بے حد شریف انسان ہیں۔ ان کے مزاج میں نفاست ہی نہیں شگفتگی بھی ہے۔ ان کی زیر لب مسکراہٹ اچھی لگتی ہے۔ عطر بیز انداز گفتگو ساری ادبی فضا کو ہی نہیں دوستوں کی محفلوں کو بھی مہکاتا رہتا ہے۔ آداب محفل اور آداب نشست و برخواست کا خاص خیال

رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب وہ کسی ادبی محفل میں پہونچتے ہیں تو خاص طور پر ان کے ادبی دوست اپنی اپنی مشغولیتوں کا جائزہ لیتے ہیں اور ڈاکٹر جاوید کے ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ کسی قلم کار کی شخصیت کے تعین کے لئے صرف اس کی علمی قابلیت ہی موثر ذریعہ نہیں رہتی بلکہ اس کے رکھ رکھاؤ کا بھی بڑا دخل رہتا ہے۔ جب مستند قلمکاروں کی علمی و ادبی خدمات پر تبصرہ کی گنجائش نکل آتی ہے تو صرف ان کے فن پر ہی گفتگو نہیں ہوتی بلکہ ان کی شخصیت پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔ شخصیت اور فن کے بارے میں نہیں بلکہ بے شمار دانشوروں کے بارے میں ہمارے دانشوروں نے قلم اٹھایا ہے۔ سلیمان اطہر جاوید صاحب جہاں ایک اعلیٰ درجہ کے صاحب طرز ادیب و نقاد ہیں وہیں ایک نامور شاعر بھی ہیں لیکن وہ اپنی شاعرانہ صلاحیت کے اظہار میں نثری ادب کے مقابلے میں کم دلچسپی لیتے ہیں بہت کم مشاعروں میں کلام سناتے ہیں۔ حیدرآباد میں ادارۂ ادبیات اردو کے زیر اہتمام ہونے والے یوم قلی قطب شاہ کے مشاعرہ میں کلام سنایا کرتے ہیں راج بھون میں (۲۰۰۰ء) کے مشاعرہ میں انہوں نے کلام سنا کر داد و تحسین حاصل کی تھی شہر کی شعری محفلوں سے وہ دور رہتے ہیں میں نے انہیں علاقہ آندھرا کے مشاعروں میں خاص طور پر کڑپہ اور کرنول کے مشاعروں میں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ علاقہ آندھرا کے شاعروں، ادیبوں اور وہاں کے عوام اردو انھیں ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ میں نے کڑپہ کے دو تین مشاعروں میں ان کے بہترین کلام کی کھل کر پذیرائی ہوتے ہوئے دیکھا ہے یہ

نہیں ہے کہ ضلع کرنول، اننت پور اور آندھرا کے بعض علاقوں میں اردو تحریری و ادبی ماحول کو پروان چڑھانے میں جاوید صاحب نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

عصرِ حاضر کے تمام اہم قلم کاروں، اساتذہ اور اردو کی محفلوں سے گہری دلبستگی رکھنے والوں سے ان کے مراسم ہیں۔ ڈاکٹر جاوید سے ملاقات کر کے میں بے حد خوشی محسوس کرتا ہوں۔ یہ احساس رہتا ہے کہ میں اردو کے ایک قابل ترین دانشور سے مل کر اپنی مسرتوں میں اضافہ کر رہا ہوں۔ خدا میرے دوستوں کو سلامت رکھے ۔۔۔

ہاشم حسن سعید

(پُرکشش دور کا بہترین دوست۔ باکمال دانشور)

زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار موڑ پر کچھ ایسے لوگ بھی گلِ شگفتہ کی طرح کھل جاتے ہیں جن کی ہر سانس ایک مژدۂ جانفزا ہوتی ہے اس طرح یہ لوگ اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کی خوشیوں کے لئے کچھ ایسے نمایاں کام کر جاتے ہیں کہ وہ لمحے یادگار بن کر رہ جاتے ہیں۔ جذبات انسانی اور دو طرفہ تعلقات کے بے لوث رشتوں کو مضبوط کرنے والے لوگ اپنے خاص خاص دوستوں کے لئے کچھ ایسے کارِ خیر انجام دینے میں مصروف ہو جاتے ہیں کہ جن کا وجود تہذیبی رشتوں کے لئے ہی نہیں بلکہ انسانی رشتوں کو بھی ایک خوشگوار یاد سے ہمکنار کر دیتا ہے۔ ویسے بھی اس طرح کے لوگ ہر ایک کے مقدر کا حصہ نہیں بن سکتے۔ بہت سوں کے لئے سوغاتِ دل و نظر بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کے محبت پسند، شرافت نواز، مخلص، نفیس ذوق رکھنے والے نامور دانشور صاحبِ قرطاس و قلم ہاشم حسن سعید بھی شامل ہیں۔ جو میری زندگی کے ایک

لطیف موڑ پر میرے محسن اور میرے زبردست معاون بنے رہے۔ آج بھی ہم دونوں کا رشتۂ خلوص و محبت اتنی ہی نازکی کے ساتھ باقی ہے جو ہماری ملاقات کے ابتدائی دنوں میں تھا۔ ہاشم حسن سعید سے میری پہلی ملاقات کہاں، کس وقت ہوئی تھی کچھ یاد نہیں آ رہا ہے لیکن میری زندگی میں چاہے وہ تعلیمی سلسلہ ہو کہ شاعری کا یا تہذیبی رشتوں کا سلسلہ ہو۔ ۱۹۵۹-۶۰ء کے دوران ہی سے شروع ہوتا ہے۔ ہاشم حسن سعید جامعہ عثمانیہ کے ایک قابل ترین طالب علم رہے ہیں انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں ایم اے اردو کے طالب علم کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کی ہے ہاشم نہایت ذہین اور صاحبِ فہم و ادراک طالب علم رہے ہیں انھوں نے ۱۹۶۳ء میں ایم اے اردو میں درجۂ اول میں کامیابی حاصل کی مجلۂ عثمانیہ جامعہ عثمانیہ کے مدیر رہ چکے ہیں۔ قیام جامعہ عثمانیہ سے لے کر ۱۹۶۰ء تک کے حالات کا احاطہ کیا ہے نامور عثمانین کی تخلیقات پر مشتمل یہ جامعہ عثمانیہ نمبر ایک قیمتی دستاویز ہے جس کی بدولت بہت سوں نے خوشہ چینی کی اور بہت ہی معیاری مجلہ شائع کیا۔ ان دنوں میں اورینٹل اردو کالج کا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں شعر و ادب کی محفلیں تقریباً ہر کالج میں زور و شور سے جاری رہا کرتی تھیں۔ ہر کالج میں کچھ ایسے ذہین طالب علم بھی تھے جو اپنی تحریری و تقریری صلاحیتوں کے لئے اور شاعر و ادیب کی حیثیت سے منظرِ عام پر آ رہے تھے۔ مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ ان دنوں ہاشم حسن سعید کن کن دوستوں کے ساتھ معمولی اور غیر معمولی تعاون کیا کرتے

تھے لیکن اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ جامعہ عثمانیہ میں ایم اے (اردو) کی زیر تعلیم طالبات کی ہر ممکنہ مدد کرتے تھے چاہے وہ کتابوں کی شکل میں ہو کہ کہ نوٹس کی شکل میں۔ ہاشم اپنے دورِ طالب علمی (ایم اے اردو) میں پامسٹ کی حیثیت سے بہت زیادہ مشہور تھے۔ ہاشم نے بہت سی لڑکیوں کی ہتھیلیوں کی لکیروں کو پڑھا ہے وہاں کے بہترین مستقبل کی نشان دہی کرتے ہوئے یہ بتاتے رہے کہ اعلیٰ تعلیمی حیثیت کے علاوہ ان کی نئی زندگی کی بہترین شروعات کب سے ہونے والی ہے لڑکیاں ان سے بڑے اعتماد کے ساتھ ملتی تھیں اور ان سے بلا تکلف مدد حاصل کرتی تھیں یقیناً کچھ لڑکیاں ہاشم کی شخصیت میں دلچسپی لیتی رہی ہوں۔ لیکن جذباتی ماحول کے باوجود ہاشم نیک نام رہے اسی زمانے کی ایک طالبہ جو پوسٹ گریجویشن کر رہی تھی اس سے ہاشم کچھ زیادہ ہی متاثر تھے اس کی ہر مسئلہ میں مدد کرنا چاہتے تھے حسن اتفاق سے اسی لڑکی سے میرا شاعرانہ رشتہ تھا۔ وہ لڑکی میری شاعری سے بہت زیادہ متاثر تھی رفتہ رفتہ سلسلہ رشتہ کی شکل میں طویل ہوتی گئی آج بھی وہ رشتہ "گل تازہ" کی طرح مہک رہا ہے وہ دور میری زندگی کا نہایت شگفتہ، نکھرا ستھرا اور دل و جان کو معطر کرنے والا دور تھا وہی ایک سلسلہ رسم و رہ تھا جو ہاشم اور مجھ کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون رہا۔ ان دنوں مختلف عنوانات کے تحت ہاشم کے مکان پر میں اکثر جایا کرتا تھا۔ ہمارا علمی و ادبی مشغلہ مسلسل جاری رہا۔

ہاشم نے جب شعر کہنا شروع کیا میری شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ اُس زمانے میں میں نے ہاشم کو ۲۵، ۳۰ منظوم خطوط لکھے تھے وہ خطوط ہاشم کے ہاں محفوظ تھے لیکن انھوں نے ایک سال قبل ایک ریسرچ اسکالر عبدالوہاب غوری افغانی کے حوالے کیئے۔ جو صلاح الدین نیر حیات اور کارنامے کے زیرِ عنوان پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اُن خطوط میں اشاروں کنایوں میں وہ تمام باتیں جگہ پائیں جو حساس مزاج انسان کے لئے ماضی کے خوشگوار لمحوں کی سیر کراتی ہیں ـــــ ہاشم حسن سعید سے طویل ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مختلف سلسلوں اور مختلف بہانوں سے۔ ہاشم نے جب کالج آف لنگویجس میں لکچرر کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر لی پھر پرنسپل بنے تو اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں کا بہترین مظاہرہ کیا۔ کالج کی ترقی میں شب و روز مصروف رہے۔ اُس زمانے میں کالج مختلف مسائل میں گھرا ہوا تھا محقق کی حیثیت سے علمی و ادبی حلقوں میں ہاشم کا نام لیا جاتا رہا۔ ہاشم کالج کے لئے ناگزیر ہو گئے۔ کالج آف لنگویجس بعض تنظیمی ـــــ طریقۂ کار کی وجہ سے تقریباً ۴ برس تک مشکلات کا شکار رہا۔ کالج تقریباً ۴ برس بند رہا۔ ویسے ہاشم سکریٹریٹ میں اکثر اُن دنوں کالج کی مختلف کارروائیوں کے سلسلے میں آیا کرتے تھے مجھ سے بھی ملاقات کے لئے ہاشم آتے۔ کالج کی کارروائی انھیں بار بار سکریٹریٹ کھینچ لاتی تھی کالج عملاً ختم ہو گیا تھا لیکن ہم نے اپنی کوششوں سے اس کالج کو نئی زندگی دی اس طرح ہاشم کالج آف لنگویجس کے معمار ہیں۔ میں سکریٹریٹ میں بہت سے شاعروں

اور ادیبوں، علمی ادبی شخصیتوں کے علاوہ ادبی کارروائیوں کے سلسلے میں ہر ممکنہ مدد کرتا تھا۔ جس کی تفصیل میں نے ایک مضمون کی شکل میں اپنی کتاب "سلسلہ پھولوں کا" (خود نوشت ۱۹۹۲ء) میں بتلائی ہے کالج آف لنگویجس کی فائیل کو شریک ریکارڈ کیا گیا تھا۔ میں نے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیتے ہوئے محکمہ تعلیمات کے متعلقہ ڈپٹی سکریٹری مسٹر کرشنا مورتی (جو میرے قریبی دوست تھے) کے مشورے و تعاون سے کالج کو دوبارہ وجود میں لانے کی کارروائی شروع کی۔ ہاشم نے ڈپٹی سکریٹری کے مشورہ سے ایک درخواست محکمہ تعلیم کے نام دی جو فائیل ۴ برس پہلے داخل دفتر کی گئی تھی اس فائیل کو مسٹر کرشنا مورتی نے ریکارڈ روم سے نکلوایا۔ اپنے بہتر ین نوٹ کے ساتھ محکمہ فینانس، محکمہ قانون اور جی اے ڈی کو بھیجوایا۔ یہ کالج مسلسل کوششوں کے بعد بحال ہو گیا۔ اس زمانے میں فینانس ڈپارٹمنٹ کے متعلقہ اسسٹنٹ سکشن آفیسر میرے ایک دوست مسٹر مجیب تھے انہوں نے بھی اس کیس میں بڑی مدد کی۔ میرے اس تعاون کے بعد ہاشم کی میری دوستی مزید مستحکم ہو گئی۔ جب میں پرانے شہر سے اپنے نئے مکان ملے پلی میں آ گیا تو سب سے پہلے میری ملاقات نامور شاعر مومن خان شوق سے ہوئی۔ پھر ہاشم حسن سعید سے جن کا مکان میرے گھر کے قریب ہی ہے۔ کبھی کبھی ہاشم سے ملاقات ہوتی تھی ان کے کالج (واقع دیجئے نگر کالونی) بھی جاتا رہا ہوں ملاقات کے لئے یا کسی ادبی کام کے سلسلے میں۔

ہاشم حسن سعید کالج کے پرنسپل تھے وہ شعری و ادبی محفلوں سے دور رہا کرتے تھے

ممانیہ ، ہ شاعروں نے شرکت کی تھی۔ ہاشم حسن سعید کے با صلاحیت
کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ شریمتی روڈ امستری صدرنشین انڈین
ویلفیر سوسائٹی نے انھیں اپنا رفیق کار بنالیا ہے سوسائٹی
ٹرسٹی نامزد کئے گئے ہیں۔ حال ہی میں شریمتی روڈ امستری کی سماجی
فلاحی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں شاندار پیمانے پر جو بلی ہال میں
گیا جس کے ہاشم کنوینر تھے۔ ہاشم شہر کی بعض علمی و ادبی انجمنوں
ادبیات اردو، میرا شہر میرے لوگ وغیرہ سے بھی وابستہ ہیں
میرا شہر میرے لوگ کے رکن عاملہ ہیں اور ماہنامہ خوشبو کا سفر"
مشاورت میں شامل ہیں۔ شہر کی نامور شخصیتوں سے مراسم
لے لوث پُرخلوص دوست ہیں۔ میں ہاشم کو اس لئے بھلا نہ
کہ وہ میری ابتدائی شاعری اور میرے جذباتی لمحوں کے امین رہے
بنیادی رشتہ اور رشتۂ گل تازہ کی وساطت سے ہاشم ہیں ہمیں
یادوں کی خوشبو محسوس کرتا رہوں گا۔ ہر شخص کی زندگی میں کچھ ا
بھی ملتے ہیں جو تا حیات سایہ کی طرح مختلف حوالوں کے ذریعہ سا
رہتے ہیں ان میں سے میرے ایک بہترین دوست ہاشم حسن سعید

یعقوب میراں مجتہدی

(اُردو۔ انگریزی لغت کے تدوین کار، شگفتہ مزاج شخصیت)

بعض لوگ اپنی شگفتہ مزاجی، شُستہ طبیعت اور باوقار لب و لہجہ سے کچھ اس طرح متاثر کرتے ہیں کہ جب کبھی اُن سے ملاقات ہو جاتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ سلسلۂ گفتگو جاری رہے۔ دورانِ گفتگو اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ شاید اطراف و اکناف کا سارا ماحول موسمِ گُل کی بشارت دے رہا ہو اور ہم کھلی فضاؤں اور تازہ ہواؤں کے درمیان سانس لے رہے ہیں اس طرح کے لوگوں کے مسکراتے ہوئے چہروں پر صبح کی پہلی کرن زر فشاں رہتی ہے ان کا طرزِ تکلم نہ صرف پُر کشش ہوتا ہے بلکہ اس میں مٹھاس بھی ہوتی ہے جن لوگوں کی زندگی کا مقصد دوسروں کی مسرتوں میں اضافہ کرنا ہوتا ہے وہ تا دم حیات مہکتے رہتے ہیں۔ اس طرح کی نعمتوں سے فیض پانے والی شخصیتوں میں اُردو لغت کے نامور مرتب و مترتین کار جناب یعقوب میراں مجتہدی بھی ہیں۔

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے خاص مقصدِ حیات سے گہری وابستگی رکھتے ہوئے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ اپنے مقصد کی تکمیل تک تن دہی اور وارفتگی کے عالم میں گذار دیتے ہیں۔ میراں صاحب کی اس لغت کے بارے میں اُردو دنیا کے اہم مشاہیر اُردو اور ماہر فن نے اپنی بہترین تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ اُردو، انگریزی کے کئی اخباروں میں اس لغت کی افادیت کے بارے میں بہت کچھ شائع ہو چکا ہے۔ حیدرآباد کے لیے یہ ایک بڑے اعزاز کی بات ہے کہ یعقوب میراں صاحب نے لغت کی تاریخ میں اپنے بہترین کارنامے سے اپنی ایک تاریخ بنالی ہے۔ میراں صاحب نے اس لغت کا سارا کام تنہا کیا ہے۔ حیدرآباد کی اس باہنر، ذی علم، باوقار شخصیت سے اُردو دنیا کے سارے ادبی حلقے واقف ہیں۔ ملک کے کئی دانشوروں نے ان کے گھر پہنچ کر ان کے کام کا معائنہ کیا اور کھل کر اپنی نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے۔ میراں صاحب محکمہ نظامت ترجمہ میں اپنی بہترین صلاحیتوں اور عمدہ کارکردگی کے سبب نیک نام رہے۔ میراں صاحب کو اُردو شعر و ادب سے بہت دلچسپی ہے شہر کے ہر معیاری علمی و ادبی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں لیکن اِدھر کچھ مہینوں سے اپنی ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے محفلوں میں بہت کم شرکت کر رہے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ وہ میری اکثر کتابوں کی رسم اجرا تقریب میں شریک رہے ہیں۔ میراں صاحب سے میرے دوستانہ مراسم زائد از ۲۰ برس سے ہیں۔ علمی و ادبی محفلوں کے علاوہ میں محکمہ پنچایت راج اور محکمہ نظامت ترجمہ کے بعض مشترکہ کام کے سلسلے میں میراں صاحب سے ملتا رہا ہوں۔ خاص طور پر سالانہ بجٹ

کے سلسلے میں ہر محکمہ کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کے لیے محکمہ نظامت ترجمہ سے ربط رکھنا ضروری رہتا ہے۔ میراں صاحب نے میری خواہش پر سکریٹریٹ کے کچھ محکموں سے تعلق رکھنے والے بعض اردو داں اصحاب کی کافی مدد کی۔ کئی مرتبہ پنچایت راج ڈپارٹمنٹ کے بجٹ کے سلسلے میں مجھے محکمہ نظامت ترجمہ سے ربط رکھنے کی ذمہ داری سونپی جاتی رہی اور میں بہت کم وقت میں اپنے محکمہ کے تقریباً ۵ صفحات پر مشتمل انگریزی تحریر کا اردو میں ترجمہ کروایا تھا اور اس ترجمہ کے سلسلے میں میراں صاحب کلیدی رول ادا کرتے تھے۔ یعقوب میراں صاحب کی سکریٹریٹ کے تقریباً تمام اعلیٰ عہدہ داروں سے رسم و راہ تھی خاص طور پر محکمہ فینانس کے عہدہ داروں سے ان کا زیادہ ربط تھا۔ کبر وقت اور اپنے بھرپور تعاون کی وجہ سے پورے سکریٹریٹ میں میراں صاحب کا نام روشن ہو گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یعقوب میراں صاحب میرے محکمہ پنچایت راج کے کام کو ہمیشہ ترجیح دیا کرتے تھے۔ میراں صاحب احساس ذمہ داری کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے والے آفیسر کی حیثیت سے ہمیشہ اعلیٰ عہدہ داروں کی نظر میں رہے۔ ان کی اعلیٰ کارکردگی کو ملحوظ رکھتے ہوئے محکمہ نظامت ترجمہ میں ڈپٹی ڈائرکٹر کا ایک زائد پوسٹ کا اضافہ کیا گیا جنھیں اس عہدہ پر ترقی دی گئی۔ انھوں نے دوران ملازمت اپنے بعض ماتحتین اور اپنے ہم منصب ساتھیوں کی بہت مدد کی اور اپنے خوشگوار تعلقات برقرار رکھے۔ میراں صاحب، حیدرآبادی تہذیب کی نمائندگی نہ صرف اپنے رکھ رکھاؤ کے ذریعہ ہی کرتے ہیں بلکہ اپنی خوش لباسی سے بھی وہ مرکز نظر

بنے رہتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی کالی شیروانی اُن پر خوب سجتی ہے۔ ان کے حلقۂ احباب میں نہ صرف شاعر وادیب ہی شامل ہیں بلکہ شہر کے بڑے بڑے علمی وادبی اداروں اور انجمنوں کے سربراہ بھی ہیں۔ شہر کی معزز شخصیتوں سے بھی اُن کے مراسم ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میراں صاحب شہر کے تمام ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں لغت کی تکمیل ان کے برسوں کا خواب تھا۔ انھوں نے اپنی ساری ادبی و تہذیبی زندگی صرف اور صرف لغت کی تدوین میں صرف کی۔ اپنی ملازمت کے دوران جو تجربات حاصل ہوئے اُن سے فائدہ اٹھایا۔ یعقوب میراں مجتہدی کوئی ۲۹ سال دفتر نظامت ترجمہ حکومت آندھرا پردیش میں اُردو مترجم رہے۔ اور ڈپٹی ڈائرکٹر ترجمہ (اُردو) کی حیثیت سے جولائی ۱۹۸۹ء میں وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ میراں صاحب نے تقریباً سوا لاکھ الفاظ کے معانی اور ان کے استعمال کے لیے تین لاکھ کارڈ بنائے ہیں۔ یہ لغت دس ہزار ٹائپ شدہ فل اسکیپ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس لغت کی ضخامت ۲۸۰۰ صفحات سے زائد ہو سکتی ہے۔ جو تین جلدوں پر مشتمل رہے گی لغت میں الفاظ کا تلفظ رومن رسم الخط میں دیا گیا ہے۔ یعقوب میراں صاحب نہ تو شاعر ہیں نہ ہی ادیب البتہ ادبی ذوق ان کی نس نس میں رچ بس گیا ہے تب ہی تو وہ شہر کے معیاری جلسوں میں موجود رہتے ہیں۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ اگر انہیں کسی ادبی جلسے میں یا کسی مشاعرہ میں شرکت کرنی ہو تو وہ بہ پابندی وقت شرکت کرتے ہیں آداب محفل کی پاسداری کرتے ہوئے محفل کے آغاز سے اختتام تک موجود رہتے ہیں

میراں صاحب نہایت خوش اخلاق، خوش مزاج، پُر وقار شخصیت کے حامل ہیں۔ ادبی جلسوں کے علاوہ اُن سے اُردو کے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہتی ہے نہایت روشن خیال، کشادہ دل و دماغ رکھنے والے انسان ہیں۔ وہ کھلے ذہن اور پاک و صاف خیالات رکھنے ہیں میری شعری و ادبی سرگرمیوں سے خوش ہونے والے دوستوں میں شامل ہیں۔

جناب یعقوب میراں کا نام نعت کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

پروفیسر محمد عبدالرزاق فاروقی

(قلندر صفت، فقیر منش، قابل استاد)

تبحّر علمی کے ساتھ ساتھ، سادگی پسند، بے تیار انہ طرزِ زیست اور منکسرانہ مزاج کی حامل شخصیتیں جن کا تعلق کسی بھی شعبۂ درس و تدریس سے کیوں نہ ہو جب وہ اپنی ذمہ داریوں کو دیانت داری کے ساتھ نبھانے کا ہنر جانتی ہیں اور جن کے طلباء اپنے اساتذہ کی عالمانہ صلاحیتوں سے مکمل مستفید ہوتے ہیں تو ان کی شخصیت پسندیدگی کے ساتھ برقرار رہتی ہے اور جب ایک استاد، ایک طالب علم کی حیثیت سے مشکل ترین حالات سے گذرتے ہوئے اعلیٰ منصب پر پہونچتا ہے تو وہ یقیناً قابلِ قدر و منزلت اور لائق تعظیم و تکریم ہوتا ہے۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس طرح کے بعض اساتذہ کا میں طالب علم رہا ہوں۔ اپنی ابتدائی تعلیم کے زمانے سے ایم۔ اے ایل (پوسٹ گریجویشن) کی تعلیم کے دوران اس طرح کے باحوصلہ، با ہمت

اور جہدِ مسلسل سے اپنی زندگی کو اعلیٰ منزلوں تک پہونچانے والے اساتذہ سے مستفید ہوتا رہا ہوں جن کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے تہذیبی و شائستگی اقدار کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کرتی رہی ہے۔ ہر طالب علم اپنی طالب علمانہ زندگی میں کئی اساتذہ سے فیض حاصل کرتا رہتا ہے لیکن ان میں کچھ ہی ایسے اساتذہ ہوتے ہیں جن کو طالب علم تاحیات یاد رکھتے ہیں۔ میرے ایسے اساتذہ میں پروفیسر محمد عبدالرزاق فاروقی بھی ہیں جو مختلف تعلیمی اداروں مختلف انسٹیٹیوشنس اور کالجس میں معلم کی حیثیت سے بہترین خدمات انجام دینے کے بعد آخر میں گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ کی حیثیت سے ۱۹۸۳ء میں مامور ہوئے اور اسی یونیورسٹی سے اسی خدمت پر جولائی ۱۹۹۱ء میں سبکدوش ہوئے۔ جہاں وہ ۸ برس تک اکیڈیمک کونسل کے رکن بھی رہے۔ پروفیسر فاروقی کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ آئی اے ایس کے امتحانات کے ممتحن بھی رہے۔ یونین پبلک سروس کمیشن کی خدمت بھی انہوں نے کئی برس تک انجام دی۔ یونیورسٹی گرانٹ کمیشن (U.G.C) نے بھی تحقیقی پراجکٹ کے ایکسپرٹ کے طور پر ان کی خدمات حاصل کیں انہیں کئی علمی و ادبی اعزازات سے نوازا گیا۔ گورنر آندھرا پردیش کمود بین جوشی نے مولانا ابوالکلام آزاد کے صدسالہ جشن کے موقع پر انہیں "آزاد شناس" کے ایوارڈ، توصیفی سند اور شال سے نوازا۔

یہ تقریب جوبلی ہال باغ عامہ میں منعقد ہوئی تھی۔ لکھنو کی بہتی میر
کیڈیمی نے اُن کی مجموعی علمی و ادبی خدمات پر "امتیاز میر" کا ایوارڈ
دیا۔ پروفیسر فاروقی نے لکھنو کے ادبی، سماجی اور سیاسی پس منظر
میں اودھ پنچ کی ادبی خدمات پر اپنا ایک ضخیم مقالہ پیش کیا تھا
جس پر آپ کو سری وینکٹیشورا یونیورسٹی نے پی ایچ ڈی کی ڈگری
عطا کی۔ کئی ریسرچ اسکالرس کے گائیڈ رہے۔ پروفیسر صاحب کے زیر نگرانی
۲۰ طلباء نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور دو طلبا نے ایم فل کیا
پی ایچ ڈی کے مقالہ جات میں ڈاکٹر حمید الدین شرفی کا مقالہ "حیات
اور اس کی خدمات" سب سے اہم ہے۔ پروفیسر صاحب حیدرآباد کی
مشہور درس گاہ دارالعلوم اور اس کے بعد چادر گھاٹ کالج کے
ذہین طالب علم رہے ہیں جس کے پرنسپل ڈاکٹر سید محی الدین قادری
زور تھے جہاں ڈاکٹر فاروقی صاحب کامرس کے طالب علم اور کامرس یونین
کے نائب صدر تھے۔ جامعہ عثمانیہ میں جس وقت عبدالقادر سروری صدر
شعبۂ اردو تھے اُس وقت کے اساتذہ میں پروفیسر سید محمد، ڈاکٹر
حفیظ قتیل اور حمید شطاری شامل تھے۔ پروفیسر سید محمد صاحب
کے اصرار پر فاروقی صاحب نے بی اے میں اردو مضمون اختیاری کے
طور پر لیا تھا۔ پروفیسر صاحب کا میں شاگرد رہا ہوں جو میرے اولین
اساتذہ کی فہرست میں شامل ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے وطن متعلقہ
ہمنا باد ضلع بیدر کے مڈل اسکول میں جماعت ہفتم کا طالب علم تھا تو

اس وقت اسکول کے صدر مدرس نبی الحسن (فاضل دیوبند) مظفر نگر میرے شفیق استادوں میں شامل رہے۔ تمام اساتذہ میں نبی الحسن صاحب مجھے بے حد پسند تھے۔ حیدرآباد میں منشی فاضل کے اساتذہ میں مولانا گلیمی کو میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ جو غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل تھے علی گڑھ میٹرک کے پرائیوٹ طالب علم کی حیثیت سے جب میں امتحان کی تیاری میں مصروف رہنا چاہا تو مجھے پروفیسر فاروقی جیسے ذہین و فطین استاد کی سرپرستی حاصل رہی۔ عابڈس پہ پیالس ٹاکیز سے متصل عمارت میں مدھیہ پردیش کے امتحانات انٹرمیڈیٹ کے لیے انسٹی ٹیوٹ قائم تھا جس کے بہترین استاد محمد علی سے میں بہت متاثر رہا۔ اس طرح اورینٹل اُردو کالج کے قابل اساتذہ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد، پروفیسر سید محمد ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر زینت ساجدہ، پروفیسر مغنی تبسم اور پروفیسر حبیب ضیا مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے جن کی تعلیمی و تہذیبی تربیت نے مجھے بہت زیادہ فائدہ پہونچایا۔

اچھے استاد کبھی بھلائے نہیں جا سکتے اور ایسے وقت زیادہ یاد آتے ہیں جب طالب علم اپنی عملی زندگی میں ارتقائی منازل طے کرتے رہتے ہیں۔ ہر ترقی کے زینے پر اپنے شفیق اساتذہ کی یاد آجاتی ہے ایسے لمحات میں طالب علم کے دل سے اپنے استاد کے حق میں دل سے دعائیں نکلتی ہیں اور وہ اپنے اساتذہ کی احسان مندی کا قرض پوری طرح نہیں اتار سکتا۔ پروفیسر عبدالرزاق فاروقی کا طریقۂ درس و تدریس

پُر اثر ہوتا تھا۔ طلباء اُن سے بے حد مطمئن رہا کرتے تھے پروفیسر صاحب سے ایک طویل عرصہ تک ملاقات نہیں ہوئی۔ برسوں بعد عثمانیہ کالج کرنول کے مشاعرہ میں ملاقات رہی۔ پروفیسر صاحب اس کالج کے اساتذہ میں سے ایک تھے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ کالج کے اُس مشاعرہ میں کس نے مجھے مدعو کیا تھا۔ حیدرآباد کے نمائندہ شاعروں نے شرکت کی تھی۔ انہوں نے انٹرمیڈیٹ کے طالب علم کی حیثیت سے ڈاکٹر زور، پروفیسر عاقل علی خان، عبدالقیوم خان باقی اور خواجہ حمیدالدین شاہد کی ہمت افزائی سے ڈرامہ نگاری شروع کی۔ انہوں نے ڈرامہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ ان کا پہلا ڈرامہ "سبولہ" ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کے لیے کئی فیچرس اور ڈرامے لکھے۔ اب وہ صرف تحقیقی مقالوں کی دنیا میں مصروف بہ کار ہیں۔ ان کی ۶۰ ویں سالگرہ کے موقع پر نذر رزاق فاروقی شائع ہوئی جس میں بعض ادیبوں اور شاعروں کی تحریریں اور تہنیتی نظمیں شامل ہیں۔ میں نے بھی اپنے اُردو کے خاموش خدمت گذار استاد کو منظوم نذرانہ پیش کیا تھا جو اس میں شامل ہے انہوں نے پبلک ایڈمنسٹریشن میں بھی پوسٹ گریجویشن کی تکمیل کی ہے۔ امتیاز کے ساتھ ایم ایڈ کی تکمیل کی۔ اُردو کے ماہر تعلیم رائے بل بیر پرشاد بھٹناگر کے عزیز ترین شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات نامی

منظوم (مصنف حکیم و میبر ائے وہی) شائع کی اور ڈاکٹر رادھا کشن کے فلسفۂ تعلیم پر انہوں نے اسی دور میں لکھا تھا جس پر کالج آف ایجوکیشن عثمانیہ یونیورسٹی نے درجۂ اول میں ایم ایڈ کی ڈگری عطا کی۔ پروفیسر فاروقی نے ٹیچر ٹرینگ کالج سے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا اس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج کاکناڈا میں ملازم ہوئے پھر عثمانیہ کالج کرنول سے وابستہ رہے جہاں انہوں نے ۲۰ سال خدمت انجام دی۔ کرناٹک اردو اکیڈیمی نے ان کی کتاب ابوالکلام آزاد کے تعلیمی تصورات پر سات ہزار روپے کا انعام دیا۔ کلکتہ، پٹنہ، لکھنو، علی گڈھ، ناگپور، مدراس اور نئی دہلی میں کئی کانفرنسوں اور سیمناروں میں اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ ایک طویل مدت تک فاروقی صاحب سے میری کہیں ملاقات نہیں ہوئی۔ البتہ مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ فاروقی صاحب کا صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے گلبرگہ یونیورسٹی میں تقرر ہوا ہے۔ میں فاروقی صاحب اور ان کے ساتھ کام کرنے والے دیگر اساتذہ کے بارے میں واقف تھا۔ حیدرآباد کی بعض علمی و ادبی محفلوں میں پروفیسر صاحب سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ایک دن کی بات ہے کہ مجھے پروفیسر صاحب کا میری شاعرانہ مصروفیات کے سلسلے میں خط ملا جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ میں گلبرگہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم کو آپ کی شاعرانہ خدمات پر ایم فل کرنے کے لیے اجازت دینا چاہتا ہوں۔ ان کے خط کا اقتباس کچھ اس طرح ہے " اس خط کے لکھنے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ

آپ کی شعری خدمات اور دیگر تہذیبی خدمات کا بہ صورت مقالہ کیوں نہ احاطہ کیا جائے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ پر کسی طالب علم نے یا آپ کے کسی دوست نے کام کیا ہے۔ آپ اس بارے میں مجھے لکھیں میں نے اس ماہ ریسرچ کے لیے چند طلباء اور طالبات کو داخلہ دیا ہے میری یہ تجویز ہے کہ کوئی ہونہار طالب علم آپ کی شعری خدمات کا تفصیل سے جائزہ لے۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ اس معاملہ میں آپ کے بھرپور تعاون کی ضرورت ہوگی۔ نیز میرا یہ بھی خیال ہے کہ اس کام کے نگران میرے رفیق کار ڈاکٹر راہی قریشی ہوں۔ وہ خود شاعر ہیں اور آپ سے خوب واقف ہیں مجھے اس ماہ کی آخری تاریخ تک موضوعات کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے اس لیے جواب کا انتظار مجھ سے زیادہ متعلقہ اسکالر کو ہوگا۔" (گلبرگہ ۱۹۸۹ء)

میری شاعری پر عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم فل کی ڈگری کے لیے کسی طالب علم کو اجازت دی جاسکتی تھی لیکن بعض کرم فرماؤں نے حسب عادت و حسب روایت سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ پروفیسر عبدالرزاق فاروقی صاحب کی زیر نگرانی گلبرگہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم خواجہ معین الدین نے ۱۹۹۰ء میں میری شاعری پر مقالہ لکھا اور وہ درجہ اول میں کامیاب ہوگئے۔ پروفیسر رزاق فاروقی کے مشفقانہ عمل نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں ان کا احسان مند ہوں۔ ایم فل کے مقالہ کے ایک ایکسپرٹ ڈاکٹر عقیل ہاشمی بھی تھے۔ ڈاکٹر عقیل ہاشمی

اُس وقت صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ تھے پروفیسر اکبر علی بیگ کی زیرِ نگرانی جامعہ عثمانیہ کے ایک طالب علم عبدالوہاب غوری افغانی نے صلاح الدین نیر حیات اور کارنامے کے عنوان پی ایچ ڈی کے لیے انٹرویو دیا تھا۔ عبدالوہاب غوری نے سخت مشکلات و مخالفت کے باوجود جامعہ عثمانیہ سے اپنے انٹرویو میں کامیابی حاصل کی۔ ممتحنین میں صدر شعبۂ اُردو ڈاکٹر عقیل ہاشمی۔ عبادت مبین ڈاکٹر بیگ احساس ڈاکٹر محمد عثمان کے علاوہ شریمتی لکشمی بائی ڈین آف فیکلٹی شامل تھیں۔ لاکھ رکاوٹوں کے باوجود عبدالوہاب غوری نے اپنے انٹرویو میں کامیابی حاصل کی جن کا مقالہ اپنے سفر کی آخری منزل میں داخل ہو چکا ہے۔ مجھے اس بات کا اندازہ ہے کہ ملک کی تمام جامعات کے شعبہ کا ماحول رسہ کشی کے نازیبا عمل سے گذرتا رہتا ہے سارا شعبی دشمنیوں کو ایسے موقعوں پر سرِ محفل کھڑا کیا جاتا ہے۔ یقیناً پروفیسر عبدالرزاق فاروقی صاحب بھی اپنی درس و تدریس کی طبی مدت میں بہت سے تلخ تجربات سے گزرے ہوں گے صدر شعبۂ اُردو گلبرگہ کی حیثیت سے بھی کئی مسائل سے انھیں نبرد آزما ہونا پڑا ہوگا۔ ویسے بھی دھوپ چھاؤں کا موسم انسانی زندگی کے لیے ارتقاء پذیر ہوا کرتا ہے لیکن متوازن زندگی بہت کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے کشمکش حیات جہدِ مسلسل اور متحرک زندگی معاشرہ میں اپنے انداز سے جینے کا فن

سکھاتی ہے۔ فاروقی صاحب کی ساری زندگی جہد مسلسل کے نام
منسوب ہو چکی ہے علمی و ادبی ماحول میں اپنا مقام بنانے کے لیے بہت
زیادہ سرگرداں رہے ہے فاروقی صاحب آج بھی علمی و ادبی مصروفیات
میں اپنا وقت گذار رہے ہیں۔ بعض ادبی جلسوں میں لطیفے بہترین
معلومات آفریں خطاب سے نوازتے رہتے ہیں۔ انھیں اپنی
شخصیت کی تشہیر کی کبھی بھی خواہش نہیں ہوتی۔ اپنی قلندرانہ
طبیعت اور اپنے فقیرانہ خانقاہی طرز حیات سے مطمئن ہیں
میں یہ کبھی نہیں بھولوں گا کہ وہ نہ صرف ایک بہترین استاد کی
حیثیت سے ہی بلکہ ایک بامروت انسان کی طرح اپنے شاگردوں
کو ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے
تو بچھ سے بے ساختگی کے ساتھ ملتے ہیں اور اپنی دعاؤں سے
نوازتے ہیں۔ فاروقی صاحب اب بھی طلبا و ریسرچ اسکالرس کی
رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ انھیں شعر و ادب کی سرگرمیوں سے
وابستہ رہنے کی تلقین کرتے ہیں انھیں اپنے مفید مشوروں سے سرفراز
کرتے ہیں کہ اپنی صلاحیتوں کا اظہار ذریعہ تقریر و تحریر کرتے رہیں
وہ چاہتے ہیں کہ ان کے طالب علم شعری و ادبی دنیا میں اپنی صلاحیتوں
کا بھرپور مظاہرہ کریں۔ پروفیسر صاحب کی اہلیہ محترمہ ڈاکٹر پروین
رخسانہ گلبرگہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کی سینئر پروفیسر ہیں انھیں
بھی علمی و ادبی مصروفیات سے خاصی دلچسپی ہے حتیٰ کہ حال ہی میں ایک

کتاب نئی منزیں کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کی رسم اجرا سیاست گولڈن جوبلی ہال میں جناب زاہد علی خان مدیر سیاست کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ پروفیسر فاروقی کی اہلیہ ایم اے ایم ایڈ اور ہندی کی ایم اے ہیں انہوں نے تاریخ میں پی ایچ ڈی کیا ہے پی بی رضا کالج گلبرگہ کی پرنسپل رہیں۔ جب ۱۹۸۰ء میں گلبرگہ یونیورسٹی قائم ہوئی تو وہ شعبۂ تاریخ سے متعلق ہوئیں۔ پروفیسر ڈاکٹر پروین رخسانہ چھ کتابوں کی مصنفہ ہیں ان کے ۲ تحقیقی مقالے شائع ہو چکے ہیں یہ سب انگریزی میں ہیں ڈاکٹر پروین رخسانہ کا اہم کام مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن کا ٹھیٹ ہندی میں ترجمہ ہے۔ پروفیسر فاروقی صاحب شریف النفس، بامروت با اخلاق انسان ہیں۔ ان کی ابتدائی تعلیم کا رشتہ مشہور درس گاہ دارالعلوم سے ہی ہے۔

فاروقی صاحب جیسی شخصیتوں پر لکھتے ہوئے مجھے بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے پروفیسر صاحب پر اور ــــ اس کتاب میں شامل ہونے والی تمام شخصیتوں پر مضامین لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ میں اپنے دوستوں، اپنے چاہنے والوں اور اپنے محسنوں کو اپنی مخلصانہ تحریروں کے ذریعہ خراج پیش کروں۔

☆☆

سلام خوشنویس

(عالمی شہرت یافتہ قابلِ فخر خوشنویس، کہنہ مشق شاعر)

ہنرمندوں، باکمالوں اور جلیل القدر دانشوروں کے شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں ہر زمانے میں بعض ایسے صاحبانِ علم و آگہی، وابستگانِ شعر و حکمت اور پاسبانِ تہذیب و تمدن رہے ہیں جن کے نام فخر کے ساتھ لیے جا سکتے ہیں۔ لیکن آج بھی ہمارے شہر میں کچھ ایسی باصلاحیت قابلِ قدر، لائقِ ستائش، روشن دماغ، فراخ دل اور دیدۂ بینا رکھنے والی شخصیتیں موجود ہیں جو اپنی ذہانت و فطانت اور قابلِ رشک، ذہنِ رسا کی بدولت ہمارے معاشرے پر چھائی ہوئی ہیں۔ اس طرح کی ایک خوش نصیب شخصیت جناب سلام خوشنویس کی بھی ہے جن کا عالمی شہرت یافتہ خوشنویسوں میں شمار ہوتا ہے خاص طور پر ہم حیدرآبادیوں کے لیے یہ بات باعثِ فخر و مباہات ہے کہ سلام صاحب جن کا وجود اردو معاشرے کے حق میں نہ صرف قابلِ تحسین ہے۔

ہی ہے بلکہ استفادہ فکر و فن کے لیے بھی ہے۔ سلام خوشنویس صاحب فن خوشنویسی کے میدان میں میرِ کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا نام اور کام زائد از ہم دہیوں سے اپنی شہرت و مقبولیت کی بلندیوں پر جگمگا رہا ہے۔ سلام صاحب کے فن کی شہرت ساری اردو دنیا میں پہنچ چکی ہے سلام صاحب بھی حیدر آبادی ہیں ان کے والدِ محترم عبدالغفار رفیق ان مستند استادِ شخص تھے سلام صاحب نے دارالعلوم ہائی اسکول کالی کمان سے ۱۹۵۱ء میں میٹرک کامیاب کیا۔ ۱۹۵۲ء میں پاکستان چلے گئے کراچی میں سکونت اختیار کی۔ حیدر آباد کالونی میں سکونت پذیر تھے انجمن ترقی اردو کراچی سے انہیں تعلق خاطر تھا۔ سلام صاحب کے تایا مولوی محمد عبدالرزاق صاحب محکمۂ محاسبی میں مددگار تھے حیدر آباد میں اردو اسٹینوگرافی کے ماہر تھے۔ سلام صاحب نے انہی سے یہ فن سیکھا۔ حیدر آباد سے اردو اسٹینوگرافر بن کر گئے تھے۔ پاکستان میں جمیل جالبی، حبیب جالبی، حمایت علی شاعر، مشفق خواجہ، شوکت تھانوی، ابن انشاء، عبدالحمید عدم سالم ضیائی، نظر حیدر آبادی، ماہر القادری، ابن صفی، زیڈ اے بخاری بہزاد لکھنوی، جوش ملیح آبادی، شبنم رومانی، ساقی جاوید، سرشار صدیقی عزیز کارٹونسٹ، خورشید احمد اعجاز، محمود ریاض، نسیم امروہوی، جلیل احمد سرنامہ، سراج رضوی، انور عارف، ظفر نیازی، ڈاکٹر انیس زیدی اور افضل الرحمن سے مراسم تھے مولوی عبدالحق پرنسپل اردو کالج کراچی کے زیرِ تربیت بی اے کیا۔ میجر آفتاب حسن (حیدر آباد) بھی اردو کالج

کراچی کے پرنسپال تھے۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق پرنسپال بنائے گئے۔
سلام صاحب پاکستان میں عبدالحمید عدم، ابن انشاء، ماہرالقادری
وغیرہ کی کتابوں کے علاوہ کئی معیاری ماہناموں اور ہفت روزہ کی کتابت
کرچکے ہیں۔ مدیران جرائد میں ابراہیم جلیس، ساقی جاوید، سرشار صدیقی
شوکت تھانوی، خورشید احمد اعجاز علی بیگ وغیرہ تھے۔ بیگم سروری
عرفان اللہ (دہلی) عوامی لیگ کی لیڈر تھیں۔ پوسٹرس اور لٹریچرس کا
پورا کام سلام صاحب کے پاس ہوتا تھا۔ مولانا محمود عباسی (حیدرآباد)
کی کتاب "خلافتِ معاویہ و یزید" کا پہلا ایڈیشن سلام صاحب نے لکھا
سراج رضوی (حیدرآبادی) کی دو کتابیں آفتاب تازہ اور خونی
چٹانیں بھی سلام صاحب نے لکھیں۔ ۱۹۶۱ء میں جبکہ سلام صاحب
انفارمیشن ڈپارٹمنٹ آندھرا پردیش کی کتابت پر مامور تھے نیشنل
بک ڈپو کے مالک سے اجازت حاصل کرکے ادارۂ سلام خوش نویس
کا قیام عمل میں لایا تھا۔ یہ ادارہ نیشنل بک ڈپو کی پہلی منزل پر واقع
تھا اس وقت ۵۶ طلباء کو خوش نویسی سکھاتے تھے جن میں ۱۷
طالبات تھیں۔ نیشنل بک ڈپو میں جماعت ہشتم سے انٹر تک کی تمام
اردو میڈیم کتابوں کی کتابت سلام صاحب نے کی۔ ہر کتاب پر سلام
صاحب کا نام ہوتا تھا۔ کیمیاء ہو کہ حیاتیات، طبعیات ہو کہ
معاشیات، ادبی، نیم ادبی کتابیں وہیں رہتے ہوئے لکھیں۔ پروفیسر
مغنی تبسم کا مقالہ فانی بدایونی، شاذ تمکنت کا تراشیدہ، صفی اورنگ آبادی

کا بر اگندہ، خمار بارہ بنکوی کا آتشِ گل، ڈاکٹر مسعود حسین خان کی کتاب "شعر و زبان" کے علاوہ خورشید احمد جامی، اوج یعقوبی، قمر ساحری، منوہر لال شارب، عظمت عبدالقیوم، ابن احمد تاب، راشد آزر، عزیز قیسی، علی الدین نوید، مجروح سلطان پوری اور ساحر لدھیانوی کی کتابیں لکھیں۔ ماہنامہ پیکر، ماہنامہ شگوفہ اور ماہنامہ پونم کا کام جو اُس وقت یعقوب پر ہوتا تھا معیاری کتابت کے نمونے ہیں۔ اگرچہ سلام صاحب کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے جن میں سے کچھ شاگرد ایسے بھی ہیں جو اپنے استاد کا نام روشن کیے ہوئے ہیں۔ جن میں حسن فرخ، کلیم احمد، منیر الدین غفار قاسمی (حال مقیم کویت) عارف خوشنویس (حال مقیم دمام) ولی الدین مرحوم، عارف الدین والی بال کھلاڑی محکمہ پولیس، رضوان فہیم احمد (فرزند کلیم احمد) محمود سلیم، چاند پاشاہ، ساجد حسینی، ندیم حسینی، صدیقہ بیگم، سجیدہ بیگم، زہرہ بیگم اور طاہرہ تسکین بھی شامل ہیں۔ حسن فرخ سب سے پہلے شاگرد ہیں۔ خاص طور پر ہمارے شہر کا ہر سینئر شاعر یہ چاہتا ہے کہ سلام صاحب کی فنکاری کی کہکشاں سے اپنے مجموعۂ کلام کی مانگ بھرے لیکن شاید ایسا ممکن نہ ہو اس لیے کہ ایک تو سلام صاحب کی عدم الفرصتی اور دوسری اہم بات ان کی اُفتادِ طبع۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ ہر کس و ناکس کی عزت بڑھانا نہیں چاہتے۔ سلام صاحب کو معیاری شاعروں کے کلام کی کتابت کرنا پسند ہے میں

جانتا ہوں کہ بعض شاعروں کی آرزو ان کے دل ہی دل میں رہ گئی اس کے باوجود بعض شاعر کسی نہ کسی طرح سلام صاحب سے اپنے شعری مجموعوں کی کتابت کروانے میں کامیاب رہے۔ یہ میری محرومی ہے کہ میں ان کے فن سے تاحال استفادہ نہ کرسکا۔ کئی برس قبل میرے دوسرے مجموعۂ کلام "زخموں کے گلاب" کی اشاعت کے بعد سلام صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میری خواہش ہے کہ میں آپ کا کوئی مجموعۂ کلام لکھوں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم سرِورق پر اپنے فن کا چھوٹا سا نمونہ چھوڑ دینا چاہتا ہوں۔ پھر بھی انہوں نے اپنے عزیز ترین شاگردوں کے ذریعہ مجھ پر احسان کیا میں رضوان اور فہیم احمد سے اپنی اور اپنے دوستوں کی کتابوں کے سرورق کی کتابت کرواتا رہتا ہوں۔ سلام صاحب اعلیٰ درجہ کے خوشنویس ہونے کے علاوہ قادر الکلام شاعر بھی ہیں شفیق ان کا تخلص ہے۔ اپنے والدِ محترم استاد شاعر حضرت عبدالغفار رفیق سے انہیں شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے۔ سلام صاحب مشاعروں میں کلام سنانے سے گریز کرتے ہیں البتہ بزم جوہر میں (جس کے بانی جنرل سکریٹری ممتاز شاعر راہی ہیں) کبھی کبھی کلام سناتے ہیں بعض مشاعروں کی صدارت بھی کی ہے سلام صاحب کی غزلیں کلاسیکی شعری ادب کی نمائندگی کرتی ہیں۔ زبان و بیان کی حسن کاری اور سلاست و روانی کی طرح داری کے ساتھ فنی خوبیوں سے معمور ان کی شاعری اعلیٰ قدروں اور قدیم تہذیبی روایتوں کی امین ہے سلام صاحب ایک باشعور ادیب و نقاد اور مبصر و مقرر بھی ہیں۔ ہمارے معاشرہ میں زندگی کے ہر شعبہ میں بہت

سے لائق و فائق لوگ رہے ہیں۔ اب بھی موجود ہیں لیکن جہاں تک شخصیت کے تعین کا تعلق ہے بہت کم لوگوں کی شخصیت بنتی ہے سلام صاحب اُن لوگوں میں سے ایک ہیں جن کی شخصیت بن چکی ہے سلام صاحب کو شعر و ادب کے موضوع پر اظہارِ خیال کا ملکہ حاصل ہے۔ ان میں تقریباً تمام اصنافِ سخن میں شعر کہنے کی صلاحیت ہے سلام صاحب کم بولتے ہیں مگر سوچ سمجھ کر بولتے ہیں جس طرح وہ اپنی تحریروں اور شاعری میں صحیح الفاظ کا صحیح مقام پر استعمال کرتے ہیں اسی طرح دورانِ تقریر / گفتگو یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ اپنا ایک لفظ بھی ضائع نہیں کر رہے ہیں۔ سلام صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے اور سلسلہ گفتگو جاری رہتا ہے تو مجھے اُن کی شائستہ مزاجی اور ان کی پُر اثر شخصیت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے شہر کے ہر مکتبہ خیال کے دانشوروں، شاعروں ادیبوں اور علماء و مشائخین سے اُن کے مراسم ہیں سلام صاحب نہایت خوددار، بامروت، روشن خیال اور کشادہ دل و دماغ رکھنے والے انسان ہیں سلام صاحب اخبار سیاست سے بھی کچھ عرصہ تک وابستہ رہے۔ ادارہ ادبیاتِ اُردو کے شعبۂ کتابت کے سربراہ رہے سلام صاحب شعر و ادب کے مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سامعین کو مطمئن کرتے ہیں۔ اخبارات میں سماجی، فلاحی، ادبی و تہذیبی مسائل پر ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں شاعرانہ رموز و نکات سے ان کی مکمل واقفیت ان کے والدِ محترم کی ذہنی تربیت کی دین ہی نہیں ہے بلکہ ان

کی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور کثرتِ مطالعہ کی بھی مرہونِ منت ہے۔ ان کے شاعر دوستوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ اکثر ملاقاتوں میں میرے قریبی شاعر دوستوں ناصر کرنولی اور رؤف اختر کا بھی ذکر آ ہی جاتا ہے ڈاکٹر راہی سے انہیں اس لیے بھی قربت ہے کہ وہ اُن کے والدِ محترم کے شاگردِ رشید رہے ہیں۔ سلام صاحب اگرچہ شعری و ادبی محفلوں میں بہت کم شرکت کرتے ہیں لیکن وہ حیدرآباد کی شعری و ادبی سرگرمیوں سے باخبر رہتے ہیں۔ سلام صاحب کے مزاج کی بے ساختگی، اُن کا والہانہ پن اور ان کے شگفتہ اندازِ گفتگو سے بھی میں بہت متاثر ہوں۔ سلام صاحب نہایت پاک و صاف ذہن و فکر کے مالک ہیں۔ ان سے ہر ملاقات تصنع سے مُبرا رہتی ہے دوستی اور انسانی رشتوں کے رمز شناس اور قدر داں ہیں۔ میں سلام صاحب سے دوستی رکھتے ہوئے خوشی و مسرت محسوس کرتا ہوں اور اُن کی بے لوث، پاک و صاف دوستی کا دل سے قائل ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے مرصع قلم کی تابناکی ہمیشہ باقی رہے گی۔

وٹھل راؤ

(نامور گلوکار۔ حیدرآبادی روایات کے پاسدار)

فنِ موسیقی کے دلدادہ اور خاص طور پر غزل گائیکی کی محفلوں سے دلبستگی رکھنے والے اردو تہذیب سے وابستہ حیدرآبادیوں کے سامنے جب کبھی بین الاقوامی شہرت یافتہ گلوکاروں کا ذکر آتا ہے تو بے ساختہ وٹھل راؤ کا نام بھی زبان پر آجاتا ہے۔ وٹھل راؤ گذشتہ ۵۰ برسوں سے شعر و نغمہ کی محفلوں میں اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ ان ۵۰ برسوں میں حیدرآباد کے کئی گلوکاروں نے فنِ موسیقی کو برتنے اور اس کو پروان چڑھانے کے لیے اہم حصہ ادا کیا ہے لیکن آج بھی افقِ موسیقی پر وٹھل راؤ کی شخصیت اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ حیدرآباد میں سینئر گلوکاروں میں رؤف صاحب اور ان کے فرزند عارف رؤف کا نام بھی اہمیت

کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ (جو اب ہم میں نہیں ہیں) خاص طور پر رؤف صاحب کی غزل سرائی کے کافی چرچے تھے۔

وٹھل راؤ کو میں ۳۰، ۳۲ برسوں سے سنتا آرہا ہوں۔ وٹھل راؤ ۱۵ سال کی عمر سے ہی شعر و موسیقی میں دلچسپی لینے لگے۔ وٹھل راؤ حیدرآباد کے ایک فعال ادارے فائن آرٹس اکیڈیمی سے گہرا تعلق رہا ہے وہ کئی برسوں تک فائن آرٹس اکیڈیمی سے وابستہ رہے۔ پھر انہوں نے ایک الگ موسیقی کا اسکول سنگیت سادھنا کے نام سے کھولا۔ جہاں غیر مسلم گلوکار (خواتین و حضرات) ان کے فن سے استفادہ کر رہے ہیں مسلم گلوکار بھی مستفید ہوتے ہیں۔ سنگیت سادھنا میں زیادہ تر غزل گائیکی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سنگیت سادھنا سے وابستہ گلوکاروں میں ممتاز گلوکار جیسے سنگھ اور مالا سیرا رہ کافی مشہور رہیں۔ وٹھل راؤ کی آواز میں درد بھی ہے تاثیر بھی۔ جادو بھی ہے مٹھاس بھی ہے میں نے بعض موسیقی کی محفلوں میں دیکھا ہے کہ وٹھل راؤ صرف اور صرف غزلیں ہی سناتے رہے ہیں حالانکہ وہ ایک بہترین موسیقار بھی ہیں۔ ۵۰ برس سے گا رہے ہیں لیکن ان کی آواز کی لے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وٹھل راؤ نے بیرونی ممالک امریکہ، کینیڈا اور خلیجی ممالک وغیرہ میں کئی کامیاب پروگرام دیئے ہیں۔ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ وٹھل راؤ کو اردو شعر و ادب سے خاص دلبستگی ہے اکثر ادبی جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں۔ میں نے یہ

بھی دیکھا ہے کہ وہ نوجوان گلوکاروں کی حوصلہ افزائی کے لیے اُن کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں اُن کے فن کو سراہتے ہیں۔ بہ قول وٹھل راؤ ان ۵۰ برسوں میں عوامی محفلوں سے لے کر دربار سعظم جاہ شجیع تک ان کے فن کی شہرت ہے وٹھل راؤ نے بعض فلموں میں بھی نغمے پیش کیے ہیں۔ اُن کی گائی ہوئی غزلوں کے کئی کیسٹ نکل چکے ہیں وٹھل راؤ بہت اچھی اُردو بولتے ہیں اُن کے لب و لہجے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اساتذۂ سخن کا کلام اُن کے زیرِ مطالعہ رہتا ہے ممتاز ادیبوں کی کتابیں بھی پڑھتے رہتے ہیں۔ وٹھل راؤ کلاسیکی شعراء کے کلام کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے نامور شاعروں کا کلام بھی ساز پر پیش کرتے ہیں۔ حیدرآباد کے بیشتر شاعروں کا کلام سُنا کر محفلِ موسیقی کو مسحور کر دیتے ہیں۔ حیدرآباد کے شاعروں میں خاص طور پر صفی اورنگ آبادی، مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی، سعظم جاہ شجیع، سعید شہیدی، عزیز قیسی، صلاح الدین نیّر اور رشید انجم کی غزلیں پیش کرتے ہیں وٹھل راؤ اردو غزل کے ذریعہ اردو زبان کی اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔ وٹھل راؤ ملنسار ہونے کے ساتھ ساتھ با اخلاق، سیدھے سادے پُر وقار شخصیت کے مالک بھی ہیں۔ سرکاری محفلیں ہوں کہ غیر سرکاری وہ عزت و احترام کے ساتھ مدعو کیے جاتے ہیں حیدرآباد کی بے شمار محفلوں میں اپنی غزل سرائی کا لوہا منوا چکے ہیں۔ بعض خاص خاص

محفلوں میں بھی اپنے فن کا جادو جگاتے رہتے ہیں وٹھل راؤ سے میرے تقریباً ۳۵ سال سے دوستانہ مراسم ہیں۔ میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کا نام موسیقی کی محفلوں میں گلوکار ممتاز (فائن آرٹس اکیڈیمی) کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ ممتاز اور وٹھل راؤ کی جوڑی حیدرآباد میں کافی مشہور تھی۔ دونوں نے مشترکہ طور پر کچھ فلموں میں بھی گایا ہے وٹھل راؤ خالص حیدرآبادی گنگا جمنی تہذیب کے آئینہ دار ہیں اتنی عمدہ اردو بولتے ہیں کہ ان سے گفتگو کرتے ہوئے فرحت محسوس ہوتی ہے اچھی طرح اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں۔ وٹھل راؤ صاحب کی بعض خاتون شاگرد اردو رسم الخط سے بھی واقف ہیں وٹھل راؤ صاحب نے نامور شاعرہ کویتا کرن کا ایک شاعرہ کی حیثیت سے مجھ سے تعارف کروایا جب وہ ان کے پاس غزلیں سننے کے لیے جایا کرتی تھیں کویتا کرن کے والد ماجد ایڈیشنل سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ریٹائرڈ) امباجی راؤ شاد کو بھی فن موسیقی سے خاص لگاؤ ہے وہ اردو کے ایک اچھے شاعر بھی ہیں جن کا مجموعۂ کلام "آشاکرن" کے نام سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہو چکا ہے۔ کویتا کرن کے چار شعری مجموعے پہچان (۱۹۸۹ء) سوغات (۱۹۹۱ء) نوازش (۱۹۹۴ء) آشنا (۱۹۹۵ء) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ وٹھل راؤ نے کویتا کرن کو مشورہ دیا تھا کہ وہ میری نگرانی میں اپنا شعری سفر جاری رکھیں۔ کویتا کرن مجھ سے مشورۂ سخن کرتی ہیں حیدرآباد میں کئی خاندان ایسے بھی ہیں جن کے پاس اکثر موسیقی کی محفلیں سجتی ہیں۔

ان محفلوں میں وٹھل راؤ کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی بیشتر محفلوں میں میں بھی شریک رہا ہوں۔ خاص طور پر جناب عابد علی خان صاحب اور عظمت عبدالقیوم کے گھر پر منعقدہ محفل شعر و نغمہ میں میں بھی شریک ہوتا رہا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ وٹھل راؤ میری اکثر کتابوں کی رسم اجرا تقریب میں شریک رہے ہیں۔ وٹھل راؤ ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعروں میں لازماً شرکت کرتے ہیں۔ نشستیں کے ایک حصہ میں معززین شہر کے ہمراہ بیٹھے رہتے ہیں۔ وٹھل راؤ سنگیت سادھنا کے ذریعہ اُردو کی خاموش خدمت انجام دے رہے ہیں جو قابل تحسین ہے۔ وہ جس کسی شاعر کی غزل گاتے ہیں تو اشعار کے معنی و مفہوم میں کھو جاتے ہیں۔ صحت لفظی کے ساتھ پُر اثر لحن میں جب وہ غزل سرا ہوتے ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ جب کبھی وہ کسی محفل میں شرکت کرتے ہیں تو اُن کے ساتھ منتخب غزلوں کی کئی بیاضیں رہتی ہیں۔ وٹھل راؤ غزل کی محفلوں میں لازماً شیروانی پہن کر آتے ہیں۔ کالی اونی شیروانی اُن پر خوب جچتی ہے اُن کو دیکھتے اور اُن سے گفتگو کے بعد کوئی شخص انہیں غیر مسلم ماننے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتا۔ وٹھل راؤ کا رہن سہن، ان کا طرز گفتگو حیدرآبادی گنگا جمنی تہذیب و روایات کی بھرپور غمازی کرتا ہے۔ وٹھل راؤ کو اللہ سلامت رکھے۔ ہمارے شہر کی آبرو ہیں۔ جو اپنی شائستہ مزاجی، شگفتہ و شستہ لب و لہجے کی وجہ سے ہر مخاطب کو متاثر

کرتے ہیں)۔

میں وٹھل راؤ کی دل سے قدر کرتا ہوں کہ انہوں نے ان ۵۰ برسوں میں کبھی اپنے کو نہیں بدلا۔ حیدرآبادی روایات کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے احباب کی محفلوں میں سرشار رہا کرتے ہیں۔ خدا نے انہیں شہرت و عزت سے دل کھول کر نوازا ہے۔ وٹھل راؤ کو اُن کی فن کارانہ خدمات کے اعتراف میں کئی ایوارڈ مل چکے ہیں ان کی موسیقی کی محفلیں آج بھی جاری ہیں۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ یوں ہی خوشگوار انداز میں جاری رہے۔ اخبار سیاست نے ان کی فنکارانہ عظمت کو محسوس کرتے ہوئے ہمیشہ تعاون کیا۔ ان کے پروگراموں کی خبریں نمایاں طور پر شائع ہوتی رہیں۔ مختلف اوقات میں بہت ہی جامع انٹرویوز بھی شائع ہوتے رہے۔ وہ مجھ سے نجی ملاقاتوں میں سیاست کی سرپرستی کو ہمیشہ خراج پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صادق نقوی

منفرد دانشور، دلنواز شاعر، باوقار شخصیت

ڈاکٹر صادق نقوی میرے اُن اولین شاعر دوستوں میں سے ایک ہیں جن کی دلنواز شخصیت کے گہرے نقوش آج بھی میرے دل پر اُسی طرح مرتسم ہیں جس طرح پہلی ملاقات کے موقع پر تھے۔ شہر کے مختلف کالجوں اور جامعہ عثمانیہ کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں کا وہ پُر اثر ماحول کون ایسا شخص ہے جو لوٹا سکے گا

صادق، نظام کالج کے اُن پرکشش، سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کروانے والے ایک ایسے ہونہار طالب علم کی طرح مقبول ترین شخصیت بن گئے تھے جن سے دوستی کے نظام کالج کا کیا ذکر، شہر کے دیگر کالجس کے طلباء بھی متمنی رہتے تھے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ صادق کے اطراف ذہین و باشعور طلباء و طالبات کا ایک مخصوص حلقہ علمی و ادبی سرگرمیوں، خوش گپیوں اور خاص طور پر تعلیمی و تہذیبی مباحثوں

میں سرگرم عمل رہنے کے لیے ۔۔۔ دکھائی دیتا تھا۔

جس وقت صادق سے میری پہلی ملاقات ہوئی اُس وقت وہ نظام کالج سے گریجویشن کی تکمیل کر رہے تھے۔ صادق سے میری ایک یادگار ملاقات نظام کالج کے سالانہ جلسے کے موقع پر ہوئی تھی۔ اُن دنوں میں آرٹس کالج میں بی۔ او۔ ایل کا طالب علم تھا۔ یہ بات ۱۹۵۹ء کی ہے اُس زمانے میں شہر کے کالجوں کے علاوہ جامعہ عثمانیہ میں طلباء کی علمی و ادبی و تہذیبی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور ہر سال ہونے والے اردو فیسٹولوں کی وجہ سے مختلف کالجوں کے سرگرم عمل طلباء و طالبات آپس میں اپنی دوستی کے رشتے کو استوار کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ صادق نقوی سے پہلی ملاقات کا اثر میرے دل پر ایک خوشگوار موسم کی طرح ہے صادق نقوی اُن دنوں نہایت پُرکشش اور جاذبِ نظر شخصیت کے حامل تھے۔ اپنے کالج کے ایک ہونہار طالب علم ہونے کی وجہ سے اُن کے چاہنے والوں میں بعض ایسے طلباء و طالبات بھی تھے جن میں سے اکثر و بیشتر بیرونِ ملک (امریکہ، کینیڈا، لندن اور خلیجی ممالک) وغیرہ میں اعلیٰ خدمات پر فائز ہیں۔ اگرچہ کہ صادق نقوی سے میری دوستی کا تعلق نظام کالج کے سالانہ جلسے سے ہوا لیکن اس رشتۂ دوستی کو شہر کے مشاعروں نے اور مضبوط کر دیا۔

نظام کالج بھی اُن دنوں اُردو شعر و ادب کی سرگرمیوں کے لئے ایک مرکز کی حیثیت کا حامل تھا۔

صادق نقوی ایک ذہین طالب علم کی حیثیت سے بھی ہمیشہ اساتذہ کی نظر میں رہے ۔۔۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ کے ایک قابل ترین استاد کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے

صادق ایک باصلاحیت شاعر بھی ہیں۔ ایک معتبر اور سنجیدہ نقاد بھی ہیں۔ بہترین مقرر تو ہیں ہی لیکن پُر وقار دانشور بھی ہیں جو ادب و تاریخ کے موضوع پر کھل کر گفتگو کرسکتے ہیں۔

صادق نقوی بھی میرے اُن بہترین دوستوں میں سے ایک اعلیٰ مرتبت دوست ہیں جن کی دوستی پر میں فخر محسوس کرتا ہوں۔

(اقتباس از بکھری پرچھائیاں ۱۹۹۲ء)

بکھری پرچھائیاں میں تفصیلی مضمون شامل ہے۔

ڈاکٹر مصطفےٰ کمال

معاشرہ کا نبض رَو مسافر ۔ نامور صحافی ۔ ادیب و نقاد

بعض شخصیتوں میں وضعداری اس حد تک جذب ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے قریب ترین دوستوں کو بھی پوری طرح بے تکلف ہونے نہیں دیتی۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ یہ بات ڈاکٹر مصطفےٰ کمال پر صادق آتی ہے۔ ایسی پُر وفا شخصیتیں دوستی کے کسی مرحلے پر بھی قربت و فاصلہ کے امتیاز سے بے نیاز رہتی ہی تو نہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ دوست وضعداری کے مفہوم کو تسکینِ ذات کی حد تک محدود رکھتے ہوں لیکن یہ بات واضح ہے کہ طرزِ حیات میں رکھ رکھاؤ، رواداری اور سنجیدگی میں ٹھہراؤ، تعلقات کی بہتری و استواری میں نمایاں حصہ ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کے معاملے میں ہر وہ شخص جو بہترین دوست ہونے کا دعویدار ہو شاید ہی اس خطِ فاصل کو عبور کر گیا ہو۔ میں ڈاکٹر مصطفےٰ کمال کو اپنا بہترین قریبی دوست سمجھتا ہوں لیکن ان کی وضعداری نے مجھے بھی آج تک پوری طرح بے تکلف ہونے نہیں دیا۔ یہ بات الگ ہے کہ جب کبھی ہم کچھ دوستوں کی کرم نوازیوں سے آنکھیں چرا کر حیاتِ گذشتہ کے کچھ اوراق الٹتے ہیں تو اُن اوراق پر ہمیں کچھ ایسے

نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں جو دھندلے ہونے ہوئے بھی اپنی چمک برقرار رکھے ہوئے ہیں لیکن یہ کہ حالات کی گرم ہواؤں نے ہمیں جھلسانے کی کوشش کی ہو لیکن ہمارے تعلقات کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ ہوسکی ۔ چونکہ ہم نے ٹھنڈی چھاؤں ہی ہلکی روشنی اور تازہ تازہ خوشبوؤں کے درمیان اپنی دوستی کی بنیاد رکھی تھی ڈاکٹر مصطفےٰ کمال سے کب کس وقت اور کن حالات میں دوستی ہوئی کچھ اچھی طرح یاد نہیں ہے لیکن مصطفےٰ کمال کو یاد ہے کہ پروفیسر عبدالقادر سروری کے دولت کدہ حمایت نگر پر ۴۰ سال قبل جو ادبی و شعری محفلیں ہوتی تھیں ان میں بھی ان میں شریک ہوا کرتا تھا مصطفےٰ کمال کلاسیکی اقدار کے ترجمان ہی نہیں ۔ ترقی پسند روشن خیال اور عصری آگہی سے باخبر، بار باش اصحاب بھی ہیں ۔ جس کسی کو بھی مصطفےٰ کمال کے کردار کی بلندی کا جائزہ مقصود ہو تو اُس کے لئے ضروری ہوگا کہ پہلے وہ اُن کی اصول پسندی شرافت، دیانتداری، بے لوث اور بے غرض روابط کا جائزہ لے ۔ مصطفےٰ کمال بنیادی طور پر نیک نفس اور شریف انسان ہیں ان سے مراسم و دوستی کے نازک فرق سے گذرتے ہوئے بھی قریبی احباب یہ چاہیں گے کہ مصطفےٰ کمال ہر نفس ایک کامیاب انسان کی طرح زندگی کے ہر مرحلہ کو خوش خرامی کے ساتھ طے کرتے رہیں ۔ ڈاکٹر مصطفےٰ کمال صدر شعبۂ اردو انوارالعلوم کالج کی حیثیت سے پُروقار اور با اعتماد فضا میں اپنا فرض منصبی انجام دے چکے ہیں ۔ ان کی زندگی کا اپنا ایک نصب العین ایک نظریہ ہے وہ اپنے لیے راستہ خود بناتے ہیں کسی کے نقش قدم پر چلنا یا کسی کے نقش قدم کو مٹاتے ہوئے گذرنا انہیں پسند نہیں وہ اپنے راستے میں کسی کو حائل ہونے نہیں دیتے بلکہ اتنے فراخ دل ہیں کہ وہ اپنے ساتھ ساتھ چلنے والے کا راستہ نہیں روکتے ۔ جب کبھی میں ذہنی تھکن محسوس کرتا ہوں تو شگوفہ کے دفتر پر بے ارادہ پہونچ جاتا ہوں ۔ (طویل مضمون کا اقتباس "پھر وہی پرچھائیاں" ۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر طیب انصاری

سیماب صفت ادیب و نقاد فعال شخصیت

زندگی کے سفر میں یوں تو بہت سے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی ملاقات دوستی میں بدل جاتی ہے ویسے بھی دوستوں کی فہرست میں کچھ ہی نام ایسے ہوتے ہیں جو زیادہ عرصہ تک یاد رکھے جانے کے قابل ہوتے ہیں۔ مجھے جتنے بھی اچھے دوست ملے وہ اپنی پوری شناخت کے ساتھ ملے جو میرے لیے ایک اعزاز ہے۔ طیب انصاری میرے اُن ہی دوستوں میں سے ایک ہیں جن کے مزاج کی بے ساختگی، خوش گفتاری، تیز روی نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے۔ میں نے اپنے دوستوں کا جائزہ لیتے ہوئے کبھی یہ نہیں سوچا کہ معاشرہ کی ہر کھے پر کون کس مقام پر ٹھہرا ہوا ہے میں نے صرف یہ دیکھا ہے کہ اس مخصوص شخص کا مجھ سے کس طرح کا سلوک ہے یوں بھی میں نے ہر دوست کو اس کے مخصوص رویوں اور اس کے مزاج کی روشنی کے ساتھ قبول کیا ہے۔
طیب انصاری جہاں ایک اچھے نثر نگار ہیں وہیں وہ ایک اچھے نقاد، محقق، مبصر و مفکر ہیں ادب کے ہر موضوع پر ماہرانہ اظہارِ خیال کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

کثرتِ مطالعہ نے انہیں ایک مستند ادیب کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اہم مقام عطا کیا ہے ان کی پہلی تصنیف تحریر و تنقید نے سارے ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی تھی۔ ادبی حلقوں میں ان کی شناخت کے لیے یہ پہلی کتاب سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ طیب انصاری چونکہ خانقاہی نظام کے پروردہ ہیں اس لیے بزرگوں کی عزت و احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں۔ مزاج میں اگرچہ بذلہ سنجی و ظرافت ہے گفتگو میں طنز کے نشتر بھی ملتے ہیں لیکن سنجیدگی کا دامن کبھی ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتا۔ حیدرآباد کی تقریباً ہر انجمن کے سربراہوں سے اُن کی اچھی خاصی جان پہچان ہے۔ طیب انصاری نے اپنی ذاتی محنت اور لگن سے دیارِ شعر و ادب میں اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا ہے۔

مجھے اپنی زندگی میں زیادہ تر پُرخلوص دوست ہی ملے۔ جن سے روابط میرے لئے اطمینانِ قلب کا باعث ہیں۔ جب بھی کوئی شخص میرے دوستوں کی فہرست پر نظر ڈالے گا تو اسے بہ یک نگاہ طیب انصاری کا نام بھی نمایاں نظر آئے گا۔ ﴿ (طویل مضمون سے اقتباس (پھر وہی پرچھائیاں ۱۹۹۳ء

پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ

(اورینٹل اُردو کالج سے جامعہ عثمانیہ تک علمی و ادبی سفر)

اورینٹل اُردو کالج، جامعہ عثمانیہ اور ادارۂ ادبیات اُردو کے علمی و ادبی ماحول میں تربیت یافتہ اُردو کے استاد پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ کا علمی و ادبی سفر کئی برسوں سے خوشگوار انداز میں جاری ہے۔ جن کی ذہنی تربیت اُردو کے مستند اساتذہ کی رہین منت رہی ہے۔ پروفیسر اکبر علی بیگ میرے استاد بھائی بھی ہیں۔ پروفیسر اکبر علی بیگ کی تعلیمی تربیت کا آغاز اورینٹل اُردو کالج سے ہوتے ہوئے جامعہ عثمانیہ پر ختم ہوتا ہے اورینٹل اُردو کالج میں وہ مجھ سے جونیر تھے۔ جہاں سے انھوں نے بی۔او۔ایل کا امتحان کامیاب کرنے کے بعد جامعہ عثمانیہ سے اُردو میں ایم اے کیا۔ پھر جامعہ عثمانیہ سے ہی مرزا علی لطف شخصیت، حیات اور کارنامے کے زیرعنوان پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھا اور پھر ڈاکٹر بن گئے۔ ابتدا میں کچھ عرصہ کے لیے سٹی کالج میں کام کیے پھر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ میں لکچرر

ریڈر اور پروفیسر ہوئے۔ جامعہ عثمانیہ کے پوسٹ گریجویٹ سنٹر سکندرآباد پر صدر شعبۂ اُردو کی خدمت انجام دی۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ اپنے شاگردوں کے علاوہ علمی و ادبی حلقوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اکبر علی بیگ پروفیسر ابوظفر عبدالواحد ڈاکٹر زینت ساجدہ، پروفیسر غلام عمر خان، پروفیسر مغنی تبسم کے خاص شاگردوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم نے انہیں ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے اُردو امتحانات اُردو دانی، زبان دانی، اُردو عالم اور اُردو فاضل کے امتحانات کا انچارج مقرر کیا۔ وہ تقریباً ۱۲، ۱ برس سے شعبۂ امتحانات ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے معتمد کی حیثیت سے بہ حسن و خوبی اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پروفیسر اکبر علی بیگ شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ کے صدر بھی تھے پھر ان کا تبادلہ پوسٹ گریجویٹ کالج جامعہ عثمانیہ (سکندرآباد) میں ہوا۔ اور وہیں سے وظیفۂ حسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ اکبر علی بیگ صاحب اپنے شفیق استاد پروفیسر مغنی تبسم کا بے حد احترام کرتے ہیں ان کی زیرِ نگرانی و زیرِ سرپرستی اُردو کی ترقی و ترویج کے کاموں میں ایک زیادہ وقت دے رہے ہیں اکبر صاحب کی طرزِ تحریر و تقریر میں مزاح کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ اظہارِ خیال کا انداز بہ اثر ہوتا ہے۔ بہت کم شاگرد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اساتذہ سے والہانہ وابستگی رکھتے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ ڈاکٹر غلام عمر خان اور ڈاکٹر مغنی تبسم کے وہ خاص الخاص شاگردوں

میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ، ایک خوددار اور باوقار شخصیت
کے مالک ہیں یونیورسٹی کے بعض اساتذہ سے ان کا ذہنی رشتہ برقرار
ہے۔ ہم عصر اساتذہ میں پروفیسر محمد علی اثر کو زیادہ پسند کرتے ہیں
جامعات کے بعض اساتذہ سے ان کے روابط کوئی خاص نہیں ہیں
رسمی مراسم کے ساتھ ان کے ساتھ رہا کرتے ہیں۔ پروفیسر اکبر علی بیگ
عام طور پر علمی و ادبی، مذہبی تقاریب کے انعقاد میں زیادہ سرگرم
عمل رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی وابستگی کی بناء پر سرورِ کائنات
کمیٹی دارالشفاء کی جانب سے ہونے والے سالانہ جشن رحمت اللعالمین
میں بہ حیثیت شاعر مجھے اور رئیس اختر کو مدعو کرتے ہوئے خوشی
محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے بچوں کی بہترین ماحول میں
تعلیم دلوائی۔ انہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا۔ ان کا بیٹا مرزا
غضنفر علی بیگ علی بیگ نے امریکہ سے ایم ایس کامیاب کیا وہ گذشتہ دس برس سے
امریکہ (الاباما) میں رہتا ہے ان کی بیٹی فردوس فاطمہ ڈاکٹر ہے
پروفیسر اکبر علی بیگ تفریح طبع کے طور پر کبھی کبھار شعر کہتے ہیں مشاعروں
میں شرکت نہیں کرتے البتہ بعض دفعہ ادارہ ادبیات اردو کے
زیر اہتمام منعقدہ محفل شعر اور بعض مخصوص محفلوں میں اپنا کلام سناتے
ہیں۔ ادارہ ادبیات اردو کے مختلف موضوعات پر منعقدہ بعض
سیمینار، سمپوزیم وغیرہ میں حصہ لیتے ہیں۔ شہر اور بیرون شہر کے
کئی مقامات پر انہوں نے ادبی جلسوں اور علمی و ادبی محفلوں میں حصہ

لیا ہے۔ پروفیسر صاحب کی نثر میں تا حال چار کتابیں شائع ہوئی جن میں سے کچھ نام یہ ہیں خوش تقسان، نقیر شنا سی، عزیز مرزا شخصیت حیات اور کارنامے، دیوانِ حفیظ دہلوی (مدونہ) دیوانِ اعلیٰ لطف (مدونہ) پروفیسر صاحب کے ادبی و علمی مضامین اخبارات سیاست کے علاوہ ماہنامہ سب رس، خوشبو کا سفر اور ملک کے کچھ اور ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں معاشی طور پر نہایت مطمئن ہیں۔ ان کے گھر کا ماحول علمی، ادبی و تہذیبی اقدار کا پوری طرح پاسداری کرتا ہے۔ ان کے افرادِ خاندان اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں پروفیسر صاحب کی زیر نگرانی تا حال پندرہ طلبار نے ایم فل کیا ہے پچھ طلبار نے پی ایچ ڈی کی ــ پروفیسر اکبر علی بیگ کی زیر نگرانی جامعہ عثمانیہ کے ایک ہونہار طالب علم سعید الوہاب عنوری افغانی "صلاح الدین نیر حیات اور کارنامے" کے زیر عنوان پی ایچ ڈی کر رہے ہے لیے مقالہ لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر اکبر علی بیگ نہایت مخلص اصول پسند اور شریف النفس انسان ہیں۔ ان کا زیادہ تر وقت علمی و ادبی مصروفیات میں گذر رہا ہے اپنے دوستوں سے نہایت خلوص سے ملتے ہیں۔

نیز اردو فارسی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ

ذوقی کے قابل انسان ہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے اس بات کے لیے کوشاں رہے کہ طلبا میں علمی و ادبی ذوق پروان چڑھتا رہے۔ پروفیسر مغنی تبسم کے علمی و ادبی کاموں میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ شہر کے اہم ادبی جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ بہترین مقرر ہیں۔ بلا جھجک روانی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

پروفیسر اکبر علی بیگ۔ ادارۂ میرا شہر میرے لوگ کے ادبی جلسوں میں شرکت کرتے رہے ہیں۔ ان کی اہلیہ محترمہ کنیز سکینہ کا بھی تعلق شعبۂ درس و تدریس سے ہے۔ جامعات کے کئی طلباء و طالبات کی ڈاکٹر صاحب نے سرپرستی کی ہے ڈاکٹر صاحب سے میری ملاقات بہت ہی کم ہوتی ہے لیکن رشتۂ دوستی کی برقراری کے لیے ہم دونوں کی مختلف امور کے سلسلے میں فون پر بات ہوتی ہے۔ جامعہ عثمانیہ میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے مثبت سرگرمیوں کو پروان چڑھانے میں دلچسپی لیتے رہے۔ جس طرح کا ماحول رہا اس طرح وہ اپنے آپ کو ڈھالتے رہے ہیں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ ڈاکٹر اکبر علی بیگ، عام طور پر علمی ادبی جلسوں سے کم کم ہی دلچسپی رکھتے ہیں سوسائٹی سے وابستگی اور ان کے طرزِ حیات کا ایک خاص انداز ہے۔ ڈاکٹر صاحب جو بھی علمی و ادبی کام اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں نہایت احساسِ ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے شعبۂ اردو ادارۂ ادبیاتِ اردو کے امتحانات کی روشن مثال ہے۔ سینکڑوں طلبا ادارۂ ادبیاتِ اردو کے امتحانات میں حصہ لیتے ہیں۔ وہ کامیاب، فعال، کارکرد معتمد امتحانات ادارۂ ادبیات اردو کی حیثیت سے یاد کیے جاتے ہیں یوم محمد قلی قطب شاہ تقاریب کے سلسلے میں پروفیسر مغنی تبسم (معتمد ادارۂ ادبیاتِ اردو) کے بہترین معاون کی حیثیت سے رہتے ہیں ادارۂ ادبیاتِ اردو کی بعض دیگر کمیٹیوں سے بھی ان کا تعلق ہے۔

اکبر علی بیگ کی یہ خواہش رہتی ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو اپنی بہترین روایات کا علمبردار رہے وہ تسلیم کرتے ہیں کہ پروفیسر مغنی تبسم کی زیر نگرانی ادارہ کی سرگرمیاں عروج پر ہیں۔ ڈاکٹر اکبر علی بیگ ایک ایکسپرٹ کی حیثیت سے ملک کی کئی جامعات کی خدمات انجام دے چکے ہیں۔

اکبر علی بیگ اپنے دوستوں سے کھل کر گفتگو کرتے ہیں چاہے گفتگو کا موضوع علمی و ادبی ہو کہ معاشرہ کے کسی خاص پہلو سے تعلق رکھتا ہو۔ دو ٹوک انداز میں بلا کسی ذہنی تحفظات کے اظہار خیال کا ان کا ایک صالح طرزِ عمل ہے ان کی گفتگو دلچسپ ہوتی ہے دورانِ گفتگو لطائف سنا کر بھی محفل کو مزید خوشگوار بنا تے ہیں۔ یہ ظاہر سخت گیر دکھائی دیتے ہیں لیکن ایسے ہیں نہیں۔ معقول اور معتبر انسان ہیں۔ ان کے لب و لہجہ میں بے ساختگی رہتی ہے جہاں کہیں بھی فرزندانِ جامعہ عثمانیہ کا ذکر آتا رہے گا وہاں ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں کا بھی تذکرہ ہوگا۔ جامعہ عثمانیہ کے بہترین اساتذہ میں ڈاکٹر اکبر علی بیگ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کی علمی و ادبی خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔

ناصر کرنولی

خوش نظر، خوش گفتار اور بے نیاز شاعر

یوں تو ہر انسان کو اپنی زندگی میں بے شمار لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے، ان گنت لوگوں سے پہچان ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں پھیلے ہوئے انسان زندگی کے مختلف تقاضوں کے رشتوں میں بندھے ہوتے ہیں لیکن ان میں سے کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے خود بہ خود رسم و راہ بڑھانے کو جی چاہتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایسے کچھ لوگوں سے تو پہلی نظر ہی میں اچھے لگتے ہیں اُن سے دوستی کی جائے۔ ناصر کرنولی میرے ایسے ہی دوستوں میں سے ایک ہیں جنھیں پہلی بار دیکھنے کے بعد دوستی کے لیے راہ ہموار ہوتی چلی گئی۔ ناصر کرنولی سے میری پہلی ملاقات زائد از ۱۹ برس پہلے کرنول میں منعقدہ ایک کل ہند مشاعرہ میں ہوئی تھی۔ اس مشاعرہ کا اہتمام کرنول کی ایک ذی اثر مشہور شخصیت نواب طلعت اللہ خان نے کیا تھا۔ نواب صاحب خود شاعر تھے

انتہائی وضع دار اور شائستہ طبیعت کے مالک تھے اُس مشاعرہ میں شکیل بدایونی، مہا نعمانی، حسرت جے پوری کے علاوہ حیدرآباد سے محترمہ عظمت عبدالقیوم، بانو طاہرہ سعید، خیرات ندیم، صلاح الدین نیر نے بھی شرکت کی تھی۔ اُس زمانے میں کرنول میں عظیم الشان پیمانے پر کُل ہند مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ناصر کرنولی سے میری دوسری ملاقات حیدرآباد کے ایک قدیم محلے ملک پیٹ میں منعقدہ ایک مشاعرہ میں ہوئی۔ اس مشاعرہ میں اُس دور کے اہم شاعروں کے ساتھ ساتھ ناصر کرنولی اور میں نے بھی کلام سنایا تھا ناصر کرنولی اُن دنوں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کر رہے تھے۔ کالجوں کے مشاعروں میں بھی ناصر کرنولی بے حد پسند کئے جاتے تھے۔ ناصر ایک بہترین دوست، بہترین شاعر و نقاد کی حیثیت سے بھی ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں ایک سنجیدہ مزاج، شگفتہ طبیعت اور پُر خلوص انسان ہیں۔ احساس ذمہ داری، وابستگی، وارفتگی اُن کی عمدہ خصوصیات میں شمار کی جاتی ہے۔ ناصر کرنولی دیوکور دھن کالج میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ "نفس نفس" کے نام سے ان کا پہلا مجموعہ کلام ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا جسے اردو اکیڈیمیوں نے ایوارڈ سے نوازا۔ ناصر کرنولی بھی میرے اُن ہم خیال بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں جن سے گفتگو کرتے ہوئے میں تازگی محسوس کرتا ہوں اور جن کی دوستی میں احساس پائداری رہتی ہے۔ چاہے وہ موسم خزاں ہو کہ موسم بہار اچھے دوست ہمیشہ میرے ساتھ رہتے ہیں ناصر کرنولی بھی میرے اُن اولین شاعر دوستوں میں سے ایک ہیں جن کی دوستی کی پہلی خوشبو آج بھی میرے جسم و جاں کو مہکا رہی ہے۔ (طویل مضمون سے اقتباس (پھر وہی برمحابیاں ۱۹۹۳ء)

رحمٰن جامی

کھرا انسان ۔ سچا دوست ۔ بہترین شاعر

اگر انسان کو اپنی زندگی کے اولین سفر کے دوران اس بات کا احساس ہو کہ اپنے مد مقابل اپنے ہی قبیلہ کا آدمی ہے تو ایک پُر سکون اطمینان حاصل ہو جاتا ہے۔ رحمٰن جامی کا تعلق بھی ایسے ہی ایک قبیلہ سے ہے جس کے تیور تلوار کی تیز دھار اور جس کی گفتگو پُر خلوص لب و لہجہ کی بے ساختگی اور والہانہ پن کی ضمانت دیتی ہے اور جن لوگوں کی زندگی آئینہ کی طرح شفاف ہوتی ہے۔ اُن کی زندگی کسی عمر کے مرحلہ پر ممکن ہے کہ دھوکہ کھا جائے، لیکن دھوکہ دے نہیں سکتی اس قبیل کے سچے دوست اور سچے آدمی کم یاب ہوتے جا رہے ہیں لیکن رحمٰن جامی کا وجود طمانیت کا باعث ہے۔

رحمٰن جامی سے میری دوستی کی اساس شعر و ادب کے اُن ردِ زرد

سب سے تعلق رکھتی ہے جس میں تخلیق کار اپنی معنوی اولاد کو سب سے بہترین شکل و صورت میں دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔

کچھ شاعر دوست جہاں رحمن جامی کو ایک کہنہ مشق شاعر، ماہر علم عروض، صاحب اسلوب ادیب، باخبر نقاد اور ایک بالغ نظر سمجھتے ہیں وہیں کچھ شاعر دوست ایسے بھی ملیں گے جو رحمن جامی کی انسان دوستی، اصول پسندی اور ادب نوازی کو بھی عزیز رکھتے ہیں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں نے رحمن جامی کو ان کے ہر رنگ میں پسند کیا ہے ہر وہ انسان جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو مجھے اچھا لگتا ہے اور جب کوئی ساتھی میرے اصول کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو میں دوستی کے ہر مرحلہ پر اس کا استقبال کرتا ہوں۔

جامی بنیادی طور پر ایک ایسے شاعر ہیں جو کلاسیکی اقدار کا احترام کرتے ہیں۔ ترقی پسندانہ خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے عصری آگہی کے ترجمان بھی ہیں۔ ان کی شاعری میں جیتی جاگتی، چلتی پھرتی زندگی کی وہ تمام دھڑکنیں ملتی ہیں جو حیات جاوداں کی طرح فرحت افزا ہے موضوعاتی شاعری میں جامی اپنی آپ مثال ہیں مختلف موضوعات پر انہوں نے بے شمار نظمیں کہی ہیں۔ ہر موضوع پر اولین تاثر قبول کرنے والے شاعروں میں جامی کچھ زیادہ ہی رواں دواں ہیں۔ (طویل مضمون سے اقتباس ابھرتی پرچھائیاں ۱۹۹۳ء)

رئیس اختر

(باکمال شاعر، مہذب شہری، معتبر انسان)

کسی سے دوستی کرنا اور نبھانا انسانی رشتوں کا ایک اہم کارنامہ سمجھتا ہوں۔ زندگی کے مختلف مراحل پر مختلف حالات سے انسان گزرتا رہتا ہے۔ دوستی کی راہوں میں کچھ ایسے موڑ بھی آتے ہیں جہاں سے با اعتماد فضا میں سلیقہ سے گزر جانا بھی ایک غیر معمولی بات سمجھی جاتی ہے۔ رئیس اختر کو میں نے روابط کے ہر مرحلہ پر ایک بہترین اور با اعتماد دوست پایا ہے۔

رئیس اختر سے میری پہلی ملاقات ۴۰ برس پہلے سکریٹریٹ آفس کے میرے ایک ساتھی جناب علیم الدین کے توسط سے ہوئی تھی علیم صاحب نے یہ کہتے ہوئے تعارف کروایا تھا کہ رئیس اختر بہت ہی اچھے شاعر ہیں عثمانیہ یونیورسٹی کے ذہین طالب علموں میں اِن کا شمار ہوتا ہے اس تعارف کے بعد رئیس اختر سے کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی

ان دنوں حیدرآباد اور اضلاع میں آئے دن مشاعرے ہوا کرتے تھے ہر ضلع میں کئی ادبی انجمنیں کام کرتی تھیں۔ "دیارِ ادب" کے نام سے ضلع بیدر میں ایک ادبی انجمن تھی جس کے صدر رئیس اختر تھے۔ اس انجمن کے زیرِ انتظام ہر سال لازمی طور پر ایک سالانہ مشاعرہ ہوا کرتا تھا جس میں حیدرآباد کے نامور شعراء مخدوم محی الدین، اوج یعقوبی، کنول پرشاد کنول، سلیمان اریب، خیرات ندیم، شاذ تمکنت، سید شاہد کو بھی مدعو کیا جاتا تھا میں بھی اکثر ان مشاعروں میں مدعو رہتا۔ شاعروں کی وساطت سے ہی ہماری دوستی کا دائرہ وسیع تر ہوتا گیا۔ دورانِ دوستی یہ انکشاف بھی ہوا کہ رئیس اختر میرے ایک رشتہ کی بھابی کے قریبی رشتہ دار ہیں۔

بیدر میں کہنہ مشق اور زود گو شاعر ممتاز عثمانین رشید احمد رشید تھے۔ ابتدائی شاعری کے زمانہ میں رئیس اختر، رشید احمد رشید سے مشورۂ سخن کیا کرتے تھے۔ رئیس اختر کے توسط سے ہی میری رشید صاحب سے ملاقات ہوئی۔ رئیس اختر اپنے استاد کا بے حد احترام کرتے تھے۔ جب ہم دونوں حیدرآباد اور اضلاع کے مشاعروں میں کامیاب شاعر کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے تو رشید صاحب بے حد خوش ہوتے تھے۔

رئیس اختر جب اعلیٰ تعلیم کے لیے حیدرآباد آ گئے تو ان کی ملاقات مشہور شاعر، ادیب و نقاد ظفر عالمگیر سے ہوئی۔ رئیس اختر ظفر عالمگیر سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ ظفر عالمگیر کے پاکستان چلے جانے کے بعد یہ سلسلہ

لوٹ گیا۔ ظفر عالمگیر جب تک حیدرآباد میں رہے ان کے قریبی دوستوں میں رئیس اختر اور حسن چشتی تھے (حسن چشتی ان دنوں شکاگو (امریکہ) میں مقیم ہیں جہاں وہ بزم اردو کے صدر ہیں رئیس اختر کے مشفق دوست ہیں حسن چشتی اس زمانے میں ماہنامہ "آکاش" نکالا کرتے تھے رئیس اختر کا کلام پابندی سے اس رسالہ میں شائع ہوتا تھا۔ ظفر عالمگیر کے بعد رئیس اختر نے جناب شاہد صدیقی سے مشورۂ سخن کیا۔ شاہد صدیقی کے انتقال کے بعد خورشید احمد جامی ان کے شعری سفر کے رہبر رہے۔

رئیس اختر میری دوستی کے ابتدائی زمانہ میں مشاعروں میں کم کم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ میں اس بات کے لئے کوشاں رہتا کہ رئیس ہر مشاعرے میں میرے ساتھ رہیں بعد میں رئیس اختر اور میں اکثر مشاعروں میں ایک ساتھ شرکت کرتے رہے۔ رئیس اختر جہاں ایک بلند پایہ شاعر ہیں وہیں ایک مخلص انسان دوست بھی ہیں رئیس اختر کی وضعداری قابل رشک ہے۔ ان کی نرم گفتاری، سبک خرامی، مزاج کی شائستگی، انداز گفتگو، طرز تکلم اور خاص طور پر ان کی صاف گوئی ہر ملاقاتی کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ تخلص کا اثر رئیس کی شاعرانہ حیثیت بھی گہرا دکھائی دیتا ہے۔ رئیسانہ شعر تو کہتے ہی ہیں آداب محفل کی پاسداری میں بھی رئیس اختر اپنی مثال آپ ہیں۔ رئیس اختر کسی بھی دوست کے لئے کسی وقت بھی کوئی مسئلہ نہیں بنتے رہے۔ مرنجاں مرنج طبیعت نے بھی ان کو اپنے دوستوں میں امتیازی حیثیت سے نوازا ہے۔ یار باش آدمی

ہیں۔ کھلا ذہن اور کشادہ دل رکھتے ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ ہو رئیس اختر نے تحفظِ ذہنی سے کام نہیں لیا۔ وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں کھل کر کہہ جاتے ہیں۔

رئیس اختر سے میری دوستی مثالی ہے ہم ایک دوسرے کی پہچان بن گئے ہیں۔ دوستی کی اس طویل عمر میں ہم میں کسی بھی مرحلہ پر ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔ بے لوث اور بے غرض دوستوں کی طرح ہم دوستانہ روابط کو مزید مستحکم کیے جا رہے ہیں جب کوئی تازہ غزل یا نظم ہوتی ہے تو ہم ایک دوسرے کو سنا لیتے ہیں اس کے بعد مشاعروں میں خود اعتمادی کے ساتھ سناتے ہیں رئیس اختر ایک باکمال شاعر ہیں اُن کی غزلیں اور نظمیں دلوں کو چھو لیتی ہیں۔ ان کے پڑھنے کا انداز منفرد ہے۔ اپنے مخصوص ترنم سے سرشار ہو کر شاعرانہ کیفیت میں ڈوب کر کلام سناتے ہیں دھیمے دھیمے لہجے میں۔ اُن کا ترنم سامع کو بے حد متاثر کرتا ہے۔ رئیس اختر تقریباً ہر صنف شاعری میں شعر کہتے ہیں لیکن غزل ان کا خاص میدان ہے ان کے مجموعۂ کلام آئینۂ دل کو ہندوستان کی مختلف اردو اکیڈیمیوں نے ایوارڈ سے نوازا ہے مختلف ادبی انجمنوں نے ۔۔۔ اُن کی ادبی خدمات پر اعترافات عطا کیے ہیں جن کی فہرست طویل ہے "اشکوں کے پھول" کے نام سے بھی ایک مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے۔

مشاعروں میں رئیس اختر ایک کامیاب شاعر کی حیثیت سے

مہارت رکھتے ہیں۔ ان میں انتظامی صلاحیت بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ مشاعرے ہوں کہ ادبی اجلاس و تہذیبی پروگرام نہایت عمدگی، شگفتگی اور باوقار انداز سے اپنی ذمہ داری کو نبھاتے ہیں رئیس بہترین مقرر بھی ہیں۔ نپے تلے جملوں سے سامعین کو متاثر کرتے ہیں۔

شہر کی تقریباً ہر اعلیٰ مرتبت شخصیت سے رئیس اختر کے خوشگوار روابط ہیں۔ رئیس کی خوش کلامی کے ساتھ ساتھ خوش لباسی نے بھی ان کی شخصیت کو پُراثر بنا دیا ہے۔ رئیس اختر میرے اُن خوش حال دوستوں میں سے ایک ہیں جن کا ہاتھ ہمیشہ کشادہ رہا۔ شائد یہ ان کے نام کی تاثیر ہے۔ خدا نے رئیس کو ایک اطمینان بخش زندگی عطا کی ہے ماشاء اللہ شریک حیات اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے۔ بی ایڈ اور ایم فل کی ڈگری حاصل کر چکی ہیں تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ رہیں رئیس اختر کے لڑکے نہ صرف تربیت یافتہ ہیں بلکہ زیور تعلیم سے بھی آراستہ ہیں آج کل ان کے لڑکے اکسپورٹ بزنس اور فائبر گلاس انڈسٹری میں مصروف ہیں۔ ان کی ایک ہی صاحبزادی ہیں جنھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ ایم اے کیا۔ حکومت آندھرا پردیش کا A.P.S.L.E.T امتحان کامیاب کر چکی ہیں۔ اِن دنوں ممتاز شاعر امیر احمد خسرو کی شاعری پر ایم فل کے لیے مقالہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ رئیس اختر مینیجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے اپنے بیٹوں کے کاروبار کی نگرانی کیا کرتے ہیں۔ مجھے

رئیس اختر کی دوستی پر اس لیے بھی فخر حاصل ہے کہ میں نے رئیس اختر کو اپنے خاص دوستوں کی فہرست میں صحیح مقام پر پایا ہے صف اول میں پایا ہے

رئیس اختر کے پاس اس وقت ۲۰، ۲۵ مجموعوں کا مواد موجود ہے مجھے اُس دن بے حد خوشی ہوگی جب رئیس اختر کے کچھ اور مجموعے شائع ہو جائیں گے ہاوزنگ بورڈ میں انسپکٹر کے عہدہ پر فائز رہے دوران ملازمت رئیس اختر نے بے شمار احباب کی مدد کی ہے۔ کئی شاعروں اور ادیبوں کے مسائل اپنی شخصی دلچسپی سے حل کروا دیئے

بعض شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ ان کا بے لوث تعاون ناقابلِ فراموش ہے۔

رئیس اختر بھی حیدرآباد کے اُن مقبول شاعروں میں سے ایک ہیں جنہیں خدا نے اپنی خاص مہربانی سے ایک باوقار مقام عطا کیا ہے۔ رئیس اختر کئی کل ہند مشاعروں سے پڑھنے کے علاوہ جدہ (سعودی عرب) کے مشاعروں میں بھی شرکت کر چکے ہیں (جہاں اُن کا کلام بیحد پسند کیا گیا) حیدرآباد کی ایک جواں سال ادب نواز شخصیت عارف قریشی نے ۳۰ ڈسمبر ۱۹۹۲ء کو جدہ میں اعلیٰ پیمانہ پر مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس میں حیدرآباد سے امیر احمد خسروؔ، رئیس اختر، اور میں (صلاح الدین نیر) نے شرکت کی تھی۔ رئیس اختر کا ساتھ دورانِ سفر اور دورانِ قیام جدہ نہایت خوشگوار رہا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی رہے۔ حُسنِ اتفاق سے جاتے وقت اور آتے وقت بھی حیدرآباد

سے بمبئی، بمبئی سے جدہ، اس طرح جدہ سے دوحہ قطر اور دوحہ قطر سے بمبئی اور بمبئی سے حیدرآباد، ہم پلین ہی ساتھ بیٹھے رہے جس کی وجہ سے ہزاروں میل کا سفر خوشگوار رہا۔ ہم نے طواف خانۂ کعبہ اور تین مرتبہ عمرہ کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کے بعد بارگاہ سرور کائنات پر حاضری دی۔ رئیس اختر یادیدۂ نم وارفتگی کے عالم میں خانۂ کعبہ کا طواف کرتے رہے اور میری طرح انہوں نے بھی ہر طواف کے دوران حجر اسود کا بوسہ لیا۔ وقت مقررہ کے باوجود رئیس اختر کعبۃ اللہ شریف کے احاطہ سے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ یہی حال میں نے مدینہ میں بارگاہ رسالت مآب صلعم میں دیکھا کہ رئیس اختر پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی تھی اور وہ اشکبار تھے ۱۹۹۷ء میں بزم جدہ کے مشاعرہ میں بھی ہم دونوں مدعو تھے ہم نے وطن لوٹتے وقت ۳ مرتبہ عمرہ کیا اور دربار رسالتؐ میں حاضری دی۔ میں اپنی دوستی کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ رئیس اختر کو چاہنے والے بہت لوگ ہیں۔ رئیس اختر کی شاعرانہ فضیلت کا آج کھل کر اعتراف کیا جا رہا ہے۔ شعری ادب میں رئیس اختر کا نام بھی حیدرآباد کے شاعروں کی اولین فہرست میں شامل رہے گا رئیس اختر کے شاعر دوستوں کی طویل فہرست میں مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ نام کچھ زیادہ ہی نمایاں ہیں صلاح الدین نیر، ناصر کرنولی، راشد آزر، ڈاکٹر صادق نقوی، ہاشم حسن سعید، رحمٰن جامی، مومن خان شوق

نہپال سنگھ ورما، شفیع اقبال، اثر غوری، قاضی انجم عارفی، بشیر احمد، افتخار اقبال ڈاکٹر راہی، نانک سنگھ نشتر، علی الدین نوید، باسط تقوی، ثنا غل ادیب طاہر گلشن آبادی، یوسف یکتا، رشید جلیلی وغیرہ۔ سینیئر شعرائے کرام میں علی احمد جلیلی، خواجہ شوق، کنول پرشاد کنول اور دیگر بزرگ شاعروں کا احترام کرتے ہیں۔ جناب ایم باگا ریڈی سابق ایم پی و سابق منسٹر حکومت آندھرا پردیش ان کے اسکول کے ساتھی ہیں۔ جناب وہاب عندلیب صدر کرناٹک اردو اکیڈمی اور جناب ابوالفیض سحر عزیز ترین دوستوں میں شامل ہیں۔ جناب راجہ جیند ر ریڈی سابق وزیر بھاری صنوعات اور جناب سی جگنا تھ راؤ سابق ڈپٹی چیف منسٹر حکومت آندھرا پردیش اور پروفیسر علی باقر (دہلی) —— جامعہ عثمانیہ میں ہم جماعت رہے۔ پروفیسر ڈاکٹر افضل محمد سابق وائس چانسلر ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی رئیس اختر کے قریب ترین دوستوں میں شامل ہیں۔ رئیس اختر کو بھی کئی برسوں سے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کے علاوہ دوردرشن کے "انجمن" پروگرام اور نٹ ورک کل ہند سطح کے مشاعروں میں اپنا کلام سناتے رہتے ہیں مشہور گلوکار ان کی غزلیں ساز پر پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان کی مشہور میوزیکل کمپنی (ایچ ایم وی) نے جگجیت سنگھ کی میوزک اور چترا سنگھ کی آواز میں ان کی غزل کو یل پی ریکارڈ میں پیش کیا ہے۔ رئیس اختر آج بھی "دیارِ ادب" کے صدر ہیں۔ اس انجمن کے تحت

حیدرآباد میں کبھی کبھی ادبی پروگرام منعقد ہوا کرتے ہیں۔ اس کے
علاوہ رئیس اختر حیدرآباد کی مختلف ادبی، تہذیبی اور مذہبی
انجمنوں سے وابستہ ہیں۔ میرا شہر میرے لوگ اور خورشید احمد جامی
میموریل اکیڈیمی کے جنرل سکریٹری اور ایوان پرنس معظم جاہ شجیع کے
معتمد ہیں۔ کل ہند اُردو تعلیمی کمیٹی سے بھی ۲۵ برس سے وابستہ ہیں
ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعرے شروع
سے ہی پڑھ رہے ہیں۔ رئیس اختر کے فن اور شخصیت پر سنٹرل یونیورسٹی
حیدرآباد کی ایک طالبہ اسریٰ طیبہ نے ایم فل کی ڈگری حاصل کی
ہے۔ رئیس اختر ماہنامہ خوشبو کا سفر کی مجلس مشاورت میں شامل ہیں
ان کا کلام روزنامہ سیاست میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ خوشبو کا سفر
میں ان کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے رئیس اختر بہترین ناظم ادبی
اجلاس و مشاعرہ کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ جناب عابد علی
خان اور جناب محبوب حسین جگر سے انہیں والہانہ عقیدت رہی
۱۹۹۸ میں "روحِ دل" کے نام سے ان کی نعتوں کا مجموعۂ کلام
بہ تعاون اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش شائع ہوا۔

رئیس اختر کو تمام علمی و ادبی حلقے ایک باکمال غزل گو شاعر کی
حیثیت سے ہی نہیں، بہترین نعت کہنے والے شاعر کی حیثیت سے بھی
پسند کرتے ہیں۔ رئیس اختر عشق رسول میں ڈوبی ہوئی نعتیں
کہتے ہیں ادبی شاعری کی طرح مذہبی شاعری میں بھی ان کی الگ پہچان

رہے نہایت خشوع و خضوع سے نعتیہ شعر کہتے ہیں نعتیہ محفلوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ فیضانِ رسول کی کہکشاں ان کے دل و دماغ کو چمکائے رہتی ہے۔

رئیس اختر کو مذہبی علوم و فنون سے بھی گہری وابستگی ہے شہر کے علمائے کرام سے بھی ان کے اچھے مراسم ہیں۔ ان کی دینی و علمی صحبتوں سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ رئیس اختر اپنے عمدہ خصائل اور شائستہ مزاجی کی وجہ سے شہر کے تمام ادبی مراکز میں مقبول ہیں۔ چالیس برس سے شعر و ادب کی دنیا میں اپنی شاعرانہ عظمتوں کا احساس دلا رہے ہیں ان کے تین شعری مجموعے آئینۂ دل (۱۹۷۹ء) پلکوں کے پھول (۱۹۹۴ء) اور روحِ دل ۱۹۹۸ء (نعتوں کا مجموعہ) ادبی حلقوں میں شہرت پا چکے ہیں جو تھا مجموعہ "سفینۂ دل" زیرِ ترتیب ہے۔

رشتوں کی پاسداری میں رئیس اختر بےحد وضعدار انسان ہیں وضعداری کی انتہا یہ بھی ہے کہ بہت سے خوشگوار لمحے ان کی پلکوں پر نورِ سحر بن کر چمک رہے ہیں۔ یادیں رئیس اختر کی زندگی کا عظیم سرمایہ ہیں۔ رقت آمیز جذبات میں ڈوبے ہوئے شعر یادگار ہیں۔ ان لمحوں کے جو سائے کی طرح شاعر کے ہم سفر ہیں ؎

نہال سنگھ ورما

دلوں کو جوڑنے والے اردو ہندی کے منفرد شاعر

حیدرآباد میں ہندی کے اہم شاعروں میں آج ایک ایسا بھی نام کثرت سے سرفہرست ہے جو صلاح الدین نیر کے نام کے ساتھ یا اس نام کے ساتھ صلاح الدین نیر کا نام لیا جائے گا اور وہ نام ہے نہال سنگھ ورما کا۔ سچ پوچھیے تو حیدرآباد میں ہندی اردو کو قریب لانے میں گزشتہ ۲۰، ۲۵ سال سے نہال سنگھ ورما جو کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں وہ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب، صدیوں کی رواداری و بھائی چارگی، برسوں کی لسانی ہم آہنگی اور اعلیٰ اقدار کے تحفظ و ضمانت کے لیے ناقابل فراموش ہی نہیں بلکہ شہر کی ادبی و تہذیبی تاریخ میں بھی روشنائی سے لکھے جائیں گے۔ ورما کا نام ہندی اردو کی ہر نشست اور باوقار محفل میں عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے نہال سنگھ ورما کو ۳۰ سال پہلے انوار العلوم ویمنس کالج (پرانی حویلی) کے ایک مشاعرہ میں دیکھا تھا وہ شاذ تمکنت کے ہمراہ آئے تھے اس مشاعرہ میں ورما صاحب نے بھی کلام سنایا تھا۔ نہال سنگھ ورما نے جب شعری و ادبی دنیا میں قدم رکھا تو اس میدان میں شاعروں کی نوبت تھی

بدل گئی۔ انہوں نے اپنی دلچسپی کی وجہ سے ہندی اُردو کے شاعروں کو ایک مرکز پر جمع کرنا شروع کیا۔ میں اس پُر خلوص اور اچھے کام میں ان کا ایک مخلص ساتھی ثابت ہوا۔ ورما جہاں ایک معتبر شاعر ہیں وہیں بہترین نثر نگار باشعور تبصرہ نگار اور بہترین مفکر بھی ہیں وہ ایک ایسے انسان ہیں جو زندگی کی راحتوں اور آسائشوں کے ساتھ ساتھ زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ بھی اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں ورما کی شخصیت ہی ایسی پُرکشش ہے کہ ان سے پہلی بار ملنے والا شخص دوسری ملاقات کا انتظار کیے بغیر اپنے روابط کو استحکام بخشتا ہے کچھ ایسی ہی خوبیوں کی وجہ سے ہندی اُردو والے انہیں اپنا شاعر اپنا ادیب اور اپنا دوست کہتے ہیں اور اُن سے روابط اور دوستی پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ نہپال سنگھ ورما تقریباً ۳۰ سال سے انوار العلوم کالج میں ہندی کے استاد بھی انہیں ہندی کے صدر شعبہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں یوں تو کئی لوگ آتے اور جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کے تجربات کا حاصل کہے جاتے ہیں اچھے انسان اور اچھے دوست کا ملنا صرف اللہ کی مہربانی پر منحصر ہے۔ ورما ایک اچھے اور ایسے پُر خلوص انسان ہیں جن سے مل کر ایک عام آدمی بھی اُن کی طرف کھینچتا چلا جاتا ہے۔ ورما بھی زندگی کی حرارت محسوس کرنے والے اُن لوگوں میں سے ایک ہیں جو آنے والے کل کا انتظار نہیں کرتے ہیں نہپال سنگھ ورما کی دوستی پر اس لیے بھی فخر کرتا ہوں کہ ایسے بے غرض مخلص دوست قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔ (طویل مضمون سے اقتباس (پھر وہی پرچھائیاں ۱۹۹۳ء)

ڈاکٹر رام پرشاد

(اُردو دوست۔ ہمدرد ڈاکٹر۔ شائستہ انسان)

حیدرآباد میں رہنے والے بطورِ خاص ایسے لوگ جو اُردو زبان، اُردو تہذیب، حیدرآبادی روایات اور شائستگی کے مظہر ہوا کرتے ہیں وہ اپنے ماحول میں اپنی خوش مزاجی، انسانیت دوستی، مروت، رواداری اور اپنے بہترین طریقۂ زندگی کے سبب سب کی نظروں میں رہتے ہیں خاص طور پر ایسے لوگ جن کے اسلاف کا تہذیبی رشتہ مثالی رہا ہے ان کے خوش گوار اثرات معاشرہ میں نسلاً در نسلاً پھیلتے چلے جاتے ہیں حیدرآباد میں اب بھی ایسے بہت سے گھرانے موجود ہیں جو تعلیم و تربیت، تہذیب و ثقافت، خوش دلی اور خوش مزاجی کے آئینہ دار ہیں۔ اس طرح کی مجموعی خصوصیات کی حامل شخصیتوں میں شامل ایک نام ڈاکٹر رام پرشاد کا بھی ہے۔ جن سے ملنے کے بعد پہلی ملاقات

ہی میں اس بات کا اندازہ ہوگا کہ یہ شخص کسی علمی و تہذیبی خاندان کا چشم و چراغ ہے حیدرآباد میں ایسے ڈاکٹر بھی ملیں گے جو سراپا خلوص و محبت، مروت و شرافت کے آئینہ دار رہے ہیں۔ ڈاکٹر رام پرشاد ہمارے شہر کے ایک ایسے انسان دوست، محبت شناس، اعلیٰ روایتوں کی پروردہ شخصیت ہیں جن سے ملاقات کے بعد ایک خوشگوار مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ ڈاکٹر رام پرشاد لاتعداد مریضوں کے لیے ایک ہمدرد و مسیحا رہ چکے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ڈاکٹر رام پرشاد کے ہاتھ میں شفا ہے۔ مریض کی آدھی بیماری ڈاکٹر صاحب کی دلچسپ گفتگو سے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مریضوں سے کچھ اس انداز سے گفتگو کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی قسم کا عارضہ نہیں ہے۔ ہر مریض کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ اس کا مرض بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ جب کوئی مریض ان کے ہاں آتا ہے تو مختلف قسم کے خیالات کے زیر اثر سہما سہما رہتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب کی تشخیص کے بعد شاداں و فرحاں اپنے گھر لوٹ جاتا ہے بیسیوں ایسے مریض ہوں گے جن سے وہ تشخیص کی بہت کم فیس لیتے ہیں۔ اور ایسے بھی مریض ہوں گے جن سے وہ مشورہ کی فیس نہیں لیتے ہوں گے۔ خاص طور پر شاعروں، ادیبوں، فنکاروں کے لیے ان کی خدمات اعزازی رہتی ہیں۔ بعض فنکاروں کو اپنے پاس سے مفت دوائیاں دیتے ہیں۔ ڈاکٹر رام پرشاد کے کلینک میں مریضوں کا اژدھام رہتا ہے۔ یہ ان کی مقبولیت کی ایک روشن مثال ہے

ڈاکٹر صاحب ہر مریض سے دلاسہ دیتے ہوئے بات کرتے ہیں اطمینان کے ساتھ تشخیص کرنے ہیں محلہ ملے پلی میں سکونت پذیر ہیں ۔ ان کے گھر کے ایک حصہ میں کلینک ہے نرسنگ ہوم بھی ہے آن محلے میں اس کے علاوہ ایک اور کلینک بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر کے ہر فرد کو اُردو زبان اور اُردو تہذیب سے دلچسپی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو شعر و ادب سے گہری دلبستگی رکھتے ہیں۔ ان کے والد محترم رائے جانکی پرشاد ریٹائرڈ ناظم محکمہ اطلاعات نے اُردو زبان و ادب کی نمایاں خدمت انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اور مولوی حبیب الرحمن جیسے محسنین اُردو ان کے رفقائے کار میں شامل تھے رائے صاحب اُردو میں کئی کتابوں کے مترجم ہیں اپنی اولاد کو انہوں نے اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ ان کے بیٹوں میں ڈاکٹر رام پرشاد اور سوہن پرشاد صاحب نے اپنے شعبہ میں کافی نام کمایا ہے موہن پرشاد صاحب حکومت آندھرا پردیش میں ایک عہدہ دار تھے اُردو ادیب ہیں آثار قدیمہ سے تعلق رکھنے والے موضوعات پر ان کے مضامین روزنامہ سیاست میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک بہت ہی اچھی کتاب جو یادگار سلاطین عالم ہے فرخندہ بنیاد کے نام سے شائع ہوئی ہے ڈاکٹر صاحب کے ایک بھائی ہر پرشاد رہ رزیہ سلطان تو باکو) میں دو بیٹے ڈاکٹر روی کمار (کینسر اسپیشلسٹ ایالو) اور راجیش کمار ڈائرکٹر (فرٹلائزر کمپنی) اور دو بیٹیاں رینو دیوی کا اور ریوتی دیوی (ایم کام گولڈ میڈلسٹ) ہیں تھرنمہ اوشا دیوی (ناہیتو ایشور راج ماتھر ریٹائرڈ ڈائرکٹر انفارمیشن مہاراشٹرا) اہلیہ ہیں — جو

اُردو کی ادیبہ ہیں۔ بزمِ خواتین میں اپنے متعدد مضامین سنا چکی ہیں۔ اخبارِ سیاست میں بھی اُن کے مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر رام پرشاد صاحب کے والدِ محترم راجے جانکی پرشاد کئی برسوں تک اردو مجلس کے صدر نشین رہے۔ حسنِ اتفاق سے ۲۸ برس تک میں اردو مجلس کا معتمد رہا۔ میں اُس وقت بھی معتمد رہا جب راجے جانکی پرشاد صدر اردو مجلس تھے۔ ڈاکٹر رام پرشاد کو موسیقی کا بھی شوق ہے اپنی طالب علمی کے زمانے میں کالج میں ہونے والے میوزیکل پروگرام میں حصہ لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے دولت خانہ پر کبھی کبھی موسیقی کی محفلیں سجتی ہیں مشاعروں کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے ڈاکٹر صاحب کے گھر کے تمام افراد صرف اردو میں بات کرتے ہیں۔ ویسے بھی کائستھ گھرانے کے تمام لوگ اپنے گھروں میں اردو ہی بولتے ہیں۔ حیدرآباد میں کائستھوں نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے کائستھوں میں کئی شاعر و ادیب رہے ہیں۔ آج بھی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب انتہائی پُر خلوص، ہمدرد، دوست نواز شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کے دوستوں میں شہر کی نمائندہ شخصیتوں کے ساتھ ساتھ عام اور اوسط درجہ کے لوگ بھی شامل ہیں۔ غرور، خود پسندی جیسی بیماریوں سے بہت دور ہیں۔ نہایت سیدھے سادے شریف انسان ہیں اپنے والدِ محترم کی تمام خوبیوں اور خصوصیات کے مظہر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے میرے بہت ہی اچھے دوستانہ مراسم ہیں۔ میں اور میرے اہلِ خاندان کو جب کبھی ڈاکٹر صاحب کی مسیحائی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے

ڈاکٹر صاحب کے ہاں پہونچ جاتے ہیں۔ اگر میں کسی جاں بلب بیمار کے
شخص کے لیے سفارشی خط لکھوں تو اُس کی پذیرائی کرتے ہیں۔ میں
جب بھی ڈاکٹر صاحب کے پاس جاتا ہوں اور انہیں میری آمد کی اطلاع
ہوتی ہے تو وہ فوری بلوا لیتے ہیں بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے
روم سے باہر آ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جہاں ایک کامیاب طبیب ہیں
وہیں انھیں شعر و ادب سے بھی دلچسپی ہے ڈاکٹر صاحب
زندہ دلان حیدرآباد کے زیر اہتمام ہونے والی سالانہ کانفرنس کی لطیفہ گوئی
کی محفلوں میں اپنے پسندیدہ لطیفے سنا کر داد و تحسین حاصل کرتے ہیں
ان کے اکثر لطیفے ان کے پیشہ ڈاکٹری سے متعلق ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر
رام پرشاد حیدرآباد کے کائستھ گھرانے کے ایک ایسے فرد ہیں جو حیدرآباد کی
گنگا جمنی تہذیب کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے منتخب دوستوں میں
بلا تفریق مذہب و ملت بہت سے ایسے دوست ہیں جو سوسائٹی
کے اعلیٰ رتبہ پر فائز ہیں۔ ڈاکٹر رام پرشاد ہمارے شہر کے ایک ایسے
مہذب شہری ہیں جن کی شرافت، انسانیت، رواداری اور خلوص کی
خوشبو معاشرہ میں پوری طرح پھیل چکی ہے حیدرآباد میں انسانیت دوست
ڈاکٹروں کا جہاں کہیں بھی تذکرہ ہوگا وہاں ڈاکٹر رام پرشاد کا نام
ضرور لیا جائے گا۔ ڈاکٹر رام پرشاد ان اعلیٰ روایات کا تسلسل
ہیں جو حیدرآبادی تہذیب کو فروغ دینے میں ہمیشہ مخلص رہے ہیں۔

پروفیسر محمد علی اثر

(ماہرِ دکنیات۔ ممتاز محقق و قابل استاد، مشہور شاعر)

ہماری جامعات میں کچھ ایسے اساتذہ بھی ہیں جنہیں صرف اپنے علمی و ادبی، تحقیقی و تعلیمی سرگرمیوں سے ہی دلچسپی رہا کرتی ہے اور جو ہمیشہ اپنے ذہن و فکر کی روشنی سے دبستانِ علم و عرفان کو منور کرتے رہتے ہیں جنہیں اس بات سے مطلق دلچسپی نہیں رہتی ہے کہ ان کے ساتھی اساتذہ کس رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور کس انداز سے اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں انہیں اس بات سے بھی واسطہ نہیں رہتا کہ بعض اساتذہ جو انسدادِ نصابی سرگرمیوں میں مصروف ہیں ان سے اپنا رشتہ رکھیں۔ بہترین اساتذہ، بہترین انسان کی طرح معاشرہ میں کچھ ایسا کام کر جاتے ہیں کہ جس کی خوشبو سے سارا علمی و ادبی ماحول مہک جاتا ہے۔ احساسِ ذمہ داری ہر انسان کو اعلیٰ منصب پر پہونچا دیتا ہے۔ اپنے کام سے عشق رکھنے والے لوگ کبھی ناکام یا نامراد نہیں رہتے۔ منزلیں ان کے

چوم چومتی ہیں۔ ہر لمحہ ان کی بہترین اوقات کے لیے عمر طویل کا متمنی رہتا ہے اچھے اساتذہ کی عظمتوں اور رفعتوں کا وہی لوگ اندازہ لگا سکتے ہیں جن کی روشنی شریک وہ دور کی ہر شئے کو جگمگاتی رہتی ہے۔ وہ طلبا خوش قسمت سمجھے جاتے ہیں جنھیں قابل اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہتی ہے۔ ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ اعلیٰ مرتبت اساتذہ کے شاگرد بھی اپنے استاد کی طرح اپنے نام اور اپنے کام سے اپنی بھرپور پہچان بنا چکے ہیں۔ اچھے اساتذہ کا اوڑھنا بچھونا علمی و ادبی کام ہی رہتا ہے ایسے اساتذہ جنھوں نے دل و جان سے اپنے پیشہ درس و تدریس کے تقدس کو باقی رکھا ہے وہ اپنی نیک نامی کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ اس طرح کے اساتذہ میں ماہر دکنیات، قابل محقق، نامور شاعر، ادیب و نقاد پروفیسر محمد علی اثر بھی ہیں جو علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے جانے جاتے ہیں اپنے ہم خیال اساتذہ میں ہی نہیں اپنے طلبا میں بھی مقبول ہیں پروفیسر محمد علی اثر دکنیات کے ماہرین میں سے ایک ہیں جن کی شعر و ادب کے موضوع پر تاحال ۲۶ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کی بیشتر کتابوں پر ملک کی بعض اردو اکیڈیمیوں کی جانب سے انعامات مل چکے ہیں۔ حیدرآباد کی اردو اکیڈیمی کی جانب سے ان کی بہت سی کتابوں پر انعامات مل چکے ہیں ان کی کتابوں کے مسودات پر رقمی امداد بھی مل چکی ہے پروفیسر محمد علی اثر ان دنوں ویمنس کالج (جامعہ عثمانیہ) میں صدر شعبۂ اردو ہیں

میں پروفیسر محمد علی اثر کو اس وقت سے جانتا ہوں جب کہ وہ انوار العلوم کالج

کے حامل تھے اور ایک نئے شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت بنانے میں دلچسپی رکھتے تھے طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کا کلام سیاست اخبار میں چھپنا شروع ہوا۔ بہت ہی عمدہ شعر کہتے ہیں ان کی دوسری تحقیقاتی کتابوں کی طرح ان کے شعری مجموعے ملاقات۔ حرف نم دیدہ قابل مطالعہ ہیں۔ طلا ئیکی رنگ میں ڈوبا ہوا اور عصری حیات کی ترجمانی کرنے والا ان کا کلام ذہن و فکر کے تمام دریچے کھول دیتا ہے۔ ان کے سارے کلام میں آمد ہے آورد نہیں۔ نہایت سلیقے سے پُر اثر لب و لہجے میں شعر کہتے ہیں ان کے اشعار بالراست سامعین و قارئین کے دل و دماغ میں اتر جاتے ہیں پروفیسر محمد علی اثر مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے ہیں البتہ خاص خاص علمی و ادبی تقاریب میں موجود رہا کرتے ہیں۔ پروفیسر محمد علی اثر کے زیر نگرانی تا حال ۳۰ طلباء نے ایم فل اور ایک طالب علم نے پی ایچ ڈی کیا ہے اُن کا جامعہ عثمانیہ کے ممتاز فرزندوں میں شمار ہوتا ہے پروفیسر ڈاکٹر محمد علی اثر کی ادبی خدمات پر میر بشارت علی لکچرار انگریزی سودیپانند ڈگری کالج (سری وینکٹیشور الیونیورسٹی) نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے جامعہ عثمانیہ کی ایک طالبہ حمیدہ نے جامعہ عثمانیہ سے محمد علی اثر بہ حیثیت محقق کے زیر عنوان پی ایچ ڈی کے لیے مقالہ لکھ رہی ہے پروفیسر محمد علی اثر اپنے اساتذہ کا دل و جان سے احترام کرتے ہیں اپنے بعض خاص اساتذہ کے ذکر سے بے حد مسرت محسوس کرتے ہیں اور دوران گفتگو ان کی آنکھوں میں روشنی کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے جس وقت وہ جامعہ عثمانیہ میں

ایم اے اردو کے طالب علم تھے تو ان کے اساتذہ میں پروفیسر رفیعہ سلطانہ کے علاوہ پروفیسر حفیظ قتیل، ڈاکٹر حمید شطاری، پروفیسر غلام عمر خان، ڈاکٹر سیدہ جعفر ڈاکٹر مغنی تبسم تھے۔ ڈاکٹر محمد علی اثر اپنی طالب علمی کے زمانے میں کالج کی ادبی سرگرمیوں سے دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی ان کی نثری و شاعری تخلیقات منظرِ عام پر آنے لگیں۔ اپنے اساتذہ کی بر وقت مناسب حوصلہ افزائی نے ان کے قلم کی رفتار کو تیز تر کر دیا ہے پروفیسر اثر نے ملک بھر کی بیشتر یونیورسٹیوں میں اپنے مقالے پیش کیے ہیں۔ کئی سیمینار، سمپوزیم میں حصہ لے چکے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کی جانب سے جامعات کی مختلف علمی کمیٹیوں سے وابستہ رہے ہیں۔ پروفیسر محمد علی اثر کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ وہ گولڈ میڈلسٹ ہیں اور جامعات سے تعلق رکھنے والے طلباء کے ساتھ ہر ممکنہ تعاون کیا کرتے ہیں۔ ان کے کئی شاگرد معاشرہ کے مختلف مثبت شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے اور اپنے اساتذہ کی بہترین تعلیم و تربیت کی وجہ سے ارتقائی منازل طے کرتے جا رہے ہیں ڈاکٹر اثر کو میں نے بعض مشاعروں میں کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے۔ ترنم میں کلام سناتے ہیں۔ ان کے شاعرانہ لب و لہجے میں شائستگی و شگفتگی نمایاں ہے۔ شاعرانہ اسلوب اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انہیں فنِ شاعری سے بھی کما حقہٗ واقفیت ہے اپنے اشعار میں زبان و بیان کا خاص خیال رکھتے ہیں اپنے دل کی بات نہایت عمدگی کے ساتھ

قلم و قرطاس کے حوالے کر دیتے ہیں اور اپنی شاعری کے نت نئے رنگ کے پھولوں کو گلزار شعر و ادب میں بکھیرتے رہتے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کی خاص مہربانیوں سے وہ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو کے علمی و ادبی کاموں میں عملاً حصہ لیتے ہیں اور تفویض کردہ ذمہ داریوں کو نہایت سلیقے سے سرانجام دیتے ہیں۔ پروفیسر اثر کا علمی و ادبی، تحقیقی و تنقیدی کام جاری ہے۔ جامعہ عثمانیہ سے زیر نگرانی پروفیسر غلام عمر خان پی ایچ ڈی کے لیے بہ عنوان "دکنی غزل کی نشو و نما" مقالہ لکھا۔ ۱۹۸۰ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ محمد علی اثر شہر کی بعض علمی و ادبی انجمنوں سے بھی وابستہ ہیں ان انجمنوں کے جلسوں میں شریک رہا کرتے ہیں کم کم ہی سہی ــــ انہیں انجمن سازی کا قطعی شوق نہیں ہے۔ اپنے دوستوں اور شاگردوں کا دل رکھنے کے لیے وابستہ ہو جاتے ہیں۔ شعر و ادب کی محفلوں میں ہر ادبی حلقے کے لیے قابل قبول ہیں۔ شہر کے تمام ادبی حلقے ڈاکٹر صاحب کی بات کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہیں ان کی کافی عزت و توقیر ہوتی ہے پابندِ وقت، اصول پسند انسان ہیں۔ وقت پر جلسوں میں شرکت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام اردو حلقے وقت کی پابندی کریں۔ ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ شہر کی اردو محفلوں میں تمام حلقوں کے شاعر و ادیب ایک دوسرے کا تعاون کریں۔ ان کے بعض مخصوص شاگرد ہیں جن پر خاص دھیان دیتے ہیں پروفیسر محمد علی اثر بھی

سے جونیر شاعر ہیں۔ میں ان کی نثری خدمات کی طرح ان کی شاعری کی بھی دل و جان سے قدر کرتا ہوں۔ نہایت شریف النفس، با اخلاق، با مروت، دیانت دار اور نفیس انسان ہیں۔ ان کے انداز گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی تربیت شریفانہ ماحول میں ہوئی ہے ان کے گھرانے کا ماحول علمی و ادبی ہے ان کے اسلاف، شائستگی کا پیکر رہے ہیں ان کے پرکھوں نے انسانی رشتوں کی پاسداری کی ہے۔ جو شخص فطری طور پر ایک اچھا انسان ہے وہ اپنے اسلاف کی قدر و منزلت کو ہمیشہ اپنے ذہن و فکر میں سموئے رکھتا ہے۔ محمد علی اثر ایک ملنسار، بہترین دوست اور باکردار انسان کی طرح اپنے حلقۂ احباب میں منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ اپنے سے بڑوں کا احترام، اپنے ہم عصر ساتھیوں سے بہترین دوستانہ روابط اور اپنے چھوٹوں پر نظر کرم ان کا وطیرہ ہے پروفیسر صاحب کے اہل خاندان قدر شناسی، شگفتگی اور سلیقہ شعاری کے پیکر ہیں زیور تعلیم و تربیت سے آراستہ ہیں۔ ان کی شریک حیات را سلطانہ نے حال ہی میں علیم صبا نویدی کی نعتیہ شاعری کے عنوان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے ڈاکٹر صاحب کو دکنی علوم و فنون سے کافی دلچسپی ہے۔ دکنی ادبیات کے تحقیقی کاموں کے لیے زیادہ وقت دیتے ہیں انھیں دکنی ادبیات پر کافی مہارت حاصل ہے۔ ہندوستان ہی نہیں پاکستان اور دیگر ملکوں کے علمی و ادبی حلقوں اور جامعات کے اساتذہ اور طلبا و طالبات ان کی کتابوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ حیدرآباد کو یہ فخر حاصل ہے کہ ایک نامور

فرزند جامعہ عثمانیہ نے اپنے علمی و ادبی کارناموں سے حیدرآباد کا نام روشن کیا ہے۔ وہ لوگ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے جنھوں نے اپنے کارناموں سے اپنے عہد، معاشرہ کو وہ سب کچھ دیا ہے جن پر موجودہ صاحبان فکر و خیال اور آنے والی نسلیں فخر محسوس کرتی رہیں گی۔ پروفیسر محمد علی اثر ایک خاموش طبع، منکسر المزاج انسان ہیں انہیں کبھی بھی غیر ضروری مسائل سے دلچسپی نہیں رہی۔ ان کی ہر تحریر اہل علم کے لیے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ ان کی کتابوں میں جو کچھ پڑھنے کو ملے گا وہ مصدقہ معلومات کا حاصل رہے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے بالخصوص تحقیق کے معاملے میں کبھی قیاس آرائی سے کام نہیں لیا۔ اپنی ہر بات دلائل کے ساتھ سلیقے کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ میں ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی، شخصی خدمت کی وجہ سے ہی نہیں ان کی ذاتی شرافت، ان کے خلوص اور ان کے مزاج کی شائستگی اور ان کے شریفانہ سلجھے ہوئے لب و لہجہ سے بھی متاثر ہوں۔ تمام علمی و ادبی حلقوں کی طرح میری بھی یہ خواہش رہے گی پروفیسر محمد علی اثر اپنے بہترین علمی و ادبی کارناموں سے وابستگان علم و تحقیق کو نوازتے رہیں۔ تاحال ڈاکٹر محمد علی اثر کی ۲۶ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ✱

پروفیسر انورالدین

(شریف الطبع محنتی انسان۔ معتبر استادِ اردو)

ان دنوں جہاں ہمارے بعض دانش کدوں، درس گاہوں، مدرسوں اور جامعات کی رفعت گھٹانے، اُن کی قدر و منزلت کو کم کرنے والے اساتذہ موجود ہیں وہیں اُن کی عظمتوں، رفعتوں اور اُن کے وقار کو برقرار رکھنے والے اساتذہ کی بھی کمی نہیں ہے۔ آئے دن اس طرح کا یہ منظر بصارت نوازوں اور بصیرت پسندوں کے لئے ایک اہم سوالیہ نشان بنتا جا رہا ہے۔ آج کے اس بے اعتنائی، کم نگاہی، کوتاہ ذہنی اور کم سوادوں کے لیے عیش سامانی سے مانوس و آسودہ دور میں اچھے اساتذہ کا ملنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ دل و جان سے اس مقدس پیشے کی ایمانداری، دیانت داری کے ساتھ خدمت کرنے والے عنقا ہوتے جا رہے ہیں۔ آج ہماری بعض درس گاہوں، تعلیمی و تہذیبی اداروں پر ضرب کاری لگائی

جا رہی ہے۔ ذہنی [illegible] ۔ جیسے والے فرض شناس بعض اساتذہ بھی سازشوں مصلحتوں اور ایسی پیشہ ورانہ سرکشی کی نامناسب و نازیبا سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ اساتذہ کی آپسی رنجشوں نے ہماری دانش گاہوں کو کافی نقصان پہنچایا ہے۔ شکر ہے کہ اس بے یقینی کے دور میں بھی کچھ فرض شناس اساتذہ اپنے پیشے سے دیانت داری کے ساتھ وابستہ ہیں جن میں سے ایک معتبر نام پروفیسر انورالدین کا بھی ہے۔ پروفیسر انورالدین اپنے پیشے سے ایمانداری اور دیانت داری کے ساتھ اپنا گہرا رشتہ رکھنے کے سبب علمی و ادبی حلقوں میں بہت زیادہ پسند کیے جاتے ہیں۔ پروفیسر انورالدین سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں بہ حیثیت پروفیسر اردو برسر خدمت ہیں۔ پروفیسر صاحب اسی یونیورسٹی کے طالب علم بھی رہے ہیں۔ پروفیسر مغنی تبسم کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ پروفیسر انورالدین نے انوارالعلوم ایوننگ کالج سے بی اے اور جامعہ عثمانیہ سے ایم اے اور ایم فل کیا۔ پروفیسر مغنی تبسم کی زیر نگرانی عالمی امن تحریک اور اردو ادب کے موضوع پر مقالہ لکھا۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری سنٹرل یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پروفیسر گیان چند جین کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی تکمیل کی۔ پی ایچ ڈی میں ان کے مقالے کا عنوان جنوبی ہند کے اردو علمی و ادبی رسائل کا تحقیقی و تہذیبی جائزہ تھا۔ ڈاکٹر انورالدین کا اسی یونیورسٹی میں بہ حیثیت لکچرار اردو تقرر ہوا۔ پھر ریڈر بنے اور اسی یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو بھی رہے۔ ڈاکٹر انورالدین کو ایک اعزاز یہ بھی حاصل ہے کہ وہ شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی کے پہلے پی ایچ ڈی ہیں

ڈاکٹر انورالدین سے میری ملاقات اکثر علمی و ادبی جلسوں میں ہوتی رہتی ہے۔ میں
نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ ایک شریف النفس، شائستہ و شگفتہ مزاج انسان
ہیں۔ ان کا اندازِ تخاطب نہ صرف دلپذیر ہوتا ہے بلکہ پُراثر بھی رہتا
ہے۔ وہ اپنے دوستوں میں اپنی شرافت و خلوص، محبت و مروت کی وجہ
سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ ایک ہی پیشہ سے تعلق رکھنے والوں میں آپسی اختلافات
اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ یہ متعدی مرض
نہ صرف مدرسوں اور جامعات ہی میں پھیل چکا ہے بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں
اس طرح کے حالات سے ہمیں گذرنا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر انورالدین نے اپنے تعلیمی و
تدریسی سفر میں خوش خرامی کے ساتھ ساتھ میانہ روی کو بھی ترجیح دی ہے۔ نہ تو وہ
سُست گام رہے اور نہ ہی تیز گام رہے بلکہ انہوں نے اپنی اعتدال پسندی
کے سبب مقبولیت و شہرت حاصل کی ہے۔ جس کسی بھی شخص کا دل و
دماغ، شفاف آئینہ کی طرح پاک و صاف رہتا ہے وہ اپنی ادبی و تہذیبی
سفر کو راستوں کے مختلف پیچ و خم کی پرواہ کئے بغیر جاری رکھتا ہے۔
پروفیسر انورالدین میں یہ وصف اُن کے مزاج اور اُن کی طبیعت میں کچھ
بس گیا ہے۔ پروفیسر انورالدین اپنے ساتھی اساتذہ اور طلباء میں یکساں
مقبول ہیں۔ نہایت شائستہ اور سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ طلباء کی ہر ممکنہ
مدد کرتے ہیں۔ احساس ذمہ داری کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اس
بات کے لئے بھی کوشاں رہتے ہیں کہ ان کی خدمتِ درس و تدریس سے
اپنی یونیورسٹی کا نام روشن کر سکیں۔ حتی الامکان اس بات کی بھی

رشک کرتے ہیں کہ ان کی جامعہ کا علمی و ادبی ماحول ملک کی دیگر جامعات کے مقابلے میں زیادہ خوشگوار رہے۔ طلبا کی بہترین تعلیم و تربیت کے لیے مختلف اوقات میں شعبۂ اردو کی جانب سے سمپوزیم۔ سیمینار۔ توسیعی لکچر اور ادبی تقاریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ملک کی مختلف جامعات کے اساتذہ اور نامور دانشوروں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انورالدین کی میں اس لیے بھی قدر کرتا ہوں کہ وہ نہایت منکسر المزاج، با اخلاق اور پُرخلوص انسان ہی نہیں بلکہ ایک فعال شخصیت کے بھی مالک ہیں۔ انھوں نے حیدرآباد کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کی علمی و ادبی خدمات پر ریسرچ کروایا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ وہ اپنے طلبا کے تحقیقی مقالوں کے لیے کچھ ایسے موضوعات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ جن پر تحقیق کی کافی گنجائش رہتی ہے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہر اچھی بات اور ہر اچھے مشورہ کو قبول کرتے ہیں چاہے وہ کسی بھی جانب سے اُن تک پہونچے۔ انہیں اس بات کا بھی اندازہ رہتا ہے کہ اُن سے ملنے والا کس حد تک پُرخلوص ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سے طلبا و طالبات کی رہنمائی کی اور اُن کا یہ سرپرستانہ انداز جاری ہے۔ عموماً ذہین طلبا کے لیے ایم اے کے بعد ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی میں داخلہ کا مرحلہ نہایت اہم رہتا ہے۔ قابل طلبا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایم۔ فل اور پی ایچ۔ ڈی کے انٹرویو میں کامیاب ہو جائیں گے انہیں اس بات کی فکر دامن گیر رہتی ہے کہ کہیں پچھلے دروازہ سے داخل ہونے

والا کوئی امیدوار ان کا حق نہ چھین لے۔ اس طرح کے بے اطمینانی و بے یقینی کے لمحات سے ہر طالبِ علم گذرتا ہے جب وہ کسی انٹرویو کے لیے جاتا ہے۔ اس طرح کا ایک واقعہ یہاں اس لیے بیان کرنا چاہتا ہوں کہ بہت سے مواقع پر قابل طلبا و طالبات بھی فکرمند رہتے ہیں۔

ایک سال پہلے کی بات ہے کہ پروفیسر محمد علی اثر کے حوالے سے دو طالبات اسریٰ طیبہ اور عالیہ تسنیم میرے گھر آئیں۔ انھوں نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایم۔ فل کے لیے حیدرآباد کے ایسے مشہور و معروف شاعروں کی نشاندہی کروں جن پر تحقیق کے لیے مواد آسانی سے اکٹھا کیا جا سکتا ہے اُنھیں اس بات کا ڈر تھا کہ شاید وہ انٹرویو میں کامیاب نہ ہو سکیں (چونکہ وہ شہر کی ادبی سیاست سے واقف نہیں) انھیں اس بات کا یقین نہیں تھا کہ ان کے دیئے ہوئے موضوع کو اربابِ مجاز قبول کریں گے۔ میں نے ممتاز شعرا رئیس اختر اور ڈاکٹر صادق نقوی پر مقالہ لکھنے کا مشورہ دیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ یہ دو ایسے مستند شاعر ہیں جن کی شاعرانہ خدمات پر کام کرنے کی ضرورت ہے اور یقین دلایا تھا کہ ان شعرا کے مقالے کے سلسلے میں بھرپور تعاون کروں گا۔ یہ لڑکیاں بہت خوش ہوئیں۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ انٹرویو کل ہے۔ میں نے کہا کہ اگر آپ میں صلاحیت ہے تو آپ کو داخلہ مل جائے گا کیوں کہ وہاں میرٹ کی بنیاد پر داخلے ہوتے ہیں چنانچہ دونوں کو داخلہ مل گیا وہ بے حد خوش ہوئیں ڈاکٹر انورالدین سے جب بھی فون پر گفتگو ہوتی ہے یا کہیں

ہوتی ہے تو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اس طرح کے اساتذہ اگر تمام جامعات میں رہیں تو جامعات کا ماحول کبھی آلودہ نہیں ہو سکتا۔ اور طلبا کا تعلیمی سفر نہایت سکون کے ساتھ جاری رہتا ہے۔ اگر اساتذہ کے آپس میں بہترین مراسم رہیں تو دانش گاہوں کا ماحول یکسر بدل جائے گا۔ ڈاکٹر انور الدین جب کبھی مجھ سے ملتے ہیں تو اپنی پوری شرافت، محبت و خلوص کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ علمی و ادبی مصروفیات میں ان کا زیادہ وقت گزرتا ہے۔ ملک کی مختلف جامعات کے تحت ہونے والے سمینارز، سمپوزیم اور ادبی جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔ ریسرچ اسکالرس اور اساتذہ کے انتخاب کے سلسلے میں انہیں مدعو کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور الدین کی تاحال دو کتابیں زیر عنوان "فکر و نظر" اور "حیدرآباد دکن کے علمی و ادبی رسائل" شائع ہو چکی ہیں۔ "فکر و نظر" کو اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انعام سے نوازا ہے۔ ڈاکٹر انور الدین شعبۂ اردو سنٹرل یونیورسٹی کے ترجمان تحقیقی مجلہ کے جوائنٹ ایڈیٹر اور مدیر رہ چکے ہیں اور "محیط" کے مدیر بھی رہے ہیں حکومت آندھرا پردیش کی آٹھویں، نویں اور دسویں جماعت کے نصاب کی کتابوں کے مرتب رہے ہیں۔ ان کی تعلیمی خدمات کو سراہتے ہوئے آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی نے "بسٹ ٹیچر ایوارڈ" دیا۔ ڈاکٹر انور الدین حیدرآباد کی معیاری علمی و ادبی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں کبھی مقرر کی حیثیت سے تو کبھی اپنے مضامین کے ذریعہ تشنگان علم و فن کی پیاس بجھاتے ہیں۔ ان کے مضامین اپنے

موضوعات کے مکمل ترجمان رہتے ہیں۔ ان کا اسلوب تحریر اور انداز تخاطب پسندیدگی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ان کا ایک اور کارنامہ جامعہ کی ذمہ داری کو خوش اسلوبی سے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اردو زبان، اردو ادب اور اردو تہذیب کی خدمت کرنا بھی ہے۔ ڈاکٹر انورالدین ادارۂ سیاست کی جانب سے ہونے والے عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ کے اردو دانی زبان دانی اور ادب اردو انشاء کے امتحانات کے انعقاد کے سلسلے میں بھی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ان کا پُر خلوص تعاون مثالی ہے۔ ان کے شریک رفیق کار مرزا اکبر علی بیگ کی رفاقت، امتحانات کے انعقاد کے سلسلے میں ثمر آور ثابت ہوتی ہے اور یہ کامیاب سلسلہ ۶ برس سے جاری ہے اردو امتحانات کے سربراہ جناب ظہیر الدین علی خان صاحب مینیجنگ ایڈیٹر روزنامہ سیاست ہیں یہ تمام کام جناب زاہد علی خان صاحب مدیر سیاست کی راست نگرانی میں انجام پاتے ہیں جناب زاہد علی خان صاحب کی قیادت میں ہی یہ تعاون جناب ظہیر الدین علی خان صاحب روزنامہ سیاست" کی تعلیمی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ان امتحانات کے اہتمام کے سلسلے میں ڈاکٹر انورالدین اور پروفیسر اکبر علی بیگ بہترین معاون ثابت ہوئے ہیں ان امتحانات کے ذریعہ بلا تخصیص مذہب و ملت و زبان ہزاروں بچے بڑے اردو زبان و ادب و تہذیب سے قربت اختیار کر رہے ہیں مجھے اپنے دوست اور اپنے استاد بھائی ڈاکٹر انورالدین کے بہترین افکار و خیالات اور ان کی لائق تحسین ادبی سرگرمیوں پر بے حد مسرت ہوتی ہے۔ نامور استاد جامعہ ڈاکٹر انورالدین اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے نہ صرف بہترین استاد جامعہ کی حیثیت سے بلکہ ایک قابل قدر ادیب کی حیثیت سے بھی ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔

کبیر احمد

بے داغ شخصیت، باصلاحیت دانشور

بہت کم بلکہ انگلیوں پر گنی جانے والی کچھ ایسی شخصیتیں بھی ہمارے معاشرہ کا حاصل ہوتی ہیں جو اپنی شرافت، محبت، انسان دوستی اور باہمی رشتہ خلوص کی ترجمان ہوتی ہیں جن کا وجود سوسائٹی کے لئے ایک ایسا چشمۂ نور ہوتا ہے کہ جس کے اُجالے نزدیک و دور کے ہر روشنی پسند انسان کے لئے ایک نعمت بے پایاں اور ایک ایسی سوغات سمجھے جاتے ہیں جو بنا مانگے اس کے دامن کو بھر دیتے ہیں۔ اس طرح کے بے انتہا شریف بامروت، سادگی مزاج اور روشن طبیعت لوگوں میں نامور دانشور کبیر احمد، سابق ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو بھی شامل ہیں۔ کبیر احمد ایک روشن خیال، روشن دماغ اور کشادہ دل انسان ہیں جب کبھی اُن سے ملاقات ہوتی ہے تو یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ شخص اعلیٰ منصب پر فائز اتنا بڑا عہدہ دار ہے — ایک بہترین انسان

مثالی دوست اور نہایت ذہین و باشعور شخص کا نام کبیر احمد ہے۔ کبیر احمد صاحب سے ملنے والا ہر شخص یہی سمجھتا ہوگا کہ وہ ایک ایسے دریائے نور و تعلقات ہیں جن کا فیض مسلسل جاری ہے۔ کبیر احمد صاحب دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہونے والے، ہر حال میں دوسروں کو خوش دیکھنے والے ایک ایسی شخصیت کے حامل ہیں جو اپنے حصے کی خوشیاں دوسروں کی جھولی میں ڈالنے کا فن جانتے ہیں کبیر صاحب نے اپنی ذات کے لئے کبھی کچھ نہیں کیا لیکن ان کی زندگی کا سارا مقصد اور سارا فلسفہ یہی ہے کہ کسی کی آنکھوں میں آنسو نہ رہیں کسی کا چہرہ سہما نہ ہو کسی کا دل اداس نہ ہو کسی کی نظریں جھکی جھکی سی نہ رہیں۔ کبیر احمد مہذب معاشرہ کی پسندیدہ شخصیت ہیں جن سے مراسم پر ہر وہ شخص خوشی محسوس کرتا ہے جو پاک وصاف معاشرہ سے واسطہ رکھتا ہے اور وہ شخص بھی فخر محسوس کرتا ہے جو لاپرواہی کے ساتھ اپنی زندگی گذار رہا ہے اور وہ شخص بھی جو ان کے سائبان تلے اطمینان کی سانس لینا چاہتا ہے۔

کبیر احمد میرے اُن بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں جن کی دوستی قابل رشک ہے اور اُن جیسے معتبر لوگوں سے مراسم رکھتے ہوئے دلی مسرت محسوس ہوتی ہے۔ کبیر احمد سے میری دوستی کوئی ۲۵ برس پرانی ہے۔ اُن سے میری پہلی ملاقات سکریٹریٹ میں ہوئی تھی کبیر صاحب نے ابتدائی ملازمت کا آغاز سکریٹریٹ سروس سے کیا۔ سکریٹریٹ میں چند سال رہے

اُن سے جب کبھی ملاقات ہوتی تھی اُن کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب رہتی
تھی وہ خالی ہاتھ کبھی نہیں رہتے۔ آفس آتے ہوئے اور آفس سے لوٹتے
ہوئے ان کے ساتھ علم کی دولت رہتی تھی۔ سکریٹریٹ میں شاید
اُن کے دوست بہت کم تھے البتہ مسٹر راما جو میرے ڈپارٹمنٹ
سے تعلق رکھتے تھے اُن سے کبیر صاحب کی ملاقات تھی مسٹر راما میرے
بھی اچھے دوست ہیں وہ انگریزی زبان کے شاعر ہیں تلگو میں بھی انھوں
نے بہت سی نظمیں کہی ہیں کافی سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان ہیں انھوں
نے انگلش لٹریچر میں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کیا ہے ان دنوں کسی کالج
میں لکچرر ہیں کبیر صاحب نے سکریٹریٹ کی ملازمت کب ترک کی مجھے کچھ
نہیں معلوم۔ البتہ مجھے مسٹر راما سے بعد میں پتہ چلا تھا کہ انھوں نے آل انڈیا
ریڈیو کی ملازمت اختیار کر لی ہے اور وہ پروگرام ایگزیکیٹیو کی حیثیت سے
کارگذار ہیں کبیر صاحب جب آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد میں رہے تو ان سے
ملاقات ہوتی رہی۔ مجھے مختلف ادبی و شعری پروگراموں کے سلسلے
میں آل انڈیا ریڈیو جانا پڑتا تھا۔ کبیر صاحب شروع سے ہی کم آمیز
شخص رہے۔ محسوس ہوتا تھا کہ وہ زندگی کے خوشگوار لمحوں سے
اجتناب کر رہے ہیں آفس میں بھی خاموش رہتے تھے ان کا تبادلہ پہلے
اورنگ آباد اور دلی ریڈیو اسٹیشن پر ہوا اور نہ جانے کہاں کہاں گئے
جب انھیں ڈائرکٹر کی حیثیت سے آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن کشمیر جانے کے
آرڈر ملے تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ کشمیر کے غیر یقینی حالات نے انھیں

کش مکش میں مبتلا کردیا تھا کہ جائیں یا نہ جائیں انہوں نے کئی احباب سے مشورہ کیا آخرکار کشمیر چلے گئے۔ نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تقریباً دو برس تک کام کرتے رہے۔ کبیر صاحب نے کشمیر ریڈیو سے مختلف اردو پروگرام کا آغاز کیا۔ ان کے ہاں اردو کے لئے کافی بجٹ تھا وہ بجٹ کا صحیح استعمال کرنے لگے۔ کشمیر کے پروگرام کے سلسلے میں حیدرآبادی فن کاروں سے بھی انہوں نے ربط رکھا۔ مجھے یاد ہے کہ انہوں نے حیدرآباد اور اضلاع تلنگانہ بلکہ گلبرگہ، پربھنی اور جہاں جہاں بھی وہ ملازم رہے وہاں کے شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کو ریڈیو پروگرام دیتے رہے حیدرآباد اور اضلاع آندھرا پردیش کی حد تک شاعروں، ادیبوں کو پروگرام دینے سے پہلے مجھ سے بھی مشورہ کرتے تھے اکثر دفعہ علی الصبح مجھے فون کرتے اور مشورہ طلب کرتے کہ کن کن شاعروں، ادیبوں کو پروگرام دیا جانا چاہیئے۔ باہمی مشاورت سے انہوں نے بہت سے اہل قلم حضرات اور خواتین کو پروگرام دیئے۔ انہوں نے کئی شاعروں، ادیبوں کے پروگرام حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن میں ریکارڈ کرواکر منگوالیا۔ پروگرامس کو قطعیت دینے کے بعد کبیر صاحب فون پر مجھے اطلاع دیتے اور میرے نام پروگرام کی ایک کاپی روانہ کرتے۔ میں متعلقہ قلمکاروں کو اطلاع دیتا اور خاص طور پر اضلاع کے کسی ایک اہم شاعر کو اطلاع دیتا کہ "کبیر احمد صاحب نے کہا کہ کشمیر ریڈیو کے لئے ایک ادبی پروگرام بھجوانا ہے آپ اپنے ضلع کے متعلقہ سینیئر عہدہ داروں سے ملاقات کرلیں

کبیر احمد صاحب کشمیر ریڈیو کے لئے کئی نئے اور پرانے قلمکاروں، فن کاروں کی زبردست خدمت کی ان کی اس کرم فرمائیوں کا سلسلہ کئی ماہ جاری رہا لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کسی اچھے ہی اردو دشمن کی شکایت پر یہ سلسلہ رک گیا۔ شکایت میں کہا گیا کہ کبیر صاحب ریڈیو کشمیر کا سارا روپیہ حیدرآباد کے شاعروں اور ادیبوں پر خرچ کر رہے ہیں جب وہ ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد بن گئے تو حیدرآباد کے قلمکاروں کے لئے فیض عام کا دروازہ کھلا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جتنے اردو پروگرام کبیر صاحب کے دور میں حیدرآباد کے شاعروں، ادیبوں کو دیئے گئے ۔۔۔ اتنے پروگرام حیدرآباد ریڈیو سے کسی بھی دور میں نہیں ملے ہوں گے کبیر صاحب نے اردو پروگرام کے دائرے کو بہت وسیع کیا تھا۔ شہر کی مختلف نامور شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔ ہر فن کار کو اس کے مزاج کے مطابق پروگرام دیتے رہے۔ کئی نئے ادبی و تہذیبی سلسلے شروع کیے۔۔ مختصر یہ کہ ادب کا کوئی ایسا گوشہ نہیں تھا جس پر کبیر صاحب نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی تاریخ میں کبیر صاحب پہلے مسلمان ڈائرکٹر رہے۔ اُن کی بہترین کارکردگی کے اعتراف میں حکومت نے اُن کی مدت ملازمت میں ایک سال کی توسیع کی۔ کبیر صاحب کا اجلاس شاعروں، ادیبوں اور فن کاروں کے لئے منتظر رہا کرتا تھا ہر چھوٹے بڑے قلمکار سے وہ خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے۔ نرم لہجہ میں گفتگو کرتے۔ شاید ہی کوئی فن کار ہوگا جو کبیر صاحب کے ادبی دربار سے

خالی ہاتھ لوٹنا ہوتا۔

کبیر صاحب نے انتہائی باصلاحیت قلم کے دھنی اور ذمہ دار آفیسر کی حیثیت سے نام کمایا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا سارا اسٹاف ان کے ہی خاندان کا ایک فرد تھا۔ کبیر صاحب نے اپنی ڈائرکٹری کے زمانے میں اپنے آفس کے ملازمین کے مختلف مسائل جو تصفیہ طلب تھے ان کی فراخ دلی کے ساتھ یکسوئی کی۔ میں نے انھیں کسی دن بھی اپنے روم میں تنہا نہیں پایا۔ کچھ لوگ کرسیوں پر تو کچھ لوگ صوفوں پر بیٹھے رہتے۔ احباب سے گفتگو کرتے رہتے اور فائیلوں پر اپنے نوٹ لکھتے رہتے۔ فون بھی ریسیو کرتے رہتے۔ اپنے خاص دوستوں کے لئے لنچ کے علاوہ چائے کا بھی انتظام ہو جاتا۔ نہایت یار باش آدمی تھے۔ کبیر صاحب جتنی بہتر اردو جانتے ہیں اتنی ہی ان کی انگریزی قابل رشک ہے۔ انگریزی میں ان کی بعض تقریریں میں نے سنی ہیں سننے والوں کا یہ احساس ہے کہ ایک دریا ہے کہ بہتا جارہا ہے ان کا ہر جملہ آب رواں کی طرح سامعین کے دل و دماغ کو تر و تازگی بخشتے ہوئے فیض پہونچاتا رہتا ہے اردو کے ادبی جلسوں میں زیادہ تر اردو میں ہی تقریر کرتے ہیں بہت ہی رواں دواں ان کا انداز خطاب ہوتا ہے کبیر صاحب کو میں نے مجھ سے متعلق انجمنوں کے کئی ادبی جلسوں میں کبھی صدر کی حیثیت سے کبھی مہمان خصوصی اور کبھی مقرر کی حیثیت سے مدعو کیا ہے۔ اگر انھیں جلسوں میں

شرکت کرنی ہو تو وقت پر آتے ہیں اور جلسہ کے اختتام تک بیٹھے رہتے ہیں
کبیر صاحب کو اردو شعر و ادب سے کافی دلچسپی ہے مذہبیات کی نورانی
محفلوں میں بھی شریک رہا کرتے ہیں انھیں بزرگان دین سے بھی
غیر معمولی عقیدت ہے شہر کے علمائے کرام سے ان کے مراسم ہیں
ان سے وقتاً فوقتاً ملاقات کرتے رہتے ہیں وظیفہ حسن خدمت
کے بعد کبیر صاحب خانقاہی نظام سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔
علمائے کرام اور مذہبی علوم و فنون سے زیادہ سے زیادہ فیض پانا چاہتے ہیں
نہایت پاک و صاف، معتبر اور نیک سیرت انسان ہیں۔ شہر کے
تمام قابل ذکر نامور شخصیتوں سے ان کی رسم و راہ ہے انکسار بھی
ان کے مزاج کا ایک اہم جزو ہے کبھی بھی انھوں نے اپنی عظمت و
قابلیت پر غرور نہیں کیا۔ ادب کے ایک طالب علم کی طرح بڑی بڑی
محفلوں میں شرکت کرتے ہیں حیدرآباد میں کبیر صاحب کے دوستوں
کا ایک وسیع حلقہ ہے لیکن بہت کم ایسے دوست ہوں گے جو ان
سے بے تکلف ہوں گے۔ جب وہ ڈائرکٹر تھے تو میری ہر جائز
سفارش پر بہت سے شاعروں، ادیبوں کو ریڈیو پروگرام سے نوازتے
رہے انھوں نے یہاں تک کہ اردو پروگرام میں بعض ہندی شاعروں
کی بھی پذیرائی کی۔ ڈاکٹر سی نارائن ریڈی سے انٹرویو کے لئے مجھے اور
نہال سنگھ ورما کو تلم کنڈا کے شعارمیں بھجوائے ڈاکٹر نارائن ریڈی
کا وہ انٹرویو بہت اہم تھا۔

ڈاکٹر نارائن ریڈی نے دوران انٹرویو یہ بھی کہا تھا کہ "میں فرزندِ جامعہ عثمانیہ ہوں اردو ذریعہ تعلیم سے میں نے گرا تجویشن کی تکمیل کی ہے میں اردو زبان وادب کا دلدادہ ہوں۔ اردو شعر و ادب سے مجھے گہری دلبستگی ہے میں اردو میں بھی شعر کہتا ہوں"۔ کبیر صاحب نے حیدرآباد کی تقریباً تمام اہم شخصیتوں پر انٹرویو نشر کروایا ہے ان کی ڈائرکٹری کا دور یقیناً ریڈیو اسٹیشن حیدرآباد کی تاریخ میں اردو والوں کے لئے ایک سنہرے دور کی حیثیت سے یاد کیا جاتا رہے گا۔ وہ نہایت خوش مزاج دوستی کے قابل انسان ہیں۔ جب بھی دوستوں سے ملتے ہیں تو ان کے چہرہ پر خوشی و مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ مسکراتے ہوئے اپنے احباب سے محوِ گفتگو رہتے ہیں۔ کبیر صاحب بھی میرے دوستوں میں سے ایک ہیں جن کی گفتگو اور جن کے طرزِ تکلم کی امیرے لب و لہجے کو توانائی بخشتی ہیں۔

مسعود بن سالم

چشمۂ آبِ رواں ۔ تنویرِ دیدہ و دل

مہذب سوسائٹی کی نمائندہ شخصیتوں میں ہمیں کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جن کا وجود معاشرہ کے لئے تنویرِ صبحِ نو کا پیغام بن کر اپنے اردگرد کے سارے ماحول کو منور کر دیتا ہے۔ وہ جہاں کہیں بھی رہتے ہیں وہاں اندھیروں کا گذر نہیں ہوتا۔ وہاں اُجالا ہی اُجالا رہتا ہے جب ایسے لوگوں کی نیکیاں چشمۂ آبِ رواں بن جاتی ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے وجود میں آنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ جب تک ان کی سانس چلتی رہے گی وہ دوسروں کی بھلائیوں کے لئے ہی سوچتے رہیں گے اور اپنے حسنِ سلوک سے ہر مستحق شخص کو اس کا حق دلاتے رہیں گے، اور ایسے لوگ جو تمام عمر روشنی کی سرحدوں سے گذرتے ہوئے اپنے نصب العین کی حدوں کو پار کرنا چاہتے ہیں ان کی راہوں میں کسی بھی قسم کی رکاوٹیں حائل نہیں ہو سکتیں۔ اور وہ اپنا سفر جو صراطِ مستقیم کا سنگِ میل ہوتا ہے نہایت پُرسکون انداز میں جاری رکھتے ہیں، اور وہ جس منصب پر بھی

فائز رہتے ہیں نہایت دیانت داری، اعلیٰ ظرفی اور ایمان داری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ ایسے ہی خوش خصال باکردار، روشن دل و دماغ رکھنے والے لوگوں میں ایک نام مسعود بن سالم سابق ڈائرکٹر اکیڈیمی آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کا بھی ہے۔ مسعود بن سالم میرے نہ تو کوئی قدیم دوست ہیں اور نہ ہی جدید دوست ہیں بلکہ میں انہیں جانتا بھی نہیں تھا کہ وہ کس شعبۂ حیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسعود بن سالم سے میری پہلی ملاقات کا میر ہینیو کالج آف ایجوکیشن واقع ماں صاحب ٹینک میں ہوئی تھی۔ میری ایک رشتہ کی بہن ڈاکٹر شفیعہ قادری ان دنوں بی ایڈ کا امتحان دے رہی تھیں انہیں ممتاز ماہر تعلیم نجمہ عبدالحق کی مرتب کردہ ایک اردو کتاب کی ضرورت تھی جو بی ایڈ کورس سے متعلق تھی۔ جب میں نجمہ صاحبہ سے اُس کتاب کے سلسلے میں اُن کے دولت خانے پر پہونچا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ وہ کتاب اس وقت ان کے پاس نہیں ہے البتہ مسعود بن سالم لیکچرر کامیر ہینیو کالج آف ایجوکیشن سے حاصل کی جاسکتی ہے چنانچہ میں نے اُن کے حوالے سے مسعود بن سالم صاحب سے ملاقات کی۔ شفیعہ قادری میرے ساتھ تھیں بڑے تپاک انداز میں مجھ سے ملے۔ میں نے اُن سے ملاقات کا مقصد بیان کیا۔ انہوں نے چائے سے تواضع کی اور کالج کی لائبریری سے وہ کتاب منگوا کر میرے حوالے کی۔ دورانِ گفتگو مسعود صاحب نے کہا کہ میں آپ سے غائبانہ اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ کا کلام سیاست میں پڑھتا رہتا ہوں۔ میں نے ریڈیو سے بھی آپ کا

کلام سنا ہے۔ مسعود صاحب سے دو تین دفعہ کالج میں ملاقات رہی۔ پھر اُن سے میری کہیں ملاقات نہیں ہوئی۔ حسنِ اتفاق سے انہوں نے ڈائرکٹر اُردو اکیڈیمی کی ذمہ داری ۱۹۹۱-۱۹۹۴ سنبھالی اُس زمانے میں جلیل پاشاہ صدرنشین اُردو اکیڈیمی تھے جو میرے قریبی دوست ہیں انہوں نے اُردو اکیڈیمی کے بہت سے معاملات میں مجھ سے تعاون حاصل کیا جلیل پاشاہ کا دورِ صدرنشینی کئی اعتبار سے قابلِ تقلید ہے انہوں نے میرے مشورہ سے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کے مسائل کی یکسوئی کی اور میری ہر جائز سفارش کی پذیرائی کی۔ جلیل پاشاہ کی صدرنشینی کے زمانہ میں اُردو کے بہت سے پروگرامس ہوتے رہے۔ اُس زمانہ میں مسعود بن سالم صاحب سے اکثر دفعہ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اُن کا مخلصانہ اور با اخلاق سلوک مثالی تھا مسعود صاحب جب نظامتِ تعلیمات آفس سے وابستہ رہے تو وہاں اُردو کے مسائل پر اُردو والوں کی مدد کرتے رہے۔ اُردو اکیڈیمی کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے مسعود بن سالم صاحب نے بہت سی اسکیمات کو بہ حسن و خوبی عمل میں لایا۔ شاعروں ادیبوں کی اُردو ڈائرکٹری کا کام انہیں کے زمانے میں شروع ہوا اور تقریباً تکمیل پایا تھا ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی نئی کتاب اُردو لغت کا کام بھی انہیں کے زمانے میں شروع ہوا۔ اکیڈیمی کی جانب سے عزیز بھارتی کا مجموعہ لمحے کا سفر انہیں کے زمانے میں شائع ہوا۔ مسعود صاحب کے دور میں کسی بھی شاعر و ادیب کی حق تلفی نہیں ہوئی۔ اکیڈیمی کا کام صاف ستھرے انداز

یہ جاری رہا۔ مسعود صاحب سے میں نے کبھی اپنا ذاتی کام نہیں لیا البتہ ایسے شاعروں اور ادیبوں کے مسائل جن کا آفس کی بھول بھلیوں میں کھو جانے کا امکان رہتا تھا ان پہ توجہ دلانے پر جلد از جلد تکمیل پاتے رہے۔ زمرۂ شاعری میں میں نے بہ حیثیت "جج" شاعروں کے مسودات و مطبوعات کے سلسلے میں فراخ دلی کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ مستحق شاعروں ادیبوں کی اعانت کی۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ اکیڈمی کو ایک بزرگ و محترم شاعر کے انعام کے سلسلے میں کچھ غیر متوقع حالات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا لیکن مسعود صاحب نے اپنی حکمت عملی سے ایک الجھے ہوئے مسئلہ کو غیر محسوس طریقہ سے حل کیا۔ یہی نہیں کئی اور مسائل کو نہایت عمدگی کے ساتھ طے کیا۔ مسعود صاحب دوبارہ ۱۹۹۶ء میں ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی مقرر ہوئے۔ اور سید شاہ نورالحق قادری کی صدر نشینی کے دور میں بھی ڈائرکٹر رہے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا۔ مسعود صاحب ڈائرکٹر کے عہدہ سے اکٹوبر ۱۹۹۹ء کو سبکدوش ہوئے۔ شاعروں، ادیبوں کے مسودات، مطبوعات کا سلسلہ ہو کہ کتابوں کی خریداری کا مسئلہ ہو رسائل کو امداد دینے کا مسئلہ ہو بھرپور اعانت کرتے تھے۔ خاص خاص ادبی جلسوں کے انعقاد کے سلسلے میں بھی انہوں نے کئی افراد و اداروں کی مدد کی۔ مسعود صاحب ایک بہترین استاد کی حیثیت سے شہرت پا چکے ہیں محکمۂ تعلیمات میں بھی اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ مسعود صاحب کو یہ اعزاز حاصل رہا ہے کہ ان کی عمدہ خدمات

سے کے سلسلے میں حکومت نے ان کی مدتِ ملازمت میں ایک سال کی توسیع کی
مسعود صاحب کے بعد اکیڈیمی کے حالات میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں
مسعود صاحب نہایت با اخلاق، دوست نواز شخصیت کے
حامل ہیں مسعود صاحب میرے دوست ہیں یہ میرے لئے اعزاز ہے اکیڈیمی
کے آفس میں اکثر ان سے خیرسگالی ملاقات ہوتی تھی انھوں نے ہمیشہ
چائے سے تواضع کی۔ اُن سے میری ملاقات ۵، ۷ منٹ سے زیادہ نہیں
رہتی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے آفس کے کاموں کو اپنی موجودگی
سے متاثر کروں۔ مسعود صاحب کی شخصیت ہی کچھ ایسی ہے کہ جب
اُن سے کسی کی دوستی ہو جاتی ہے تو وہ اُن کی طرف کھنچتا چلا جاتا ہے۔
میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ انتہائی مصروفیات کے باوجود اگر کوئی خاص دوست
اُن سے ملنے آتے تو وہ بیزارگی محسوس نہیں کرتے تھے اور وہ مسکراتے
ہوئے کھڑے ہو کر استقبال کرتے تھے مسعود صاحب کا اندازِ گفتگو
ہمیشہ متاثر کرتا رہا۔ بردباری، شرافت اُن کا خاص وصف ہے نرم
گفتاری اور سنجیدگی میں وہ اپنی مثال آپ ہیں ان کے خاص دوستوں
میں بہت سے لوگ ہوں گے لیکن اردو اکیڈیمی کے سلسلے کے خاص دوستوں
میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، عاتق شاہ اور رفعت صدیقی کو میں نے اُن کے
قریب محسوس کیا۔ مسعود بن سالم ایک کھرے پاک و صاف انسان ہیں
اُن کی ملازمت کے آخری دنوں میں میں نے بزم عثمانیہ جدہ کے جنرل
سکریٹری جناب عارف قریشی سے تعارف کروایا تھا عارف قریشی حیدرآباد

کے کچھ اردو میڈیم مدارس کی امداد کرنا چاہتے تھے جب انھوں نے مجھ سے مشورہ کیا تو میں نے کہا کہ اس سلسلے میں مسعود صاحب سے بہتر کوئی ایسا شخص میری نظر میں نہیں ہے جو اردو میڈیم کے مستحق مدرسوں کی نشاندہی کر سکے۔ چنانچہ مسعود صاحب کی رہنمائی میں عارف صاحب نے میری موجودگی میں شہر کے ۳۴ اسکولوں کی رقمی اعانت کی۔ مسعود صاحب کا مشورہ اور تعاون صدفی صد صحیح رہنما ہے نہ جانے کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو ان کی اُستادی کے زمانے سے لے کر ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی کے زمانہ تک فیض نہ پائے ہوں۔

حیدرآباد کے نامور شاعر عزیز بھارتی سخت بیمار تھے ان دنوں کوئی شاعر یا ادیب اُن کی مالی اعانت کے لئے اردو اکیڈیمی سے رجوع نہیں ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر رام پرشاد کے نرسنگ ہوم میں زیرِ علاج تھے عزیز بھارتی نے مومن خان شوق صاحب کے ذریعہ مجھ سے ملنے کی خواہش کی۔ میں شوق صاحب کے ہمراہ فی الفور ان سے ملنے کے لئے نرسنگ ہوم پہونچا ابھی میں اُن کے روم میں داخل بھی نہیں ہوا تھا کہ میرے قدموں کی آہٹ سے انھیں اندازہ ہو گیا کہ میں آرہا ہوں۔ عزیز بھارتی نے مجھے دیکھتے ہی کہا "نیر بھائی" اور انھوں نے اپنے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے انھیں لیٹے رہنے کے لئے کہا۔ انھیں دلاسہ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ انھیں طبی اعانت کی سخت ضرورت ہے میں نے عزیز بھارتی کے بڑے بیٹے سے کہا کہ آپ کل سیاست آفس آجائیے وہ

میرے پاس آئے میں نے زاہد علی خان صاحب سے سب ادبی ٹرسٹ سے رقمی امداد کا چیک دلوایا۔ پھر میں نے کہا کہ آپ اردو اکیڈیمی جائیے ڈائرکٹر صاحب سے مل لیجئے میں فون کردوں گا۔ میں ڈیڑھ بجے ان سے مل لوں گا۔ میں اکیڈیمی کے آفس پہونچا۔ مسعود صاحب سے عزیز بھارتی کی رقمی اعانت کے سلسلے میں گفتگو رہی۔ انہوں نے کہا کہ ضرور امداد دی جائے گی۔ اکیڈیمی سے طبی اعانت کے لئے ۲/۱ ہزار روپے امداد منظور ہوئی۔ یہ رقم مسعود صاحب نے بہ نفس نفیس نرسنگ ہوم پہنچ کر عزیز بھارتی کے حوالے کی۔ میں ساتھ تھا اکیڈیمی کے اکاونٹ آفیسر جناب محی الدین شریف صاحب بھی ہمراہ تھے۔ مسعود صاحب کے سلوک نے مجھے بہت متاثر کیا ان کے لئے دل سے دعائیں نکلیں۔ انہوں نے میری بات کی لاج رکھ لی۔ اور ایک مستحق شاعر کی مدد کی۔ اکیڈیمی میں شاعری کے مسودات کی فہرست میں عزیز بھارتی کا بھی مسودہ تھا میں اور مظہر مجاز مسودات کے سلسلے کے جج تھے ہم نے بلا تامل عزیز بھارتی کا مسودہ منظور کیا۔ مسودہ منظور تو ہوا لیکن اس کی اشاعت کا مسئلہ درپیش تھا اکیڈیمی کی جزوی اعانت سے کتاب شائع نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے مسعود صاحب سے خواہش کی کہ اگر آپ یہ کتاب اردو اکیڈیمی کی جانب سے شائع کریں تو زیادہ بہتر ہے انھیں میرا مشورہ پسند آیا اور ان کی کتاب لہجہ کا سفر کے نام سے اکیڈیمی نے شائع کی۔

مسعود صاحب کی خواہش پر میں نے اس کتاب کا پیش لفظ لکھا۔
مسعود صاحب کے اکیڈمی سے جانے کے بعد اکیڈمی کے حالات اپنے انداز سے جاری رہے۔ اگر وہ مزید کچھ عرصہ تک رہتے تو ان کی رہبری سے اردو اکیڈمی زیادہ استفادہ کرتی۔ مسعود صاحب کا ایک اہم کارنامہ ڈاکٹر علی احمد جلیلی کی کتاب اردو لغت کی اکیڈمی کی جانب سے اشاعت ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں میں نے ڈاکٹر علی احمد جلیلی کو مشورہ دیا تھا کہ آپ ڈاکٹر مسعود بن سالم سے مل لیجئے وہ یہ کام کر دیں گے۔ میں نے مسعود صاحب سے تعاون کی خواہش کی تھی۔ مسعود صاحب کی شخصی دلچسپی سے اکیڈمی کے بہت سے کام مثبت انداز میں طے پائے بلکہ ایسی کئی اور مثالیں پیش کرنے کے موقف میں ہوں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ مسعود صاحب کے اکیڈمی کے لیے ایک ایسے قیمتی تجربہ بہت سوں کے لیے فیض رساں رہے۔
معلوم ہوا ہے کہ مسعود صاحب اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کی بنا پر مولانا ابوالکلام آزاد اردو یونیورسٹی سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ مسعود صاحب بہت ہی سلجھے ہوئے مقرر ہیں اور مسائل پر معلومات آفرین خیالات سے مستفید کرتے ہیں۔ خدا انہیں اتنی عمر دے کہ وہ زبان و ادب کی دیر تک خدمت کرتے رہیں۔
ایسے خدمت گذاروں کی آج اہل اردو کو سخت ضرورت ہے

--*--

غضنفر علی خان

(نامور صحافی۔ ممتاز دانشور۔ لاجواب مقرر بلیغ لسان)

مراسم اور روابط اگر خوشگوار ماحول میں کشادہ دلی اور روشن ذہن و فکر کے زیرِ اثر پروان چڑھتے ہیں تو وہ حیات جاویداں اختیار کر جاتے ہیں۔ شائستگی و شگفتگی ہر انسان کی فکرِ سلیم روشن دل و دماغ اور تابندگیٔ فکر و خیال کے لیے سر چشمہ مسرت و انبساط محورِ علم و لیاقت اور مرکزِ حسن و لطافت سمجھی جاتی ہے جو شخص اپنی زندگی کے مختلف گوشوں اور دلپذیر کیفیات سے ہم کنار رہتا ہے وہ ہر قسم کے حالات سے آنکھ ملاتے ہوئے بلا خوف و خطر اپنی زندگی کا سفر طے کرتا ہے اور ایسا شخص جو اپنی زمین سے جڑا ہوا رہتے ہوئے آسمانوں کی سیر کرتا ہے اُس کی زندگی کا ایک ایک پل سر سبز و شاداب رہتا ہے خوش حال اور مطمئن زندگی کی آبیاری کے لیے حوصلہ و ہمت کے علاوہ حالات سے برسرِ جنگ رہنے کی صلاحیت

ضروری ہے۔ ہر طرح کے مسائل سے برسرپیکار رہنے والے لوگ بہت کم حالات کے شکار رہتے ہیں۔ زندگی کے مختلف النوع الجھنوں سے آنکھ ملانے والے ہمارے شہر کے دانشوروں میں ایک نامور دانشور غضنفر علی خان بھی ہیں۔ جن کے فکر و خیال کے تمام گوشے شفاف آئینوں کی طرح روشن رہا کرتے ہیں جن کی گفتگو، دلبستگی و وارفتگی آئینہ دار ہوتی ہے جن کا رکھ رکھاؤ ان کے برگزیدہ اسلاف کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک مہذب، تربیت یافتہ اعلیٰ اقدار کے حامل شہری کی طرح وہ اپنی حیات کی ہر قسم کی ناز برداریوں سے بہرہ ور ہیں غضنفر علی خان نہ صرف ایک اعلیٰ درجہ کے صحافی ہیں بلکہ ایک نامور نقاد و، منفرد ادیب اور باصلاحیت شہری بھی ہیں جن کی خوبیوں کا اندازہ خاموش گفتگو کے دوران بھی ہوتا ہے اور گرما گرم بحث کے دوران بھی۔ غضنفر علی خان سے گفتگو کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ ایک ایسے شخص سے شرف تکلم حاصل ہو رہا ہے جو نہ صرف دنیوی علوم سے ہی واقفیت رکھتا ہے بلکہ دینی علوم سے بھی کماحقہ واقف ہے چاہے وہ صحافتی گفتگو ہو کہ ادبی و سیاسی، تہذیبی و ثقافتی سلسلہ ہو کہ علمی تعلیمی معاشرتی ان کا ہر جملہ روشن، دل و دماغ کی ترجمانی کرتا ہے ان کے منبر و در خطابت کی روشنی مخاطب کے ذہن و فکر کو منور کرتی چلی جاتی ہے اگر ہم دیانت داری اور بلا تحفظ ذہنی اپنے شہر کے دانشوروں کی صلاحیتوں کا جائزہ لیں تو ہمیں بے شمار ایسے لوگ ملیں گے جو اپنے باصلاحیت ہونے

یا ثبوت دیتے ہوئے دل و دماغ کو آجالوں کی سوغات سے پرنور کرنے جارہے ہیں۔

غضنفر علی خان کا تعلق اُس سرزمین سے ہے جہاں کی سیاسی و علمی تاریخ، تہذیب و ثقافت کے اوراقِ گذشتہ کا ایک اہم حصہ ہے۔ بیدر (کرناٹک) لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم سے پہلے حیدرآباد دکن کا ایک اہم ضلع تھا۔ بیدر کے اعلیٰ تعلیم اور روشن خیال گھرانے سے ان کے اسلاف کا رشتہ ہے۔ ان کے پُرکھوں کی علمی و ادبی کارناموں سے بیدر کی سرزمین سُرخرو رہی ہے۔ غضنفر علی خان ممتاز عثمانین ہیں انہوں نے ۳۰ سال قبل جامعہ عثمانیہ سے بیالوجی میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی زندگی کے مختلف رنگوں سے اپنے پیراہن سادہ میں رنگ بھرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ غضنفر علی خان سے میری پہلی ملاقات ۳۵ برس پہلے میری منہ بولی بہن اہلیہ ڈاکٹر قمرالدین ممتاز شاعرہ انجم قمر سوز کی پھوپھی کے مکان پر ہوئی جبکہ غضنفر ان دنوں جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کررہے تھے۔ انجم قمر سوز کے پھوپی زاد بھائی مسعود اُن کے ہم جماعت تھے غضنفر علی خان سے کچھ اور مقامات پر بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اُن دنوں محفلِ خواتین کے زیرِ اہتمام پہلی غزلوں کی رات (محفلِ موسیقی) کا اہتمام کیا جانے والا تھا۔ غزلوں کی رات کی کنوینر انجم قمر سوز تھیں محفلِ خواتین کا اڈوائزر رہنے کی وجہ سے پروگرام کی صورت گری اور دیگر انتظامی اُمور کے سلسلے میں میرا رابطہ انجم قمر سوز سے

ضروری تھا غضنفر علی خان روزنامہ سیاست میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے مامور رہے کچھ عرصہ بعد وہ بنگلور چلے گئے اور روزنامہ سالار سے وابستہ ہو گئے مقصود علی خان سابق ایم پی روزنامہ سالار کے ایڈیٹر تھے جو غضنفر علی خان کے حقیقی پھوپی زاد بھائی تھے۔ انہوں نے غضنفر علی خان کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ غضنفر علی خان روزنامہ سالار بنگلور کی ملازمت کے بعد رہنمائے دکن سے وابستہ ہو گئے پھر کچھ عرصہ بعد جوائنٹ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی مقرر ہوئے ۱۹۹۴ء سے ۱۹۹۷ء تک کام کرتے رہے۔ دو سال کی مدت کے لیے ان کا تقرر ہوا تھا۔ اکیڈیمی کی ملازمت کے بعد انھوں نے خان لطیف خان صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والے اخبار منصف میں بہ حیثیت سب ایڈیٹر ملازمت اختیار کر لی۔ ان دنوں رہنمائے دکن کے نیوز ایڈیٹر ہیں جہاں وہ وقارالدین صاحب ایڈیٹر رہنمائے دکن کے دستِ راست ہیں۔

غضنفر علی خان اعلیٰ درجہ کے مقرر ہیں نہ صرف اردو بلکہ انگریزی میں بھی تقریر کرتے ہوئے ساری محفل کو گرما دیتے ہیں غضنفر علی خان کو ہر موضوع پر پورے اعتماد کے ساتھ اظہارِ خیال کا ملکہ حاصل ہے معلومات کا خزانہ ہیں۔ میں نے انھیں بعض علمی و ادبی جلسوں کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ غضنفر علی خان ہماری تہذیب سوسائٹی کی ایک نمائندہ شخصیت ہیں نہایت نرم لہجہ میں متوازن طرزِ گفتگو کے ذریعہ اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں۔

ان کا طرزِ گفتگو اس قدر پُر اثر ہوتا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی بیزارگی محسوس نہیں ہوتی۔ جی چاہتا ہے کہ ان کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہے۔ نہایت شریف النفس، خاندانی آدمی ہیں۔ خاندانی وجاہت شریفانہ طرزِ حیات، بہترین سلوک، رواداری اور تکھرے ستھرے ماحول سے وابستگی ان کا اپنا ایک خاص وصف ہے۔ اگرچہ سنجیدگی و متانت ان کے مزاج کا پُر اثر حصہ ہے لیکن ان کے مزاج میں مزاح کا بھی دخل ہے ان کا حسِ مزاح بھی ان کی نفاست پسند طبیعت کے لیے دیدۂ بینا کی حیثیت رکھتا ہے۔ غضنفر علی خان شہر کی علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کا حتیٰ واقفیت رکھتے ہیں۔ اُن لوگوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں جو مختلف شعبۂ حیات میں سرگرمِ عمل ہیں۔ وہ ایک تجربہ کار صحافی ہونے کی وجہ سے ملکی اور عالمی سیاست کی غلام بازیوں اور نت نئے داؤ پیچ سے واقفیت رکھتے ہیں غضنفر علی خان کا حافظہ بہت تیز ہے ان سے گفتگو کیجئے تو پتہ چلتا ہے کہ کئی برس پہلے کے واقعات جو ان کے زیرِ مطالعہ رہے انہیں اچھی طرح یاد ہیں۔ اُن کا دینی مطالعہ بھی قابلِ رشک ہے پابندِ صوم و صلوٰۃ ہیں۔ اللہ نے انہیں توفیق عطا کی ہے کہ وہ ہر روز تلاوتِ کلامِ پاک سے اپنی دنیا و آخرت کو سنوار رہے ہیں۔ شہر کے تقریباً تمام اہلِ قلم حضرات سے ان کے مراسم ہیں شہر کے بعض اہم اہم ادبی، علمی و ثقافتی جلسوں میں اپنے مضامین اور اپنے خطاب سے حاضرینِ محفل کے دل و دماغ کے تمام گوشوں کو منور

کر دیتے ہیں۔ شرکائے محفل کی تسکینِ دل و جان کے لیے بہترین معلومات اور پُر اثر تقریر سے نوازتے ہیں ۔۔۔ غضنفر علی خان پٹھان ہیں لیکن ان کے نرم و ملائم لہجے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ متوازن طرزِ حیات کے پٹھان ہیں۔ غضنفر علی خان حیدرآباد کے ایک علمی و ادبی ادارے اقبال اکیڈیمی کے جلسوں میں خصوصیت کے ساتھ شرکت کرتے ہیں اور کبھی کبھی جلسوں کو مخاطب بھی کرتے ہیں۔ گھریلو مصروفیات ان کے پاؤں کی زنجیر بنی ہوتی ہیں پھر اخبار کی مصروفیات کی وجہ سے کئی علمی و ادبی جلسوں میں شرکت نہیں کر پاتے ۔ ایک ذہین و فطین صحافی کی حیثیت سے نامور شخصیتوں سے ماہرانہ انٹرویو لیا کرتے ہیں اور اپنی بہترین تحریر سے قارئین کے لیے معلومات آفریں مواد پیش کرتے ہیں ایڈیٹر رہنمائے دکن کے با اعتماد رفیق ہیں۔ اعتماد کی فضاء میں اپنے صحافتی سفر کو خوشگوار انداز میں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ نہایت با اخلاق، نفاست پسند، پُر اثر شخصیت کے مالک ہیں اُن کا شائستہ پُر اثر گھرانہ اس بات کا غماز ہے کہ وہ مطمئن زندگی گذار رہے ہیں۔ خاندانی آدمی ہونے کی وجہ سے اپنے عزیز و رفقاء کے دُکھ سکھ میں برابر شریک رہا کرتے ہیں۔ مہذب معاشرہ کی نمائندہ شخصیت کی طرح با عزت زندگی گذار رہے ہیں مجھے غضنفر علی خان صاحب سے شخصی ملاقات کا بہت کم موقع ملتا ہے زیادہ تر فون پر گفتگو رہتی ہے صبح کی اولین ساعتوں میں وہ تلاوت کلام پاک میں مصروف رہتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر رہنمائے دکن

کے اکثر ادارئیے اُن کے رشحاتِ قلم کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ غضنفر علی خان سے جب ملاقات ہوتی ہے تو وہ نہایت خلوص کے ساتھ سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہیں ان سے مل کر میں نے ہمیشہ خوشی محسوس کی ہے۔ غضنفر علی خان اپنے آفس کے ساتھیوں کے ساتھ خوشگوار مراسم کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ غضنفر علی خان ہمارے شہر کی اُن شگفتہ مزاج شخصیتوں میں سے ایک ہیں جن سے مل کر جن سے گفتگو کر کے ذہنی تھکن دور ہو جاتی ہے اور دل پُر مسرت لمحوں سے سرشار رہتا ہے۔

عابد صدیقی

باصلاحیت صحافی و مقرر، بہترین شخصیت، با اخلاق انسان

مہذب معاشرہ میں جب ذہین و فطین، فعال و کارکرد، باصلاحیت صاحبانِ فکر و نظر، وابستگانِ فہم و ادراک، باکمال دیدہ ور دانشورانِ علم و ادب اور تہذیبی و انسانی اقدار کی پوری توانائی کے ساتھ پاسداری کرنے والے لوگ جلوہ گر ہوتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خوشبوئے پیراہنِ گل تر سارے ماحول کو مہکا رہی ہے۔ باشعور روشن خیال اور دل و دماغ کو منور رکھنے والے افراد اجالوں کے سفر کے دوران جب زندگی کی ہر موڑ پر دکھائی دیتے ہیں تو ان کی اعلیٰ صلاحیتوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ مہذب معاشرہ ہمیں جس طرح کی سوغات سے سرفراز کرتا ہے جو کچھ بھی ہمیں دنیا ہے صمیم قلب کے ساتھ ہمیں قبول کرنا چاہیئے۔ جو لوگ دوسروں کی خوشبوؤں میں اپنے حصہ کی خوشبوؤں کو شامل کرتے ہیں اور جو اپنی معاشرتی و تہذیبی ذمہ داریوں کو دیانت داری کے ساتھ پوری کرتے ہیں تو وہ تا حیات

مسرتوں سے ہم کنار رہتے ہیں۔ عابد صدیقی صاحب بھی قدرت کی
عطا کردہ ان مہربانیوں سے پوری طرح فیض یاب رہے ہیں۔

عابد صدیقی ہمارے شہر کے پُر وقار، ہر دل عزیز
انسانیت کے قدر شناس دانشوروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔
عابد صدیقی صاحب کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ
جامعہ عثمانیہ سے ایم اے اردو میں امتیازی حیثیت سے درجہ اول
میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد بہ حیثیت صحافی روزنامہ
رہنمائے دکن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان ہی دنوں انہوں نے
۱۹۷۴ء میں ادب اور صحافت کے نام سے کتاب شائع کی تھی۔
رہنمائے دکن سے وابستگی کے دوران ہی ۱۹۷۶ء میں ترقی اردو
بورڈ دہلی میں اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۱ء میں حیدرآباد
میں اسسٹنٹ انفارمیشن آفیسر کی حیثیت سے مامور رہے۔ عابد صدیقی
صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ دوردرشن حیدرآباد میں ۱۹۹۴ء
سے نیوز ایڈیٹر ہیں۔ جہاں اب بھی وہ اسی خدمت پر بہ حسن و خوبی اپنی
خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ورنگل آرٹس اینڈ
سائنس کالج اور سکندرآباد کالج میں اردو کے لیکچرار رہے۔ ایس سی ای
آر ٹی میں پرنسپل ایڈیٹر کی حیثیت سے انہوں نے کئی نصابی کتابوں
کی ترتیب و تزئین میں اپنا گرانقدر حصہ ادا کیا۔ عابد صدیقی صاحب
ایک خوش مزاج، شگفتہ طبیعت اور رواں دواں شخصیت کے حامل

انسان ہیں ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ اپنے دوستوں سے بلا کسی ذہنی تحفظات کے ملتے ہیں۔ کھلے دل و دماغ کے ساتھ اپنے دوستانہ مراسم کو باقی رکھے ہوئے ہیں۔ عابد صاحب سے میرے مراسم اس وقت زیادہ بڑھے جب ہم دونوں ایک ساتھ ۱۹۹۴ء میں اردو اکیڈیمی کے رکن بورڈ آف گورنرس تھے۔ اکیڈیمی کی میٹنگس کو اپنے بہترین مشوروں سے نوازتے تھے۔ بہت سی اسکیمات کی صورت گری اور ان کی عمل آوری کے سلسلے میں سرگرم عمل رہے۔ جس زمانے میں (۱۹۹۰ء) جلیل پاشاہ اردو اکیڈیمی کے صدر نشین تھے اُن دنوں عابد صاحب نے جلیل پاشاہ کا بہت ساتھ دیا۔ اردو اکیڈیمی کے مقررہ بجٹ ۵۴ لاکھ روپے سے بڑھا کر ایک کروڑ دس لاکھ پر مشتمل اسکیمات کی پیش رفت کے لئے کلیدی رول ادا کیا۔ کل ہند اردو اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے بے شمار جلسوں کی نظامت کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ جلیل پاشاہ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی سے وابستگی کے سبب آج بھی وہ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے اہم اہم جلسوں کی نظامت کے فرائض انجام دیا کرتے ہیں وہ آل انڈیا ریڈیو میں نیوز ریڈر کی حیثیت سے مقبول ہوئے۔ دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کی بیرونی سروس کے لئے بے شمار موضوعات پر اُن کے تبصرے نشر کئے جاتے رہے۔ انہوں نے ذرائع ابلاغ پر کئی لکچر دئیے اور اس موضوع پر کام کرتے رہے ہیں عثمانیہ یونیورسٹی سے

جرنلزم میں پوسٹ گریجویشن کی ڈگری کی۔ پروفیسر بشیر الدین کے خاص شاگردوں میں سے رہے۔ عابد صدیقی اُردو نیوز ایڈیٹر دوردرشن کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو نہایت عمدگی کے ساتھ نبھا رہے ہیں شہر کی نمائندہ علمی و ادبی انجمنوں اور اردو اداروں کی خبروں کو سلیقے کے ساتھ ٹیلی کاسٹ کرواتے ہیں۔ عابد صدیقی شہر کی بہت سی علمی ادبی، دینی و تہذیبی انجمنوں اور اداروں سے وابستہ ہیں۔ خاص طور پر انجمن قادریہ کی تعلیمی سرگرمیوں سے غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں اردو رائٹرس اینڈ فرینڈس فورم کے صدر ہیں۔ عابد صاحب کے دوست و احباب کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے اصحاب ان کے شناساؤں اور دوستوں میں شامل ہیں۔ پرخلوص نفیس انسان ہیں۔ نیک نامی کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں حکومت کے سربراہوں اور مختلف محکموں کے ذمہ داروں سے بھی ان کے اچھے مراسم ہیں۔
عابد صدیقی کو ہر موضوع پر گفتگو کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔ وہ اپنی بات نہایت سلیقہ سے دوسروں تک پہونچاتے ہیں۔ باکردار، صاف گو، محبت کرنے والے انسان ہیں۔ چاہنے اور چاہے جانے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عابد صاحب اپنے دوستوں اور خاص طور پر اپنے بے تکلف دوستوں سے کھل کر ملاقات کرتے ہیں۔ اپنے دوستوں کی محفل میں سب سے زیادہ قہقہہ لگانے والے عابد صدیقی ہی ہیں لیکن ان کے قہقہے بہت ہی دل آویز

ہوتے ہیں جو سارے احباب کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑا دیتے ہیں ان کے لبوں پر شگفتگی کھیلتی رہتی ہے ان کی مہکی ہوئی گفتگو مخاطب کو مسحور کر دیتی ہے۔ مافی الضمیر ادا کرنے میں انہیں کمال حاصل ہے بہت ہی عمدہ اور نپے تلے جملوں کے ساتھ آب رواں کی طرح اپنی پراثر تقریر جاری رکھتے ہیں۔ شہر کے تمام بڑے اردو اخباروں کے مدیران سے ان کے اچھے خاصے مراسم ہیں۔ صحافتی برادری کے علاوہ شہر کے شاعروں، ادیبوں سے بھی کچھ اس طرح خلوص کا اظہار کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ مہذب معاشرہ کا ہر شخص ان کا دوست ہے۔ عابد صدیقی دوستی کرنے اور دوستی نبھانے میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں نہایت گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہیں اور اس وقت تک ملاقاتی کا ہاتھ تھامے ہوئے رکھتے ہیں تاوقتیکہ ملاقاتی کا ہاتھ جدائی کا سبب نہ بنے۔ صاف دل کے لئے ریا کے داغ آئینہ صفت انسان ہیں جب کبھی فون پر گفتگو ہوتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم بالمشافہ گفتگو کر رہے ہیں۔ فاصلوں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اور جب شخصی ملاقات ہو جاتی ہے تو ان کی دوستی کے جوہر نمایاں ہوجاتے ہیں اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ عابد صدیقی ہمارے معاشرہ کی ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ جب کبھی میں کسی کام کے سلسلے میں ان سے تعاون کی خواہش کرتا ہوں تو وہ میری بات کو نہیں ٹالتے۔ ان سے غیر رسمی روابط کا سلسلہ آج بھی

جاری رہے۔ اُجالوں کے مسافر جہاں کہیں سے بھی گزرتے ہیں اُن کی راہوں میں کہکشاں بکھری ہوئی رہتی ہے تمام راستے پُر نور ہو جاتے ہیں عابد صدیقی جس محفل میں بھی شرکت کرتے ہیں وہاں کا ماحول خوشگوار ہو جاتا ہے۔ اچھی آواز خدا کی خاص نعمت ہوتی ہے عابد صدیقی کو خدا نے سحر آگیں آواز عطا کی ہے جو اپنے میں غیر معمولی مقناطیسی اثر رکھتی ہے ان کی آواز میں بلا کی کشش ہے جس کے سبب ہر ایک مخاطب چاہتا ہے کہ ان کا سلسلۂ گفتگو جاری رہے زندگی کے اداس اور تھکا دینے والے لمحوں میں اگر عابد صدیقی اپنی شگفتہ گفتگو سے پھول برساتے ہیں تو سارا ماحول معطر ہو جاتا ہے عابد صدیقی کے احباب میں مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگ مل جائیں گے لیکن ہر شخص کی ذہنی سطح تک ہی وہ اپنے مراسم کو برقرار رکھتے ہیں۔ اچھے اچھے الفاظ ہر کس و ناکس پر ضائع نہیں کرتے۔ شہر کے برگزیدہ لائقِ تعظیم علماء و مشائخین کے خانوادہ سے ان کا تعلق ہے ان کے گھر کے تمام افراد زیورِ تعلیم سے آراستہ ہیں۔ مہذب و شائستہ ہیں۔ اپنے پرکھوں کی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کرنے میں شائستگی و شگفتگی کے پیکر ہیں۔ دین و دنیا کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتے جا رہے ہیں۔ دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے بھی بہرہ ور ہو رہے ہیں ـــ میں ہمیشہ اُن دوستوں سے گفتگو کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں جو انسانی رشتوں کے قدر داں ہیں۔ اعلیٰ اقدار

کے ترجمان ہیں۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ میں ان کے دوستوں میں شامل ہوں۔ مجھے اس بات کی بھی مسرت ہے کہ وہ میرے مخصوص تہذیب دوستوں میں شامل ہیں۔ آثار و قرائن اس بات کے ضامن ہیں کہ عابد صدیقی کی ساری زندگی نکہت و نغمہ کی فضا میں گذرتی رہے گی۔ "تازہ پھولوں کی خوشبو" ان کے دل و دماغ کو مہکاتی رہے گی اور وہ زبان، ادب اور میڈیا کے ذریعہ ملک و قوم کی خدمت کو جاری رکھیں گے۔

ظہیر الدین علی خاں

(روشن خیال، مجسم شرافت، پیکرِ خلوص، نامور ڈمنسٹریٹر، معتبر صحافی)

بعض چہرے اس قدر خوش جمال ہوتے ہیں کہ جن پر نظر پڑتے ہی یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کو دیکھ رہے ہیں جو مجسم شرافت ہی نہیں شگفتگی و شائستگی کی پہلی اور آخری مثال بھی ہے۔ اس طرح کے لوگوں سے اگر شرفِ تکلم حاصل ہو تو یہ بھی محسوس ہوگا کہ ان کے لب و لہجے سے خوشبو مہک رہی ہے اور سارے ماحول پر خوشی و انبساط کی کہکشاں بکھری ہوئی ہے اس طرح کی شگفتہ و شائستہ اور باوقار شخصیتوں سے ملاقات کے بعد نہ صرف ذہنی تھکن ہی دور ہو جاتی ہے بلکہ دل و دماغ کو خوشگوار فرحت نصیب ہوتی ہے ان کا انداز تخاطب نہ صرف موثر ہوتا ہے بلکہ دل پذیر بھی۔ ہمارے معاشرہ میں اس طرح کے پاک طینت شرافت نواز، اعلیٰ درجہ کے انسان بہت کم ملتے ہیں ــــ اعلیٰ خصوصیات و

کیفیات اور عمدہ صفات کی حامل شخصیت ظہیر الدین علی خان صاحب مینجنگ ایڈیٹر سیاست کی بھی ہے۔ اس صالح نوجوان کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ صبح کی پہلی کرن کی طرح جناب عابد علی خان صاحب کے سارے گھر کو اُجالوں کی نعمتوں اور برکتوں سے سرفراز کرنا شروع کیا تھا۔ سیاست کی معرفت جہاں کہیں بھی زاہد علی خان صاحب مدیر سیاست کا ذکر آجاتا ہے وہیں ظہیر الدین علی خان صاحب کا نام بھی خود بہ خود لبوں پر آجاتا ہے۔ زاہد علی خان صاحب کے برادر خورد ظہیر الدین علی خان صاحب اپنی شرافت، مروت، خلوص رواداری اور اپنی طرح داری اور وضع داری کے سبب اُن لوگوں میں بھی مشہور ہیں جو اُن سے قربت نہ رکھتے ہوئے بھی ان کی کرم فرمائیوں سے مستفید ہوئے ہیں۔ "سیاست" کا ہر رکن، سیاست میں کام کرنے والا ہر شخص ظہیر الدین علی خان صاحب کے نام کی مالا جپتا رہتا ہے۔ دل و جان سے اُن کے حسنِ سلوک کو خراج پیش کرتا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہ ہر شخص سے مخلصانہ و سرپرستانہ سلوک روا رکھتے ہیں۔ "سیاست" کے سارے انتظامیہ پر ان کی گہری نظر رہتی ہے۔ سارا ایڈمنسٹریشن ان کے زیرِ اثر ہے۔ زاہد علی خان صاحب اپنے بھائی کو بہت چاہتے ہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ "سیاست" کی تمام سرگرمیوں میں دونوں ہم خیال رہتے ہیں۔ ظہیر الدین علی خان صاحب "عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ" کے روحِ رواں ہیں۔ اردو تعلیم اور اردو تہذیب کے فروغ میں غیر معمولی دلچسپی لیتے ہیں۔ "سیاست" کی کئی فلاحی و تہذیبی تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں سے گہری دلبستگی رکھتے ہیں۔ جناب عابد علی خان اور

محبوب حسین جگر صاحب کے ساتھ ان مٹلے ظہیر الدین علی خان صاحب کو اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کا کافی موقع ملا ۔ ان دو محترم شخصیتوں کی رحلت کے بعد وہ "سیاست" کی مصروفیات میں کافی تن دہی کے ساتھ اپنی بے مثال وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے اخبار کی مقبولیت و بہتری میں اضافہ کر رہے ہیں ۔ یہ بات ساری اردو دنیا جانتی ہے کہ عابد علی خان ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام بلا تفریق مذہب و ملت ناخواندہ بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کو اردو تعلیم سے آراستہ کیا جا رہا ہے سینکڑوں محبانِ اردو اردو تعلیم سے فیض یاب ہو رہے ہیں ۔ کئی مراکز پر ابتدائی اردو تعلیم کے لیے سہولتیں فراہم کی گئی ہیں ۔ ہم شخصی طور پر واقف ہیں کہ عابد علی خان صاحب کے گھر کا ہر فرد ظہیر الدین علی خان کو بے حد عزیز رکھتا ہے ۔ ان کی نرم گفتاری، ان کی بیباانہ روی، ان کی شرافت، ان کی شائستہ مدارات کے سبب سب کے سب خوش بھی ہیں اور متاثر بھی ۔ نہایت شگفتہ مزاج، سادہ طبیعت اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک ہیں ۔ جناب ظہیر الدین علی خان کا تعاون "سیاست" سے وابستہ ہر محفل کے لیے خوشگوار ماحول کی ضمانت دیتا ہے ۔ ظہیر صاحب ادبی ٹرسٹ کے بھی ٹرسٹی ہیں عابد علی خان صاحب کی زندگی ہی میں ادبی ٹرسٹ کے ارباب مجاز نے انھیں ٹرسٹی نامزد کیا تھا ۔ ادبی ٹرسٹ کے کل ہند مشاعروں کے سلسلے میں بھی زاہد علی خان صاحب کے دستِ راست بنتے ہوئے رہتے ہیں ۔ میرا ٹوٹا رشتہ سیاست اخبار

سنہ ۱۹۵۱ء سے یعنی والد او ر ۴۲ برس سے۔ اُسی زمانے سے میں ظہیر الدین علی خان صاحب کو بہت قریب سے جانتا ہوں۔ نہایت باوقار انسان ہیں۔ میں عابد منزل (رہائش گاہ جناب عابد علی خان صاحب) میں ہونے والی تقریباً تمام ادبی تقریبات اور تہذیبی نشستوں میں موجود رہا ہوں۔ مخصوص عشائیوں میں بھی میں نے شرکت کی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ظہیر الدین علی خان صاحب بھی مہمانوں کے استقبال کے لیے پیش پیش رہا کرتے تھے۔ تمام مہمانوں کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کرتے تھے۔ عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب بھی اپنے مخصوص سرپرستانہ انداز سے ظہیر الدین علی خان صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ ان تمام برسوں میں میں نے ظہیر صاحب میں اُن کی شرافت کے گہرے رنگ پائے ہیں۔ ظہیر الدین علی خان صاحب نے اپنے سے بڑوں کی عزت و احترام میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ بطور خاص صحافت، اخبارات وابستہ تمام اسٹاف سے بے حد احترام سے ملتے ہیں۔ ان کے مزاج کی نفاست و بردباری نے تمام اسٹاف کے دل میں اپنی ایک خاص جگہ بنالی ہے۔ سیاست کے انتظامیہ کے سلسلے میں جناب محبوب حسین جگر کے عکس جمیل کی طرح سب کی نگاہوں میں رہتے ہیں۔ ظہیر صاحب مجھ سے بھی بڑھ کر آداب و احترام کے ساتھ ملتے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے اجلاس میں نہایت سعادت مندی کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ کوئی مسئلہ مشورہ طلب ہو تو نہایت ہی عمدگی کے ساتھ اپنا مافی الضمیر ادا کرتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ایک نہایت مہذب اعلیٰ تربیت یافتہ

شخص محو تکلم ہے۔ ان کی بھر اشے میں ایک آئینہ دار ہوتی ہے
ادبی ٹرسٹ کے ارکان میں ظہیر الدین علی خان صاحب سب سے چھوٹے ہیں
شاید اس لیے بھی وہ گفتگو میں کم حصہ لیتے ہیں۔ سنتے زیادہ ہیں
اور بولتے کم ہیں۔ ان کی تجاویز تمام ارکان ٹرسٹ کے لیے قبولیت کا
درجہ رکھتی ہیں۔ ظہیر الدین علی خان صاحب کا ایک اہم وصف ان کی
انسان دوستی ہے نہ جانے کتنے بے سہارا لوگوں کی انھوں نے مدد کی ہوگی
نہایت ہمدرد انسان ہیں ضرورت مندوں کی غیر محسوس طریقے سے مدد کرتے
ہیں۔ ان کی داد و دہش کی خاموش سرفرازیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔
ان کے ہاں خالی ہاتھ آنے والا اپنا دامن بھر کر جاتا ہے۔ ان کے دائرہ
خیر و برکت میں جو بھی آتا ہے اس کی زندگی سنور جاتی ہے۔ ظہیر الدین علی
خان صاحب اپنی خصوصیات کی وجہ سے بہت سوں کے لیے سرمۂ نظر
بنے ہوئے ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ ان کی شرافت و مروت، رواداری اور
انسان دوستی کے طور و طریق میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہے اور ہمارے معاشرہ کے
ہر شخص کا دامن ان کی محبت و شرافت کے گلہائے رنگا رنگ سے بھر جائے۔

درویش غیاث الدین

(کامیاب تاجر - پیکرِ شرافت - بااخلاق و صاف انسان)

جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کی جانب سے ۱۹۵۹ء میں منعقدہ بین کلیاتی اردو فسٹول کی سرگرمیوں کا جب کبھی خیال آتا ہے تو اس دور کے کئی ذہین و فطین طلبہ و طالبات کے چہرے نگاہوں میں اُبھر کر آجاتے ہیں۔ اُس دور کے بعض طلباء و طالبات زندگی کے میدان میں اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ جن کو دیکھ کر، جن کے بارے میں غور کرتے ہوئے شدت سے اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ اپنی زندگی میں کہاں سے کہاں پہونچ گئے ہیں اُس فسٹول سے وابستہ طلباء زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی نمایاں حیثیت و شخصیت کے ساتھ شہرت پاچکے ہیں نا ہیں کچھ بہترین صلاحیتیں رکھنے والے بیرونِ ملک کے مختلف امات پلڑپی شاندار زندگی کو خوب سے خوب تر بنانے میں مصروف

خود حیدرآباد میں بیشتر ایسے اعلیٰ تربیت لوگ موجود ہیں جو آج تجارت کی دنیا میں صف اول کے مقام پر فائز ہیں۔ چائے کے کاروبار میں عالمی شہرت کے حامل خصوصیت بھی یہی ہے کہ جو شخص اپنی محنت شاقہ سے ترقی کرتا ہے اس کا رتبہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ درویش غیاث الدین تقریباً ۴۰ برس سے لاسا اور ملسا چاکلیٹ چائے کے کاروبار میں اپنے آپ کو وقف کر چکے ہیں۔ لاسا چائے اور ملسا چاکلیٹ چائے کو کون نہیں جانتا۔ چونکہ درویش غیاث الدین ایک نیک اور ہمدرد انسان ہیں اور ہر لمحہ انسانی رشتوں کی عظمتوں سے ہم کنار رہتے ہیں اسی لیے دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے چلے ہے ہیں۔ اپنے کاروبار میں ایمانداری، صاف گوئی، اصول پسندی اور اپنے پاک و صاف طریقہ کار کی وجہ سے ترقی کی منزلیں طے کرتے جا رہے ہیں۔ ایک صدر خاندان کی حیثیت سے اپنے بھائیوں انیس احمد اور نثار احمد اور اپنے فرزندوں اور دیگر اہل خاندان کو ساتھ رکھ کر اپنے کاروبار کو فروغ دے رہے ہیں۔ درویش غیاث الدین بہت سے حاجت مندوں کی آئے دن مدد کرتے رہتے ہیں اور کچھ اس طرح مدد کرتے ہیں کہ ایک ہاتھ کی دوسرے ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ ان کے شریفانہ و سرپرستانہ دربار سے کوئی ایک شخص بھی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔ ہر ایک کا دامن ان کی داد و دہش اور ان کے لطف و کرم سے بھر جاتا ہے۔ نہایت سیدھے سادے بے حد

شریف النفس نکھرے ستھرے انسان میں سنجیدگی، متانت، شرافت، رواداری، انسانیت دوستی ان کا ایک خاص وصف ہے۔ نہایت دین دار، ایماندار، راسخ العقیدہ مسلمان ہیں دنیوی علوم کے ساتھ ساتھ دینی علوم سے نہ صرف دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ اُن کو فروغ دینے کے لیے بے لوث خدمت انجام دے رہے ہیں۔ شہر کے علمی و ادبی تہذیبی و ثقافتی اداروں سے وابستہ لوگ جانتے ہیں کہ درویش غیاث الدین کس کس انداز سے علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی اداروں کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ اُن سے گفتگو کیجئے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے لبوں سے پھول جھڑ رہے ہیں ان کی شخصیت ہمیشہ آداب گفتگو اور سلیقہ اظہار کی ترجمانی کرتی رہتی ہے گفتگو چاہے شخصی ہو کہ فون پر، اُن کے لب و لہجے میں مٹھاس رہتی ہے کبھی ظاہر ہی نہیں ہوتا کہ وہ کسی سے ناراض ہیں یا خفا ہیں ٹھنڈے دل و دماغ کے انسان ہیں انہیں اپنے غیر مختتم کاروبار کی وجہ سے بہت کم موقعہ ملتا ہے کہ وہ اپنے احباب کے ساتھ تھوڑا بہت وقت گذاریں لیکن اس کے باوجود ذہنی تھکن دور کرنے اور اپنے لطیف جذبہ کی تسکین کے لئے شعر و نغمہ کی محفلوں میں کبھی کبھی دکھائی دیتے ہیں۔ تہذیبی پروگرامس میں کبھی صدر محفل تو کبھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے زینت محفل بنے رہتے ہیں بعض محفلوں میں صرف ایک عام آدمی کی طرح کسی ایک نشست پر بیٹھ جاتے ہیں۔ غرور، تکبر نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں ہے ان

کی ساری زندگی مثبت سرگرمیوں میں گذر رہی ہے کچھ دینی کتابوں کی
اشاعت کا بھی انتظام کرتے ہیں اور مفت تقسیم کرتے ہیں۔ میں
نے محسوس کیا ہے کہ ان کے مصروف ترین اوقات میں بھی کچھ اہل غرض
ان سے ملنے کے لئے چلے آتے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا ہوگا کہ
انہوں نے کسی سے ملاقات نہ کی ہو۔ یا ان کی آمد سے وہ بیزار
ہوئے ہوں۔ درویش غیاث الدین سے میرا برسوں کا یارانہ ہے
ان سے تجدید دوستی ہاشم حسن سعید کی مرہون منت ہے۔ بعض خاص
ادبی و تہذیبی تقاریب میں درویش غیاث الدین سے ملاقات ہوتی
رہتی ہے۔ ہمارے شہر کے صف اول کے شہریوں میں وہ ایک وی۔
آئی۔ پی کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں اگر سال بھر میں کبھی ملاقات
نہ بھی ہو تو ان سے راج بھون کی تہذیبی تقاریب میں لازماً ملاقات
ہو جاتی ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ راج بھون کی جانب سے منعقدہ
افطار پارٹی میں ان سے ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔ میں نے راج بھون
کی تقاریب میں دیکھا ہے کہ درویش غیاث الدین صاحب سے
معاشرے کے اہم اہم لوگ جو زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے
ہیں ملاقات کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اور درویش غیاث
الدین کی پرکشش شخصیت کے اسیر ہو جاتے ہیں۔ درویش غیاث الدین
رئیس اختر کے بھی بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں ــــ ہاشم
حسن سعید غیاث کے نہ صرف یونیورسٹی کے ساتھی ہیں بلکہ اسکول کے بھی

ساتھی ہیں۔ ہاشم کہتے رہتے ہیں کہ غیاث اسکول کے تعلیمی دور میں بھی نہایت ذہین و فطین طالب علم رہے ہیں اور اپنے تمام تعلیمی کیریئر میں امتیازی مقام حاصل کرتے رہے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں تحریری و تقریری اور بیت بازی کے مقابلوں سے دلچسپی رکھتے تھے مختلف کالجس کی تقاریب میں شریک رہتے تھے خاص طور پر مختلف کالجس کی سالانہ تقاریب میں شریک رہتے تھے۔ درویش غیاث الدین جہاں بے شمار اہلِ غرض، حاجت مندوں کی مدد کرتے ہیں وہیں وہ تہذیبی پروگراموں کی صورت گری کے لیے بھی اعانت کرتے ہیں اس کے علاوہ شہر کے بہت سے ہفت روزہ جریدوں کی اپنی کمپنی کے اشتہاروں کے ذریعہ تعاون کرتے ہیں۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال مدیر شگوفہ اور مدیر خوشبو کا سفر صلاح الدین نیر ان کے شخصی دوست ہیں یا پابندی ان رسائل میں ہر ماہ اُن کی کمپنی کے اشتہار شائع ہوتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اخبارات اور ٹی وی کے اشتہار کے مقابلہ میں ادبی رسائل میں اشتہار دینا ان کے لئے کچھ زیادہ تشہیر کا باعث نہیں رہتا اس کے باوجود وہ دوستی اور دوست نوازی کے شریفانہ عمل کی پاسداری کرتے ہیں۔

معاشرہ میں جو لوگ فراخ دلی کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلاتے رہتے ہیں ان کی محبتوں کی، ان کی مروتوں اور ان کی انسانیت دوستی کی خوشبو چاروں طرف پھیل جاتی ہے۔ درویش غیاث الدین صحنِ گلشن میں رنگ برنگی پھولوں کے درمیان اپنی مخصوص پہچان کے ساتھ پاکیزہ صاف

معاشرہ کا ایک حصہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی شائستگی، ان کے رکھ رکھاؤ اور ان کے بہترین سلوک کی شہرت ان کے اپنے مخصوص حلقۂ احباب اور کاروباری لوگوں کی حدود سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ ان کا شمار شہر کے صاحبِ ثروت لوگوں میں ہوتا ہے لیکن ان کے اندازِ گفتگو سے اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ان کے آفس کا ماحول نہایت صاف ستھرا اور سلیقے کا مظہر ہے۔ ہر شخص اپنے کام میں نہایت ذمہ داری و فرض شناسی کے ساتھ سرگرم عمل رہتا ہے اہلِ خاندان تو ان کے اپنے ہی ہیں اپنے ملازمین کے ساتھ بھی ان کا سلوک نہایت مخلصانہ، منصفانہ، ہمدردانہ اور خوشگوار رہتا ہے جو لوگ عملی زندگی میں دیانت داری کے ساتھ مصروف رہا کرتے ہیں وہ کبھی بھی اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہتے کامیابی کی منزل اس طرح کے راہ رووں کا فراخ دلی کے ساتھ خیر مقدم کرتی ہے۔ درویش غیاث الدین جیسے لوگ جن راہوں سے بھی گزرتے ہیں اُن راہوں کے پتھر بھی پھول بن جاتے ہیں۔ مہذب معاشرہ اس طرح کے لوگوں کا بے چینی سے منتظر رہتا ہے اور ان کے استقبال کے لئے پیش پیش رہتا ہے نیک نامی، بہترین شہرت، اللہ کے خاص بندوں کے حصہ میں آتی ہے غیاث الدین صاحب خوش نصیب ہیں کہ خدا ان پر پوری طرح مہربان ہے تب ہی تو ان کی زندگی کا سفر خوشبو کے سفر کی طرح جاری ہے۔ جی چاہتا ہے کہ غیاث الدین جیسے نفیس لوگوں سے مسلسل رابطہ باقی رہے لیکن شعر و ادب اور کاروباری و تجارتی دنیا کے درمیان بہت بڑا فاصلہ رہتا ہے

ہیں کبھی غیاث الدین جیسے باوقار معتبر اور پُر اثر شخصیتوں کی محبت میں گرفتار رہتا ہوں۔ اگر رشتے خلوص اور محبت پر مبنی ہوں تو وہ ہمیشہ خوشبو سے بہاراں کی طرح مہکتے رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ درویش غیاث الدین کا جن جن سے بھی رشتہ خلوص و مروت باقی ہے وہ یقیناً اپنی کامیاب زندگی گذار رہے ہوں گے۔ مطمئن زندگی ہر انسان کے لئے قدرت کا خاص عطیہ ہوتی ہے خدا نے غیاث الدین صاحب کو زندگی کی تمام جائز خوشیوں سے سرفراز کیا ہے اور یہ سلسلۂ خیر و برکت تاحیات جاری رہے گا اور وہ نیک نامی کے ساتھ معاشرہ میں سانس لیتے رہیں گے جس طرح کہ اب لے رہے ہیں

درویش غیاث الدین صاحب ۱۱ر اگست ۱۹۳۸ء کو حیدرآباد کے محلے کشل ہنڈی میں پیدا ہوئے ان کے والد درویش محمد عبد الحمید صاحب مرحوم اور تایا جناب درویش محمد عبد الرؤف صاحب مدراس کے ضلع شمالی ارکاٹ کے وانمباڑی سے ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد آئے تھے اور یہاں پر چینا نیلگری لجی ایمپوریم کے نام سے معظم جاہی مارکٹ پر چاٹے کی پتی کی دوکان کھولی جو بتدریج ترقی کرتی گئی۔ جناب درویش عبد الحمید صاحب کا ۱۹۴۸ء میں اور جناب درویش محمد عبد الرؤف صاحب کا ۱۹۵۰ء میں انتقال ہو جانے پر درویش غیاث الدین اور ان کے برادران کی پرورش اور نگرانی ان کے ماموں خطیب محمد عبد الوحید صاحب نے کی۔ جناب درویش غیاث الدین کی ابتدائی تعلیم مدرسہ گوشہ محل ہنومان ٹیکری اور

ہائی اسکول کی تعلیم نامپلی ہائی اسکول میں ہوئی۔ انہوں نے انٹرمیڈیٹ
سٹی کالج سے اور بی ایس سی عثمانیہ یونیورسٹی سے کیا۔ ان کے اسکول اور
کالج کے ساتھیوں میں جناب کے پربھاکر ریڈی سابق وزیر داخلہ
آندھرا پردیش۔ جناب احمد جلیس مرحوم۔ جناب ہاشم حسن سعید سابق
پرنسپل کالج آف لنگویجس، جناب یوسف الدین فاضل ڈاکٹر امریکہ
جناب مسعود الرب انجینئر امریکہ ہیں غیاث الدین بہت ذہین طالب علم
رہے ہیں۔ تعلیم کے بعد انہوں نے ۱۹۵۹ء میں بزنس شروع کیا اور
بفضل تعالیٰ ۴۳ سال سے بزنس میں ہیں۔ ان کے دو چھوٹے بھائی اسمٰعیل احمد
اور رشید احمد بھی بزنس میں ان کے ساتھ ہیں۔ گذشتہ دس سال سے ان کے
دو لڑکے درویش حمید الدین شاہد۔ لطیف الدین خالد اور ان کے بھتیجے
رشید الدین حامد اور رئیس الدین ماجد بھی اب ان کے ساتھ ہیں۔ جناب
درویش غیاث الدین گذشتہ ۲۵ سال سے آندھرا پردیش ٹی مرچنٹ
اسوسی ایشن کے صدر ہیں اور ابھی حال میں ان کو آل انڈیا فیڈریشن
کا سینئر نائب چیرمین منتخب کیا گیا ہے اور وہ آئندہ سال فیڈریشن
کے چیرمین کا عہدہ سنبھال لیں گے۔ ان کی چائے کے دو برانڈ لاما چائے
اور لسا چائے بفضل تعالیٰ ہندوستان اور بیرون ملک میں کافی مشہور ہیں
بفضل تعالیٰ ہول سیل بزنس میں بھی آج ان کا نمبر پہلا ہے ان کی کمپنی
کی طرف سے ہر سال رمضان المبارک کے موقع پر دینی کتب شائع کرا کر
مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ ماہ ربیع الاول میں سلام

سروں کا ئینات کے پرچے بھی طبع کروا کر مفت تقسیم کرتے ہیں ان کی کمیٹی کی جانب سے گزشتہ دس سال سے ہائی اسکول کے لڑکے لڑکیوں کے لئے معلوماتی کوئیز مقابلے منعقد کئے جاتے ہیں اور جیتنے والے لڑکے لڑکیوں میں انعامات اور تحفے تقسیم کئے جاتے ہیں ۔ جناب درویش غیاث الدین کو کافی ایوارڈس حاصل ہو چکے ہیں ۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما ۔ گورنر آندھرا پردیش ۔ چیف منسٹر آندھرا پردیش مسٹر چندرا بابو نائیڈو اور کئی نامور سیاست دانوں کے ہاتھوں انھیں ایوارڈز ملے ہیں جناب درویش غیاث الدین کے ایک فرزند درویش رؤف الدین ساجد امریکہ میں ڈاکٹر ہیں گزشتہ ۵ سال قبل جناب درویش غیاث الدین کی ہائی پاس سرجری امریکہ میں ہو چکی ہے اور اب وہ بفضل تعالیٰ صحت مند اور چاق و چوبند ہیں ۔ جناب درویش غیاث الدین کے داماد سعودی عرب ریاض میں ڈاکٹر ہیں ۔ میری دعا ہے کہ پروردگار عالم ان برادران کے اہل خاندان پر ہمیشہ مہربان رہے اور اسی طرح نور و نکہت سے اُن کا دامن بھرتا رہے ۔

اثر غوری

نئی فکر اور نئے لب ولہجے کے باشعور شاعر

پوری ہنر مندی کے ساتھ اپنی فکر و خیال کی تازگی کو محسوس کرنے والے اور نئے لفظوں کو اپنے اشعار میں سلیقے سے برتنے والے یوں تو بہت سے شاعر مل جائیں گے لیکن کم استعمال کئے جانے والے الفاظ کو شعری زبان دینے والے کم ہی ملیں گے ۔ اس طرح کے شاعروں میں میں نے حیدرآباد میں اثر غوری کو بھی دیکھا ہے ۔ اثر غوری اپنی طرز کے نمائندہ شاعر ہیں ۔ اثر غوری کی شاعری میں معاشرہ کے ایسے مسائل جو فی الفور بہت زیادہ توجہ چاہتے ہیں ــــــــــــ نہایت عمدگی کے ساتھ اپنے شعری پیکروں میں ڈھالتے ہیں ۔ ان کی شاعری میں روزمرہ کے مسائل اپنے اصلی رنگ و روپ میں ملیں گے ان کے اشعار میں بعض مقامات پر کچھ ایسے الفاظ بھی دکھائی دیتے ہیں جو عام طور پر شعری زبان سے تعلق نہیں رکھتے اور جو سننے اور پڑھنے میں غیر شاعرانہ معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ ان کے پاس بھرپور معنویت کے

ساتھ جلوہ گر رہتے ہیں۔ ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کا سرچشمہ ان کا کلاسیکی شعری ادب رہا ہے۔ ان کے استاد محترم علامہ نجم آفندی خود ایک اعلیٰ درجہ کے کلاسیکی شاعر تھے۔ اثر غوری علامہ نجم آفندی کا نام روشن کرنے والے شاگرد کی حیثیت سے اچھا خاصا نام کما چکے ہیں ان کا کلام سننے کے لئے سامعین منتظر رہتے ہیں۔ اثر غوری کا تا حال صرف ایک ہی مجموعۂ کلام "بوند بوند روشنی (۱۹۸۳ء) میں شائع ہوا ہے اس مجموعہ کے بعد انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ اگر وہ مزید مجموعے شائع کرنا چاہیں تو ۲، ۳ مجموعے بہ یک وقت شائع کر سکتے ہیں۔ اثر غوری آر۔ ٹی۔ سی میں کنٹرولر کی خدمت پر فائز تھے۔ اُن کی ساری ملازمت اضلاع میں رہی۔ جس کی وجہ سے وہ حیدرآباد کے بڑے بڑے مشاعروں سے بہت دور رہے۔ شہر کے مشاعروں میں کم کم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ اِدھر کچھ برسوں سے بعض اہم مخصوص محفلوں میں شرکت کرنے ہو گئے اپنے بہترین کلام کے جوہر دکھلا رہے ہیں خاص طور پر ادارہ میرا شہر میرے لوگ، سوغاتِ نظر، ایوان پرنس معظم جاہ شجیع، خورشید احمد جامی میموریل اکیڈیمی اور بزم جوہر کے ادبی و شعری مخصوص محفلوں میں لازمی طور پر شرکت کرتے ہیں۔ اضلاع کے مشاعروں میں بھی مدعو رہتے ہیں۔ چاہے وہ طرحی مشاعرے ہوں کہ غیر طرحی اپنے بہترین کلام کا بھرپور تاثر چھوڑ جاتے ہیں۔ اثر غوری شہر کے ایک کہنہ مشق اور سینئر شاعروں میں ایک منفرد و اہم مقام بنا چکے ہیں اکثر مشاعرو

ہیں کہیں صدر تو کہیں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جلوہ افروز رہتے ہیں
باطن کی طرح ان کا ظاہر بھی پاک و شفاف ہے ان کا لباس بھی شرکائے
محفل کو متاثر کرتا ہے شاندار سوٹ پہنتے ہیں پینٹ شرٹ
میں بھی دکھائی دیتے ہیں خاص خاص موقعہ پر شیروانی زیب تن
کئے ہوئے نظر آتے ہیں نفیس، باسلیقہ اور ہنر مند شخص کی
حیثیت سے اپنے دوستوں میں شہرت رکھتے ہیں شہر کے بہت سے
شاعروں سے ان کے روابط ہیں اس کے باوجود بہت کم شاعروں سے
بے تکلف رہتے ہیں۔ البتہ اپنے خاص خاص دوستوں سے کھل کر
ملتے ہیں۔ مزاج میں ظرافت ہے لطائف کہتے ہیں، لطائف سن کر
بے ساختہ ہنستے ہیں اور بعض حضرات لطیفوں میں کچھ لفظوں کو
اس طرح جوڑ دیتے ہیں کہ وہ لطیفہ دو آتشہ ہو جاتے ہیں۔ اثر
غوری کو میں نے کبھی اداس نہیں دیکھا۔ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ کئی
برس پہلے جام و مینا کی رفاقت نے انہیں کافی بگاڑ دیا تھا۔ اس زمانے
میں ان کا رویہ دوستوں کے ساتھ اور معاشرہ کے بہترین لوگوں کے
ساتھ بھی قابل اعتراض رہا کرتا تھا۔ بلا کے مے نوش تھے۔ خدا کا
کچھ ایسا کرم ہوا کہ انہوں نے یک لخت مے کشی ترک کر دی۔ اثر غوری
سے میں زائد از ۴۰ برس سے واقف ہوں۔ پرانا شہر کے مشاعروں
خاص طور پر علامہ نجم آفندی کی زیر نگرانی ہونے والے مشاعروں میں
کلام سناتے تھے۔ میں بھی ان مشاعروں میں کلام سناتا تھا۔ اثر غوری

کی ابتدائی شاعری کا یہی انداز کی شاعری تھی متقدمین کی شاعری میں جو مرکزی
مسائل نمایاں تھے اور یہی نہیں بلکہ تقلید کیا کرتے تھے عام شاعروں کی طرح
کلاسیکی طرز کی شاعری کیا کرتے تھے لیکن ادھر ۳۰، ۳۵ برس سے ان
کا شاعرانہ لب و لہجہ بالکل بدل گیا ہے قدیم اسلوب بالکلیہ ترک
کر چکے ہیں۔ اثر غوری کی شاعری کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو یہ اندازہ
ہوگا کہ ان کا کوئی شعر بھی بھرتی کا نہیں ہوتا۔ ہر شعر میں کچھ ایسی بات
کہہ جاتے ہیں کہ تمام سامعین چونک پڑتے ہیں اور یہ محسوس کرتے ہیں
کہ یہ اشعار تو ہمارے دل کی بات کے ترجمان ہیں۔ جن لفظوں کو
شاعروں نے استعمال نہیں کیا ان لفظوں کو اثر غوری نے سلیقے کے ساتھ
اس طرح استعمال کیا ہے کہ لفظ و معنی کی نوعیت ہی بدل گئی۔ مجھے
اثر غوری کی شاعری اس لئے بھی پسند ہے کہ انہوں نے شاعری تفریحاً
نہیں کی۔ اثر غوری کا کلام ملک کے ادبی رسالوں کے علاوہ شہر کے اہم
اخبار سیاست میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کی شخصیت اور شاعری
کو ایک ساتھ خراج پیش کیا جا رہا ہے۔ مجھے اثر غوری کو بعض ایسے
اضلاع کے مشاعروں میں بھی سننے کا اتفاق ہوا جہاں وہ اپنی مدہوشی
سے مشاعرہ کی خوشگوار فضا کو ـــ بگاڑ دیتے تھے۔ مجھے اس سلسلے
کا ۱۵ برس پہلے ضلع سنگا ریڈی میں ـــ منعقدہ ایک مشاعرہ یاد
آرہا ـــ ہے۔ ممتاز صحافی انور ادیب نے مشاعرہ کا اہتمام کیا
تھا مشاعرہ میں کلکٹر ضلع کے علاوہ مختلف محکموں کے اعلیٰ عہدہ دار بھی

موجود تھے۔ اثر غوری نے اس مشاعرہ میں کچھ زیادہ ہی پی لی تھی۔ مجھے اس وقت اثر غوری کی حالت دیکھ کر بے حد افسوس ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچتا تھا کہ اتنا اچھا شاعر کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہے۔ اس وقت میں نے یہ بھی غور کیا کہ اگر یہ شاعر مے نوشی ترک کر دے اور آداب مشاعرہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے دوسرے شاعروں کی طرح مشاعروں میں شرکت کرتا رہے تو یہ شاعر بہت شہرت پا سکتا ہے۔ میں نے اثر غوری کو اس وقت اپنی محفلوں میں مدعو کرنا شروع کیا جب وہ جام و مینا سے اپنا رشتہ توڑ چکے تھے اب وہ ہمارے مشاعروں کے اتنے قریب ہو گئے ہیں کہ ان کے بغیر مشاعروں میں لطف بھی نہیں آتا۔ اثر غوری ہمارے مشاعروں میں لازمی شاعر کی حیثیت سے مدعو کئے جاتے ہیں وہ ہر مشاعرہ میں اکثر دفعہ نئی غزل سناتے ہیں۔ لیکن ان کی پرانی غزلیں بھی لطف دے جاتی ہیں۔ غزلیں معیاری ہوتی ہیں دوبارہ سننے پر نئی معلوم ہوتی ہیں۔ اگر کوئی سامع مشاعرہ میں اونگ بھی رہا ہو تو وہ اثر غوری کی غزل کے مطلع پر ہی چونک جاتا ہے اور اس کی نیند اڑ جاتی ہے پوری طرح متوجہ ہو جاتا ہے۔ اثر غوری کی غزلوں کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے وہ اپنی کہی ہوئی بات کو دہراتے نہیں ہر بات نئی کہتے ہیں اور سلیقے سے کہتے ہیں عموماً ہمارے شعراء طرحی غزلیں کہنے سے گریز کرتے ہیں لیکن اثر غوری اپنی طرحی غزلوں سے بھی شرکائے محفل کو متاثر کر دیتے ہیں۔ اثر غوری نے

جامعہ عثمانیہ سے اُردو میں درجۂ اول میں ایم اے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کے تمام بچے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ان کی شریکِ حیات شعبۂ درس و تدریس سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کے گھر کا ماحول علمی، دینی اور ادبی ہے اضلاع کے مشاعروں میں اثر غوری کا ساتھ رہتا ہے ہم ۵، ۶ ہم خیال شاعر ذریعہ کار اضلاع کے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اثر غوری اضلاع کے مشاعروں میں کافی پسند کیے جاتے ہیں۔ موٹر کار کا سفر خوشگوار رہتا ہے ہنستے ہنساتے سفر طئے ہوتا ہے کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے دورانِ سفر ایک دوسرے کو اپنا کلام سنایا ہو۔ البتہ شعروادب کے موضوع پر گفتگو ہوا کرتی ہے لیکن زیادہ وقت تفریحی موڈ میں گزر جاتا ہے۔ اثر غوری کا کلام آل انڈیا ریڈیو سے ہی نہیں، دور درشن کے ذریعہ بھی ادب دوست خواتین و حضرات تک پہونچ جاتا ہے۔ شعر نحت میں سناتے ہیں۔ سنانے کا انداز متاثر کن ہوتا ہے۔ محفل پر چھا جاتے ہیں شہر کے تمام اہم دانشوروں، شاعروں ادیبوں اور صحافیوں سے ان کے مراسم ہیں۔ شہر کے مہذب شہریوں میں ان کا شمار ہوتا ہے شہر کے نمائندہ مشاعرے پڑھتے ہیں۔ کئی ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں۔ راج بھون میں گورنر صاحب کی دعوت پر مشاعرہ پڑھنے کے علاوہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما کو بھی اپنا کلام سنا چکے ہیں وہ ایوانِ اردو اور انجمن ترقی اردو کے تمام مشاعروں میں مدعو رہتے ہیں مشاعروں میں وقت پر آتے ہیں اور اختتامِ محفل

تک موجود رہتے ہیں۔ اپنا بہترین کلام سنانے میں دوسرے شاعروں کا کلام توجہ سے سنتے ہیں چائے کم پیتے ہیں مگر پان زیادہ کھاتے ہیں۔ عام طور پر پان میں زردہ زیادہ استعمال کرتے ہیں ہم مشورہ دیا کرتے ہیں کہ اس زہر سے اجتناب کریں ـــــ

اثر غوری ایک پسندیدہ شاعر ہیں اور یقین ہے کہ وہ تادم حیات اہم شاعر ہی رہیں گے۔ وہ ایک مقبول شاعر ہوتے ہوئے بھی اپنے ابتدائی دور کے غیر شہرت یافتہ شاعروں سے بھی ملتے رہتے ہیں۔ اثر غوری کا یہ بھی کمال ظرف ہے اور یہ ان کے کردار کی بلندی ہے کہ وہ اپنے قدیم دوستوں سے کنارہ کش نہیں ہیں لیکن وہ علامہ اقبال کے اس شعر سے بھی متفق ہیں۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

حسن فرخ

(ذہین و فطین شاعر، ادیب و صحافی)

کشمکش حیات نے نہ جانے کتنے لوگوں کو مختلف النوع حالات اور سخت ترین امتحانات سے دوچار کیا ہوگا۔ ویسے بھی ہر شئے یوں ہی حاصل نہیں ہوتی۔ کسی شئے کو پانے کے لیے ہر انسان کو میدانِ عمل میں اپنی پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف قسم کے حالات سے گذرنا پڑتا ہے اپنے بہترین مستقبل کو سنوارنے کے لیے ہر انسان کو دھوپ چھاؤں، اجالوں، اندھیروں، آسائشوں، پریشانیوں، راحتوں تلخیوں، سہولتوں، دشواریوں، صبح و شام کی کئی الجھنوں اور چاند کی نرم نرم چھاؤں اور سورج کی تمازت سے سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے۔ اگر کوئی انسان مشکل سے مشکل حالات کا سامنا کرتے ہوئے زندگی کے نشیب و فراز کو اپنا ہم سفر بنا لیتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی زندگی میں جتنی مشکلیں شامل رہیں گی اتنی ہی آسانیاں اس کے قدم چومیں گی۔ اپنی محنت، شاقہ

اور اپنی عملی جستجو سے اوبالوں کا سفر طے کرنے والے بہت ہی کم پائے جاتے ہیں جو مطمئن زندگی گذارتے ہیں۔ ایسے حالات سے نبرد آزمائی کرنے والے لوگ اپنی زندگی کے سفر میں کسی سایہ دار درخت کی تلاش میں رہنے کے بجائے حالات کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔
اسی طرح کے بعض شناسوں اور دیدہ وروں میں ایک نام حسن فرخ کا ملتا ہے جو ایک بہترین شاعر و ادیب اور ایک نامور صحافی کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ اپنے حلقہ احباب میں بھی اپنی میانہ روی اور صلح کل طریقۂ زندگی کی وجہ سے پسند کیے جاتے ہیں۔ حسن فرخ نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بہت ہی نامساعد حالات میں کیا لیکن معاشی حالات کی بہتری کے لیے انہوں نے بہت محنت کی ہے۔ زندگی کی کٹھن پُرپیچ راہوں سے ان کا گذر ہوا ہے۔ شاعری کی حیثیت سے ان کی اپنی پہچان بنانے کے لیے شہر کے ایک حلقۂ جدید نے جو بعد میں "حلقہ" کے نام سے شہرت پا گیا، بڑا سہارا دیا۔ لیکن یہ سہارا صرف وابستگی کی حد تک ہی رہا۔ اگر کسی قلم کار میں خداداد صلاحیت موجود ہو تو صرف سہاروں پر اس کی شہرت کا دارومدار نہیں رہتا۔ حسن فرخ کو اردو روزنامہ رہنمائے دکن سے ربطِ خاص کی وجہ سے صحافتی، شعری و ادبی، علمی و ثقافتی میدانوں میں قدم بڑھانے کے مواقع ملتے رہے۔ صحافت کی دنیا میں ایک بہترین صحافی کی حیثیت سے اپنا مقام بنا لیا۔ کئی برس تک رہنمائے دکن سے وابستہ رہے۔ جہاں تک شعر و ادب کی سرگرمیوں کا تعلق ہے حسن فرخ صاحب نے

اپنے ایک مخصوص حلقے سے رشتہ رکھنے کے باوجود شہر کے تقریباً تمام مکتبِ خیال کے شاعروں، ادیبوں سے اپنے مراسم کو استوار رکھا۔ شہر کی بعض ادبی انجمنوں اور اداروں کی سرگرمیوں میں جب کبھی ضرورت محسوس کی گئی حصہ لیتے رہے۔ حسن فرخ صاحب جیسے شہر کے بعض نوجوان شاعروں کو نامور شاعر و صحافی جناب سلیمان اریب کی سرپرستی سے بھی بڑا حوصلہ دیا۔ وہ انہیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو متحرک کرنے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مخدوم محی الدین اور خورشید احمد جامی کی شخصیت اور شاعری سے متاثر ہونے والے نوجوان شاعروں نے بھی شعری ادب میں اپنا نام کمایا ہے۔ ایک ایسا شاعر و ادیب جو اپنے دور کے ادبی و تہذیبی تقاضوں کو پورا کرتا ہو اس کو میدانِ شعر و ادب میں اپنا مقام بنانے میں کچھ زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔ رہنمائے دکن کے مدیر اعلیٰ جناب لطیف الدین قادری نے ان کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی میں کوئی کمی نہیں کی۔ وہ حسن فرخ کی صحافتی صلاحیتوں کے معترف تھے جبکہ حسن فرخ نے صحافتی میدان میں پہلا قدم رکھا تھا۔ چھٹی دہائی میں حیدرآباد میں نئے لکھنے والے نوجوانوں کا ایک حلقہ افقِ شعر و ادب پر نمودار ہو رہا تھا۔ اسی زمانے میں مشہور افسانہ نگار اعظم راہی کا ماہنامہ "پیکر" شائع ہونا شروع ہوا تھا جس میں حیدرآباد کے نوجوان شاعر و ادیب کی تخلیقات خصوصیت کے ساتھ شائع ہوتی تھیں "پیکر" کا ابتدائی آفس جنرل پوسٹ آفس عابڈس سے متصل عمارت کے ایک کمرے میں تھا اس کے بازو ہی احمد علی و آصف علی صاحب کا ایک بہت بڑا اسٹال

تھا جہاں ملک بھر کے ادبی رسائل موجود رہتے تھے۔ شام سے آدھی رات تک قدیم و جدید شاعروں، ادیبوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ میں بھی اُس بک اسٹال پر اکثر سرِ شام جایا کرتا تھا وہاں قدیم و جدید قلمکاروں اور صحافیوں سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہاں حسن فرخ صاحب سے بھی ملاقات ہو جاتی تھی میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں "پیکر" میں بھی میری غزلیں شائع ہوتی تھیں۔ انہی دنوں جدید قلمکاروں کی جانب سے گاندھی بھون تھیٹر میں ایک یادگار ادبی تقریب منعقد ہوئی تھی جس میں مشاعرہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا اُس دور کے نوجوان شاعروں کے ساتھ میں نے بھی اپنا کلام سنایا تھا۔ اس تقریب کے سلسلے میں ایک سوینیر بھی شائع ہوا تھا جس کے سرورق پر منتخب قلمکاروں کے دستخط ثبت تھے اس سرورق پر بھی میرا نام تھا۔ جناب حسن فرخ نے ۱۹۶۰ء میں "۳ نگینے" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی جس میں میری غزل بھی شامل تھی۔ حسن فرخ اپنی ابتدائی شاعری کے زمانے میں بہت زیادہ سرگرم عمل رہے۔ جب جدید شاعروں نے حیدرآباد لٹریری فورم (حلف) کے نام سے ایک ادبی انجمن کا قیام عمل میں لایا تو اس کے بانیوں میں حسن فرخ بھی شامل رہے مختلف اوقات میں حلف کے سکریٹری اور نائب صدر بھی رہے اب بھی حلف سے ان کی وابستگی برقرار ہے۔ حسن فرخ جب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش سے وابستہ ہوئے تو شہر کے بہت سے شاعروں ادیبوں سے ان کے مراسم بڑھنے لگے۔ ڈائرکٹر اردو اکیڈیمی جناب چندر سریواستو

کے زمانے جب پی آر او کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اردو اکیڈیمی کی قدیم و جدید سرگرمیوں سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ اکیڈیمی کے خوشگوار و ناخوشگوار حالات کے زمانے میں اپنی پوزیشن پر کسی قسم کا حرف آنے نہیں دیا۔ بلکہ اپنی حکمت عملی سے سربراہان اکیڈیمی کے ساتھ تعاون کیا۔ خالص ادبی و سیاسی نوعیت کی خط و کتابت کے ذریعہ اُن کی مدبرانہ تحریروں نے اکیڈیمی کی بہترین خدمت کی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ساری اہم مراسلت کی صورت گری میں حسن فرخ صاحب ہی نمایاں رول ادا کرتے ہیں۔ ذمہ داران اردو اکیڈیمی ان کے مسودات کو بہ جنسہٖ منظور کرتے ہیں یا جزوی ترمیم کے ساتھ۔ اردو اکیڈیمی سے اپنی مستقل وابستگی کے باوجود بھی وہ رہنمائے دکن کے مدیر جناب وقار الدین کی وقتاً فوقتاً معاونت کرتے رہتے ہیں۔ آج بھی وقار الدین صاحب سے اُن کے دوستانہ مراسم ہیں۔ اردو اکیڈیمی میں آنے والا ہر شاعر و ادیب حسن فرخ صاحب سے لازماً ملاقات کرتا ہے میں خود بھی جب کبھی اکیڈیمی جاتا ہوں تو حسن فرخ صاحب سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

اکیڈیمی سے میری وابستگی بہت دیرینہ ہے جب اکیڈیمی کا قیام ستمبر ۱۹۷۶ء عمل میں لایا گیا تو جناب عابد علی خان صاحب مدیر "سیاست" صدر نشین مجلس عاملہ، ریاستی وزیر قانون جناب آصف پاشاہ صدر اکیڈیمی اور جناب بھارت چند کھنہ ریٹائرڈ آئی اے ایس سکریٹری اکیڈیمی تھے۔ اُن دنوں اکیڈیمی کا آفس سکریٹریٹ کے قریب اے جی آفس کے سامنے واقع

تجارت میں تھا عابد علی خان صاحب کی خواہش پر اکیڈمی میں اُس وقت کام کرنے والے اہل کاروں کی دفتری کام کے سلسلے میں میں مدد کرتا رہا ہوں اکیڈمی کے آفس کو بیچ کے دوران جایا کرتا تھا۔ میں ۱۹۹۲ء میں رکن بورڈ آف گورنر رہا ہوں۔ مسعود دین سالم کی ڈائرکٹری اور جلیل پاشاہ صاحب کی صدر نشینی کے زمانے میں اکیڈمی میں میرا آنا جانا کچھ زیادہ ہی رہتا تھا۔ جلیل پاشاہ ہر ادبی تقریب میں مجھے خصوصیت کے ساتھ مدعو کرتے تھے۔ ان کے زمانے میں بہت سی ادبی تقاریب کے موقعہ پر وہ مجھ سے مکمل تعاون حاصل کرتے تھے۔ حسن فرخ صاحب سے میری رسم و راہ اُردو اکیڈمی سے اُن کی وابستگی سے بہت پہلے کی ہے ہم دونوں نے شہر کے کئی مشاعرے ایک ساتھ پڑھے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حسن فرخ صاحب مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے تھے۔ اب بھی وہ مخصوص اور اہم مشاعروں ہی میں اپنی شرکت پسند کرتے ہیں۔ حسن فرخ کے حلقہ احباب میں شہر کے تقریباً تمام شاعر و ادیب شامل ہیں وہ ہر شاعر و ادیب سے اُن کے مراتب کو ملحوظ رکھتے ہوئے روابط رکھتے ہیں۔ ملاقاتیو اور دوستوں کے درمیانی فرق کو وہ محسوس کرتے ہیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اکیڈمی کے مختلف اجلاسوں میں میری شرکت کے لئے حسن فرخ معاون رہے ہیں۔ شاعروں کے مسودات اور مطبوعات کی کمیٹیوں میں میری شمولیت اور جج کی حیثیت سے میری خدمات کے لیے حسن فرخ صاحب دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ حسن فرخ صاحب سے میرے دیرینہ دوستانہ مراسم ہیں۔

میری شعری و ادبی سرگرمیوں کے علاوہ وہ میرے دوستانہ مراسم کو بھی اہمیت دیتے رہے ہیں۔ زندگی کے مختصر و طویل سفر میں بہت سے ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو یاد بھی رہتے ہیں اور نہیں بھی۔ میں سکریٹریٹ میں اپنی ملازمت کے دوران اپنے بہت سے دوستوں اور کرم فرماؤں کی کارروائیوں کے سلسلے میں تعاون کرتا رہا ہوں۔ حسن فرخ صاحب ایک دن ایک قدیم اور اہم جی۔ او کی حصولی کے لیے سکریٹریٹ آئے تھے۔ وہ جی۔ او جنرل اڈمنسٹریشن ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ حسن فرخ صاحب سے ان دنوں میری سرسری ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ویسے بھی میں کسی شخص کے ساتھ مراسم کی بنیاد پر تعاون نہیں کرتا تھا۔ اگر کوئی اجنبی شخص بھی مجھ سے سکریٹریٹ کے کسی بھی محکمہ سے متعلق کارروائی کے سلسلے میں تعاون کی خواہش کرتا تو میں بلا تامل مدد کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ میرے توسط سے اگر کسی شخص کی مدد ہو جاتی تو مجھے خوشی ہوتی تھی۔ حسن فرخ صاحب سکریٹریٹ پہونچنے کے بعد میرے سکشن (پنچایت راج ڈپارٹمنٹ) میں آئے اور مجھ سے اس جی۔ او کی فراہمی کے لیے خواہش کی۔ انھوں نے کہا کہ میرے کسی عزیز کو ان کی ملازمت کے سلسلے میں اس جی۔ او کی سخت ضرورت ہے اس جی او کی کاپی حاصل کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ میں آپ سے تعاون چاہتا ہوں۔ میں فوراً حسن فرخ صاحب کو اپنے ہمراہ لے کر جی اے ڈی پہونچا۔ حسن اتفاق سے متعلقہ سکشن آفیسر جو علاقہ آندھرا سے تعلق رکھتا تھا میرا

درست تھا۔ اُس نے کافی تلاش کے بعد مطلوبہ جی او کی کاپی فراہم کی۔ حسن فرخ صاحب نے اس جی او کی کاپی پا کر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ جب کبھی کسی ادبی حلقہ میں مجھ سے متعلق مثبت یا منفی نوعیت کی گفتگو ہوتی ہے تو حسن فرخ صاحب میرے اس تعاون کا ضرور تذکرہ کرتے ہیں یہ بات اکثر دفعہ انہوں نے مجھ سے کہی۔ حسن فرخ صاحب ادبی حلقوں میں ایک متوازن طبیعت کے حامل قلمکار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اکیڈیمی میں اہل غرض لوگوں کی ممکنہ حد تک مدد کرتے ہیں۔ اپنے احباب کے ساتھ اُن کے خوشگوار مراسم ہیں۔ حسن فرخ کچھ عرصہ تک ای ٹی وی کے نیوز ایڈیٹر رہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہاں کا موسم ان کے لیے ساز گار نہیں رہا۔ اس لیے وہ اردو اکیڈیمی لوٹ آئے اور اپنی قدیم کرسی (پی آر او) پر فائز ہیں۔ جہاں وہ حسب معمول، حسب سابق اکیڈیمی کی --- سرگرمیوں کو فروغ دینے میں مصروف ہیں۔ اکیڈیمی کی بہتر کارکردگی کے سلسلے میں محمد محی الدین شریف چیف اکاونٹس آفیسر اور سینیئر سوپر وائزر محمد عمر صاحب کا انہیں بھرپور تعاون حاصل ہے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اکیڈیمی کے دیگر اسٹاف میں یہ دونوں شخصیتیں اپنی ذمہ داریوں کو نہایت عمدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ نبھا رہے ہیں۔ اور ان دونوں حضرات کی خدمات اردو اکیڈیمی کے لیے ثمر آور ثابت ہو رہی ہیں۔ خود میرا بھی ذاتی تجربہ ہے کہ یہ دونوں شخصیتیں خاص طور پر شاعروں، ادیبوں کی نصف طلب کارروائیوں کی

جلد از جلد یکسوئی کے لیے شخصی دلچسپی لیا کرتے ہیں۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ شاعروں، ادیبوں سے ان کا انداز گفتگو انتہائی مہذب، مدبرانہ اور سلیقہ شعاری کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے یہ دونوں انتہائی بااخلاق ہیں — حسن فرخ صاحب کی شہر کے بہت ساری ممتاز شخصیتوں سے رسم و راہ ہے۔ کبھی کبھی اکیڈیمی غیر یقینی حالات سے گزرتی رہی لیکن ایسے مواقع پر حسن فرخ صاحب کے تدبرانہ طرزِ عمل اور مشاورت کو اہمیت حاصل رہی ہے وہ ہمیشہ اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ معاشرہ میں پھیلے ہوئے اندھیرے، اُجالوں میں تبدیل ہوتے رہیں جس شخص کی فکر آئینہ مثال رہتی ہے وہ سوسائٹی میں ہمیشہ پسند کیا جاتا رہے گا۔ حسن فرخ صاحب ایک صاف گو، حقیقت پسند شخص کی حیثیت سے ہمارے معاشرہ کا ایک اہم حصہ بنے ہوئے ہیں۔ ان کی کامیاب زندگی کا ایک اہم وصف ان کا متوازن نظریۂ حیات ہے اعتدال پسندانہ رویہ انھیں سرخ روئی کی مختلف کیفیات سے استفادہ کے مواقع فراہم کر رہا ہے حسن فرخ صاحب مشاعروں میں غزلیں ہی سناتے ہیں اگرچہ فرخ صاحب جدید حلقۂ شعر و ادب سے وابستہ ہیں لیکن ان کی غزلیں کلاسیکی شعری ادب کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں ان کے دو مجموعۂ کلام موتا ہلوا واسطہ اور عالم بعلم شائع ہو چکے ہیں۔ بہترین نظموں کے ساتھ ساتھ بہت ہی پُراثر نثر بھی لکھتے ہیں ان کے ادبی مضامین ان کے تبحرِ علمی کے آئینہ دار ہوتے ہیں لیکن وہ اپنی شاعری کی طرح اپنی تحریروں کو بھی اپنی تشہیر کا ذریعہ بنانے سے گریز کرتے ہیں

علی الدین نوید

(ذہین و باصلاحیت منفرد لہجے کا مقبول شاعر)

حیدرآباد میں میرے ہم عمر شاعروں کے بعد جن شاعروں نے شعری ادب میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھرپور احساس دلایا ہے اُن میں ایک اہم نام علی الدین نوید کا بھی ہے علی الدین نوید رشتہ میں میرے بھانجے ہوتے ہیں ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو ہمنا آباد ضلع بیدر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم محمد ریاض الدین تعلقہ ہمنا آباد ضلع بیدر کے ایک معروف علمی ادبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ علی الدین نوید کے دادا جناب محمد عظیم الدین منتظم پولیس تھے جن کا محلہ نورخاں اکھاڑے میں بہت بڑا مکان تھا اپنے بچپن میں اکثر میں اپنی بہن سے ملنے اُن کے گھر جایا کرتا تھا وہ مجھے بہت عزیز رکھتی تھیں۔ علی الدین نوید کے والد ماجد ایک کامیاب تاجر تھے علی الدین نوید کے ننھیال میں زیادہ تر ہنرمند ہیں اور ملازم سرکار تھے ان کے نانا عبدالمجید (میرے حقیقی ماموں) کا پیشہ درس و تدریس کا

تعلق تھا۔ وہ اپنے دور کے بہت اچھے استاد تھے علی الدین نوید کی
والدہ ماجدہ عظمت النساء میری والدہ محترمہ کی بہت چہیتی بھتیجی تھیں
میری بہن اپنی پھوپی سے بہت قریب تھیں۔ وہ اپنے بچپن میں میری
والدہ کے پاس زیادہ رہتی تھیں۔ علی الدین نوید کے تین بھائی ہیں
محمد قیام الدین، محمد مصلح الدین اور محمد وقار الدین (وقار ریاض)
وقار ریاض بہت ہی اچھے شاعر ہیں جو گلبرگہ میں آر ٹی سی ڈپارٹمنٹ
میں کنٹرولر ہیں۔ علی الدین نوید کی ابتدائی تعلیم ہمنا آباد میں ہوئی
ہمنا آباد ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔ ہائی اسکول میں ان کے
استاد سید شاہ محی الدین گنج نشین نے ان کے ذوقِ ادب کو محسوس کرتے
ہوئے رہنمائی کی۔ سٹی کالج حیدر آباد سے پی۔ یو۔ سی (انٹرمیڈیٹ) کیا۔
جامعہ عثمانیہ سے بی۔ ایس۔ سی اور بی ایڈ کی ڈگری لی۔ کرناٹک یونیورسٹی
دھارواڑ سے ۱۹۷۴ء اردو میں ایم اے کی ڈگری لی اور بہ حیثیت
ٹیچر ضلع پریشد ہائی اسکول ٹمس آباد اور بوئن پلی میں سائنس اور انگلش
پڑھاتے رہے۔ ان دنوں گورنمنٹ کالج محبوب نگر میں اردو لیکچرر کی
خدمت پر فائز ہیں۔ پولیس ایکشن (ستمبر ۱۹۴۸ء) کے دوران
فوج اور غیر سماجی عناصر بے گناہ مسلمانوں کے قتلِ عام کے درپے ہوئے تو
تو بہت سے مسلم خاندان سراسیمگی، خوف و دہشت کے ماحول میں اپنے
اپنے گھروں، گاؤں، اضلاع کو چھوڑ کر جو بھی سواری اُس وقت مل سکتی
تھی اُس کے ذریعہ حیدر آباد کی جانب روانہ ہوئے راستے میں موضع بگدل کے قریب

پھر خلیج گاؤں میں جب یہ قافلہ سستانے کے لیے رک گیا تو شر پسند سماجی عناصر نے حملہ بول دیا ایک ہندو کے گھر میں ان کے افراد خاندان ٹھہرے ہوئے تھے ان بلوائیوں نے ان سے روپیہ اور زیورات چھین لیا اور بڑی بے رحمی کے ساتھ ان کے والد اور ان کے دو چچاؤں اور دو اہل خاندان کو شہید کیا گیا۔

اس حادثے کو کئی دنوں تک علی الدین نوید کے اہل خاندان کو سنبھلنے نہیں دیا۔ اس جانکاہ حادثہ کے بعد بڑی مشکل سے علی الدین نوید کا خاندان حیدرآباد پہونچا جہاں وہ میرے قریبی رشتہ دار جناب المنان صاحب اکبر آبکاری کے مکان واقع دبیر پورہ میں مقیم رہے۔ پولیس ایکشن میں بچنے والے ان کے چچا احمد عماد الدین کی سرپرستی، شفقت و محبت کا نوید کی زندگی پر گہرا اثر رہا۔ ان کے بھائی قیام الدین نے تقریباً ۱۲ سال کی عمر میں اپنے تمام افراد خاندان کا بوجھ اپنے نازک کاندھوں پر اٹھالیا۔ انہوں نے اپنے بھائیوں کی تعلیم و تربیت میں بے مثال رول انجام دیا۔ دیگر اہل خاندان کی بھی غیر معمولی خدمت کی۔ والدہ ماجدہ ایک نہایت متقی پرہیزگار خاتون تھیں۔ علی الدین نوید تقریباً ۳۴ سال سائنس اور ریاضی کی تدریس کے فرائض انجام دینے کے باوجود بھی اردو ادب اور فکر و فن سے ان کی وابستگی برقرار رہی۔ بی۔ ایس سی کے دوران عثمانیہ یونیورسٹی کے سائنس کالج میگزین سائنتیا "SCIENTIA" کے مدیر بھی رہے۔ دو جوان سال شادی شدہ بہنوں کی اچانک رحلت والدہ ماجدہ کا انتقال اور اپنے ۱۲ سالہ ہونہار فرزند تنویر نوید کی

حادثاتی موت نویدؔ کی زندگی کے وہ ناقابلِ فراموش سانحے ہیں جو تازہ زخموں کی صورت آج بھی اُن کے دل میں مہکتے ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے بعد جدید لب و لہجے کے جن شعرا نے اپنی ایک الگ پہچان بنائی اُن میں علی الدین نوید ایک منفرد اور نمایاں مقام کے حامل ہیں ان کی شاعری میں عصری آگہی اور نئی حسیت کے نام پہ کہیں لفظوں کی شعبدہ بازی نظر نہیں آتی۔ علی الدین نوید کی شاعری میں جدید طرزِ اظہار اور کلاسیکی رچاؤ کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ اُن کا کلام خواص و عوام میں مقبول ہے ان کا ابتدائی کلام صبا، شاعر، تحریک، پیکر میں مستقل طور پر شائع ہوتا تھا۔ ہند و پاک کے موقر جرائد شب خون، سطور، حکمت، مناظر، دوشیزہ، شیرازہ، قومی زبان، سب رس کے علاوہ نیویارک ٹائمز، شکاگو میں بھی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں اخبار سیاست میں ان کا کلام انٹرنیشنل ایڈیشن میں شائع ہوتا تھا اور اب بھی کبھی کبھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ مخدوم، فیض، فراق، اریب، شاہد صدیقی، شہریار، بیکل، وحید، جاں نثار اختر، [illegible] ایمان، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطانپوری، احمد فراز، قتیل شفائی کے ساتھ کل ہند مشاعرے پڑھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ساہتیہ اکیڈمی دہلی کی جانب سے کل ہند سطح پر منعقدہ کثیر لسانی مشاعرے (مئی ۱۹۸۹ء) میں انھوں نے جنوبی ہند کی نمائندگی کی۔ قومی یکجہتی کے موضوع پر نظموں کے علاوہ فلم اور ٹیلی ویژن کے لیے بھی گیت لکھے ہیں ایک نظم "دور آندھرا پردیش"

کے نصاب میں شامل ہے۔ علی الدین نوید کی غزلیں یقیناً اردو شاعری میں ایک خوبصورت اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

علی الدین نوید ایک فطری شاعر ہیں انہوں نے اپنی پوری شناخت کے ساتھ اپنی شاعرانہ حیثیت کو منوایا۔ اپنی شاعری کے ابتدائی زمانے میں وہ مجھ سے مشورہ سخن کیا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے نوجوان شعراء میں علی الدین نوید پہلے شاعر ہیں جو ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی کے ہر مشاعرہ میں خصوصیت کے ساتھ مدعو کیئے جاتے ہیں۔

جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب کو علی الدین نوید کی شاعری بہت پسند تھی۔ جب ادبی ٹرسٹ اور شنکرجی میموریل سوسائٹی کے کل ہند مشاعروں کی فہرست مرتب ہوتی تو اس فہرست میں علی الدین نوید کا نام لازماً شامل رہتا تھا۔ شہر کے معیاری مشاعروں کے علاوہ وہ اضلاع کے مشاعروں میں بھی خصوصیت کے ساتھ مدعو کیئے جاتے ہیں۔

علی الدین نوید کے دو شعری مجموعے "صدف صدف ریت" (۱۹۷۹ء) اور "دھواں دھواں چراغ" (۱۹۹۳ء) میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کتابوں پر اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش نے انعام اول سے نوازا ہے شہر کے نمائندہ و مقبول شعراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ علی الدین نوید ہر مکتب خیال کے شاعروں میں مقبول ہیں ان کا رکھ رکھاؤ، اُن کی نشست و برخواست سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ اپنے شعری و ادبی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں

علی الدین نوید حیدرآباد کی ادبی انجمن "حلقہ" (حیدرآباد لٹریری فورم) کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔ مختلف اوقات میں حلقہ کے عہدہ دار رہ بھی شامل رہے ہیں۔ بہترین شاعر ہونے کے علاوہ بہترین مبصر نقاد بھی ہیں۔ شعر و ادب کے ہر موضوع پر انہیں اظہار خیال کا ملکہ حاصل ہے۔ اپنی بات کو نہایت پر وقار انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کا شاعرانہ منفرد لب و لہجہ قاری و سامع دونوں کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے۔ شگفتہ و شستہ رنگ تغزل مسحور کر دیتا ہے۔ انہوں نے ۴۰۰ سالہ جشن حیدرآباد تقاریب منعقدہ جدہ کے سلسلے میں منعقدہ مشاعرہ (۱۹۹۵ء) میں شرکت کی تھی اس مشاعرہ میں میں نے بھی شرکت کی تھی۔ جدہ کے مشاعرہ میں انہوں نے بہت عمدہ اور معیاری کلام سنا کر زبردست داد و تحسین حاصل کی تھی۔ ان تقاریب میں جناب عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر صاحب نے بھی شرکت کی تھی۔ علی الدین نوید ترنم میں کلام سناتے ہیں اور تحت میں بھی سناتے ہیں علی الدین نوید کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ شہر کی ہر ادبی انجمن کے ارباب مجاز کی یہ خواہش رہتی ہے کہ وہ ان کی محفل میں شرکت کریں۔ علی الدین نوید کا کلام ملک کے ادبی رسائل میں بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو سے گذشتہ ۲۵ سال سے ان کا کلام نشر ہو رہا ہے۔ دوردرشن سے بھی ان کے کلام کو خاصی پذیرائی ملتی رہی ہے۔ علی الدین نوید ملک کے بعض کل ہند مشاعروں میں شرکت کر

اپنے بہترین کلام پر داد و تحسین حاصل کی۔ علی الدین نوید سینئر شاعروں کا بے حد احترام اور تعظیم و تکریم کرتے ہیں۔ آداب محفل کا خیال رکھتے ہیں غزلوں ۔۔۔ کے علاوہ علی الدین نوید نے بہت عمدہ نظمیں کہی ہیں وہ دن بہت قریب ہے کہ علی الدین نوید کی شاعری و شخصیت پر ملک کی کسی نہ کسی جامعہ سے ریسرچ کیا جائے گا اور ان کے شایان شان مقالہ تحریر کیا جائے گا۔ علی الدین نوید کا مطالعہ عمیق ہے۔ تجربات و مشاہدات کی ترجمانی کرنے والی ان کی شاعری ہزاروں شائقین شعر و ادب کے دل کی دھڑکن بن چکی ہے۔ علی الدین نوید کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے راج بھون کے مشاعروں میں بھی کلام سنایا اور راشٹرپتی نیلائم میں منعقدہ مشاعرہ (۱۹۹۵ء) میں بھی کلام سنایا۔ جو صدر جمہوریہ ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی صدارت میں ہوا تھا۔ شہر کے بعض منتخب گلوکار مختلف تہذیبی تقاریب میں اُن کا کلام ساز پر پیش کرتے ہیں۔

علی الدین نوید حیدرآباد کے نامور شعراء کی اولین فہرست میں شامل ہیں۔ میری یہ دلی تمنا ہے کہ ان کی قدر و منزلت میں اور اضافہ ہو اور خاص طور پر حیدرآباد کے ادبی حلقے اس باکمال شاعر پر فخر محسوس کریں۔

نواب نورالدین خاں

(پرانے شہر کی مہذب شخصیت، بہترین دوست، معتبر محقق)

حلیم الطبع، وضع دار، پُر وقار، نرم گفتار، نیک رَو، باکردار ردار اور شریف النفس انسانوں کا جن محفلوں میں بھی تذکرہ ہوگا اُن محفلوں میں یقیناً نواب نورالدین خان جیسے مہذب شخص کا بھی ذکر ہوگا، اگرچہ اس طرح کے مہذب لوگ اُن محفلوں میں موجود نہیں رہتے لیکن اُن کی خوبیاں، اچھائیاں اور نیکیاں موضوع گفتگو رہتی ہیں۔ نواب نورالدین خاں یقیناً اس قابل ہیں کہ جن سے یہ تمام باتیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ ادبی حلقوں میں ایک معتبر محقق، صاحب ذوق اور محترم شخصیت کی حیثیت سے وہ اپنی پہچان بناچکے ہیں۔ نواب نورالدین خان کے اسلاف حیدرآباد کے باشعور صاحبان علم و فضل میں شمار ہوتے ہیں۔ نواب نورالدین خان اپنے بزرگوں کی روایات کے بہترین تسلسل کے طور پر اعلیٰ تہذیبی اقدار کے حامل ہیں اور خاموشی کے ساتھ علم و ادب کے کاموں میں مصروف ہیں

میں نواب نورالدین کا ہم کلام رہا ہوں۔ میں اپنی نئی رہائش گاہ ملے پلی میں منتقل ہونے سے قبل محلہ سید علی چبوترہ (روپ لال بازار) میں سکونت پذیر تھا۔ نواب نورالدین خان سے کبھی کبھی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ان سے میری پہلی ملاقات اس محلہ کی مسجد محی الدین کے روبرو سرِ راہ ہوئی تھی۔ یہ کوئی ۳۰ سال پہلے کی بات ہے۔ در حقیقت میں میرے بہنوئی غوث محی الدین صاحب کے ساتھیوں میں سے ایک ہیں۔ یہ بات انہوں نے دوران گفتگو بتائی۔ ان دنوں میرا دوسرا مجموعہ کلام زخموں کے گلاب (۱۹۷۲ء) شائع ہوا تھا۔ اس کتاب کے سلسلے میں نورالدین صاحب سے میری گفتگو رہی۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کا کلام روزنامہ سیاست میں پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پہلی ملاقات کے بعد کچھ دنوں تک سر راہ سلام علیک کا تبادلہ ہوتا رہا۔ پھر کچھ تعلق خاطر بڑھا۔ وہ میرے غریب خانہ تشریف لایا کرتے تھے۔ کچھ علمی و ادبی باتیں ہوتیں۔ کراچی میں مقیم حیدرآباد کے نامور ادیب استاد خواجہ حمیدالدین شاہد کا تذکرہ کرتے ان کے خطوط کے حوالے سے گفتگو رہتی اور ان کی زیر ادارت شائع ہونے والے ادبی رسالہ "سب رس" کا ذکر کرتے۔ زخموں کے گلاب کے بعد میری جتنی کتابیں شائع ہوئیں نواب صاحب کی خدمت میں روانہ کرچکا ہوں۔ نورالدین خاں صاحب کی بھی تمام کتابیں میرے پاس موجود ہیں۔ نواب نورالدین خان کو علم و ادب سے گہرا لگاؤ ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے شہر کے ادبی حلقوں میں شہرت رکھتے ہیں۔ "سیاست" اخبار میں اکثر ان کی

تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں جو زیادہ تر قدیم ادب اور حیدرآبادی روایات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب نورالدین کے پاس ان کے اسلاف کا بہت بڑا علمی سرمایہ موجود ہے ویسے ان کا مطالعہ بھی قابلِ رشک ہے۔ نواب نورالدین خان شہرت سے دور رہنے والے اپنی پسند کے ادبی جلسوں میں ۔۔ سامع کی حیثیت سے شریک رہا کرتے ہیں کبھی کبھی بعض ادبی انجمنوں کے جلسوں کو مخاطب کیا کرتے ہیں۔ خوشبو کا سفر بڑے شوق سے پڑھتے ہیں ہر ایک شخص سے نہایت خلوص سے ملتے ہیں۔ اپنے دوستوں اور جاننے والوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں عابد علی خان صاحب اور مگر صاحب نواب نورالدین خان سے مل کر اور ان کی تحریریں پڑھ کر خوش ہوتے تھے۔ نواب صاحب جب بھی سیاست تشریف لاتے اور اگر میں آفس میں موجود رہتا تو مجھ سے ضرور مل لیا کرتے۔۔۔ ویسے بھی وہ بہت کم آتے ہیں کوئی مضمون یا تحریر اشاعت کے لئے دینا ہو تو آتے ہیں یا سیاست کے زیر اہتمام منعقدہ کسی تقریب میں شرکت کرتے ہیں۔ شہر کے بعض شاعروں ادیبوں سے ان کے اچھے مراسم ہیں لیکن مراسم میں فاصلے کے بھی قائل ہیں ملاقات تو بہت سے لوگوں سے ہوتی ہے لیکن اپنے مخصوص احباب سے ہی میں وہ کھلتے ہیں۔ خواجہ حمید الدین شاہد سے ان کی خط و کتابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا۔ ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے معترف رہے علمی و ادبی معاملات میں نواب صاحب کی تحریریں اُجالوں کے سفیر کا کام انجام دیا کرتی ہیں۔ نورالدین خاں صاحب سے اگرچہ کہ میری ملاقات بہت کم ہوتی ہے لیکن

محسوس ہوتا ہے کہ ہم اکثر ملتے رہتے ہیں مجھے نواب صاحب کا مسکراتے ہوئے سنجیدگی سے گفتگو کرنا بہت اچھا لگتا ہے اُن کی خوش لباسی اور خوش مزاج کا میں معترف ہوں۔ ادبی محفلوں میں قدیم حیدرآباد کے مخصوص لباس شیروانی میں ملبوس رہتے ہیں۔ نواب صاحب اپنی گھریلو مصروفیات سے بے نیاز ہیں صالح اولاد نے انہیں نہایت آرام سے رکھا ہے یہی وجہ ہے کہ نواب صاحب ذہنی سکون اور دلجمعی کے ساتھ اپنا علمی و ادبی کام کر رہے ہیں شہر کے بعض محقق خاص طور پر ڈاکٹر داؤد اشرف جیسے اہل قلم سے ان کے خاص مراسم ہیں۔ نواب نورالدین جیسے با صلاحیت اچھے انسانوں کی ہمارے شہر میں کمی نہیں ہے لیکن ایسے معتبر لوگوں کی تلاش ضروری ہے ایسے لوگوں سے مل کر ان لوگوں کو بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے جو دیانت داری، صاف گوئی اور ایمانداری کے ساتھ معاشرہ میں سانس لیتے ہیں۔ نواب نورالدین صاحب بھی ہمارے شہر کے نامور محققین میں اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں جن کے علمی و ادبی خدمات کا اعتراف فراخ دلی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

مسعود متین

(اُردو فیسٹول کے مرکزِ نگاہ خوبصورت یادوں کے امین بہترین دوست)

میرے پہلے مجموعۂ کلام گلِ تازہ میں میری غزل کا ایک شعر ہے

اگر یادیں بھی ہم سے چھین لوگے ۔ ہماری زندگی میں کیا رہے گا

ایک شعر یہ بھی ہے۔

دیارِ دل میں آپ آئیں نہ آئیں ۔ چراغِ آرزو جلتا رہے گا

پھر "حسینوں کا قافلہ چلتا رہے گا" وغیرہ وغیرہ۔

میرے بعض ایسے بھی دوست ہیں جو میری زندگی کے خوشگوار دنوں کا حاصل ہیں۔ اُن کی دوستی ایک خاص ماحول میں ایک خاص تعلق خاطر کے پس منظر میں پروان چڑھتی رہی ۔ ۶۰/۱۹۵۹ء کے بیت کلیا کی اُردو ہٹول نے تو میری زندگی کا رخ ہی بدل دیا ہے کچھ ایسے دوست اُس ہٹول کی یادگار ہیں جنھیں میں کبھی نہیں بھلا سکتا اور جو زندگی کی آخری سانسوں تک رگِ جاں کی طرح میرے ساتھ رہیں گے ایک ایک پل

کے گذرتے رہنے سے عمر کا ایک ایک پل ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح
گھٹتا چلا جاتا ہے لیکن یادیں زندگی کی ایک انمول سوغات بھی ہیں
لاقیمت، جذبات محبت کا اثاثہ بھی ہوتی ہیں۔ اردو فیسٹول سے میری
ادبی زندگی میں بھی ایک نیا موڑ آیا۔ یہ وہی زمانہ ہے جب میں محفل شعر
کے کالم کی وساطت سے سیاست اخبار سے وابستہ ہو گیا تھا۔ اورینٹل
اردو کالج کی طالب علمی اور اُس دور کی شعری و ادبی سرگرمیوں کی گہما گہمی،
نئے نئے دوستوں سے ملاقاتیں، ملنے اور بچھڑنے کی وارداتیں اور نہ جانے کس
کس طرح کے حادثات سے سابقہ پڑا اور بیتتے لوٹتے دنوں کی طرح سب کچھ
گزرتا چلا گیا۔ اُس دور کے کچھ لوگ آج بھی گرم گرم خون کی روانی کی
طرح دل کی دھڑکنوں کا ایک اہم حصہ بنے ہوئے ہیں۔ کیسے کیسے لوگ
تھے کیسے کیسے دوست تھے۔ کچھ لوگ نہ جانے کہاں کہاں کھو گئے۔
اُس دور کے کچھ لوگوں سے ملاقات ہو بھی جاتی ہے اور کچھ لوگوں سے
نہیں بھی۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں کے منظر کا ایک ایک لمحہ میری
سانسوں کی ڈور سے بندھا ہوا ہے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ترک وطن
کر چکے ہیں اور ہزاروں میل دور ایک نئی دنیا میں بس گئے ہیں۔ ایسے
لوگ زیادہ یاد آتے ہیں جو ہزاروں میل دور رہ کر بھی دل کے قریب
ہیں اور جن کی یادیں نشتر کی طرح پیوست رگ جاں بنی ہوئی ہیں
مسعود متین، ہاشم حسن سعید کی طرح میری زندگی کے یادگار لمحوں کے سلسلے
کے ایک بہترین دوست ہیں۔ اُس زمانے میں مسعود متین، مردانہ حسن کا

ایک شاہکار تھے۔ نہایت جاذبِ نظر شخصیت تھی۔ اُن کا پُرکشش اپنی طرف متوجہ کرنے والا چہرہ سب سے الگ تھا۔ نہ جانے اُن کی آنکھوں کی موہنی نے کتنوں کو مسحور کیا ہوگا۔ اُس دور کی دو شخصیتیں اس قدر پُرکشش تھیں کہ ہر شخص اُن سے دوستی کرنا چاہتا تھا۔ ایک تو مسعود متین تھے دوسرے ڈاکٹر صادق نقوی جو نظام کالج کے ایک ذہین طالب علم اور کالج کے ترجمان "طلوع" کے مدیر تھے۔ ہاشم حسن سعید کی مقبولیت بھی کچھ کم نہیں تھی پامسٹ کی حیثیت سے انہوں نے کئی ہتھیلیوں کی تقدیر جگا دی۔ چاندی اور سونے کی رنگت والی ہتھیلیاں کسی دستِ سوال کی طرح ہاشم کے سامنے پھیلی ہوئی رہتی تھیں۔ ۴۰ برس سے زائد عرصہ ہو گیا ہے لیکن اُس دور کی بعض یادیں آج بھی گلستانِ اُردو میں گلِ تازہ کی طرح مہک رہی ہیں۔ گلِ تازہ کی خوشبو میری سانسوں میں کچھ اس طرح بسی ہوئی ہے کہ کبھی کبھی میری زندگی پیراہنِ گل کی طرح مہکنے لگتی ہے۔ اُردو فیسٹول نے نہ جانے کتنے طلباء و طالبات کو نزدیک سے نزدیک اور دور سے دور کر دیا ہوگا۔ اُس گلستانِ اُردو فیسٹول میں کئی رنگ کے پھول تھے لیکن ہر پھول اپنی انفرادیت کے ساتھ اپنے وجود کا احساس دلاتا رہا۔ مسعود متین فیسٹول کے میرِ کارواں تھے۔ میرِ مجلس تھے، سربراہِ سلطنتِ حسن و عشق تھے۔ مرکزِ حسنِ بتاں اور محورِ عشقِ طرحداراں تھے۔ صدر نشین اُردو فیسٹول تھے وہ سب سے زیادہ متحرک اور رواں دواں

تھے۔ نہ تو میں زندگی بھر مسعود متین کو بھول سکتا ہوں نہ اُس دور کے بعض خاص دوستوں کو خاص طور پر ہاشم حسن سعید اور دیگرہ وغیرہ "کو۔ میں اُن دنوں اورینٹل اُردو کالج میں بی او ایل کا طالب علم تھا بزم اُردو ادب کا صدر نشین بھی تھا۔ اُس وقت میں کلیاتی اُردو فیسٹول کے صدر و معتمد کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا ایک شام اُردو فیسٹول کے صدارتی عہدہ کے امیدوار کی حیثیت سے مسعود متین اور ہونے والے جنرل سکریٹری الطاف حسین میرے کالج آئے۔ مجھ سے خواہش کی کہ میں اُن دونوں کے انتخاب کے لئے نہ صرف خود ووٹ دوں بلکہ دیگر کالجس کے صدور و معتمدین کو بھی آمادہ کروں۔ میں نے اُن دونوں کو اپنے تعاون کا بھرپور یقین دلایا۔ الیکشن میں یہ دونوں منتخب ہوئے۔ پھر کیا تھا آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ میں ایک جشن کا منظر تھا۔ اُس الیکشن میں ویمنس کالج (کلیہ اناث) کی بعض طالبات نے بھی بہت ساتھ دیا تھا۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صدر شعبۂ اُردو فیسٹول کے مشیرِ اعلیٰ تھے سارے پروگرام بالراست اُن کی نگرانی و سرپرستی میں طے پاتے تھے۔ اُس زمانے میں پروفیسر محمد عبدالقادر آرٹس کالج کے پرنسپل تھے جن کا تعاون بھی اُردو فیسٹول کو حاصل تھا ڈاکٹر حفیظ قتیل بلیہ کے امور کے انچارج تھے عثمانیہ یونیورسٹی اور ملحقہ کالجس کے شعبۂ اُردو کے تمام صدور و معتمدین کے وقتاً فوقتاً اجلاس ہوتے تھے تیاری کمیٹیاں سرگرم عمل ہوگئیں۔ ہر شعبہ کی ذیلی

کمیٹیاں بنائی گئیں۔ سہ روزہ فیسٹول کا آخری دن کل ہند مشاعرہ کا تھا۔
حسن اتفاق سے میں بلا مقابلہ مشاعرہ کا کنوینر منتخب کیا گیا۔ کنوینرس کے
انتخاب کا اجلاس پروفیسر عبدالقادر سروری کے دولت خانہ واقع حمایت
نگر پر ہوا تھا۔ جہاں فیسٹول کا آفس تھا فیسٹول کی سہ روزہ تقاریب
اہم ہوئی تھیں پہلے دن شام تمثیل (ڈرامہ) دوسرے دن شب نغمہ
اور تیسرے دن کل ہند مشاعرہ۔ ڈاکٹر حمید سنطاری شام تمثیل کے منیجر
تھے۔ پروفیسر مغنی تبسم شب نغمہ کے اور منظور احمد منظور مشاعرہ کے۔
اُن دنوں پروفیسر مغنی تبسم اور منظور احمد اردو کالج کے طلباء کو بھی پڑھاتے تھے
اُردو فیسٹول کی تمام تقاریب نظام کالج گراونڈ پر ہوئی تھیں۔ اس
اُردو فیسٹول کا افتتاح بی گوپال ریڈی مرکزی وزیر فینانس نے کیا تھا۔ کل ہند
مشاعرہ میں فراق گورکھپوری، ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، اختر
الایمان اور دیگر شاعروں نے شرکت کی تھی۔ میں اُن دنوں شہر کے تمام
کالجس کے مشاعروں میں شریک رہتا تھا۔ ہر کالج میں معیاری
مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ شہر کے نامور شعراء کے علاوہ مختلف کالجس
کے طلباء بھی اپنا کلام سناتے تھے۔ بعض کالجس کے طلباء مشاعروں کے
سلسلے میں مجھ سے تعاون حاصل کیا کرتے تھے مسعود متین نے دوران فیسٹول
بے مثل تعاون کیا۔ مشاعرہ کے سلسلے میں کبھی مداخلت نہیں کی مجھے آزادی
ساتھ مشاعرہ کے اہتمام و انصرام کا موقع دیا۔ اُردو فیسٹول کے زمانے
ڈاکٹر مصطفےٰ کمال سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ نیوسائنس کالج

نارائن گوڑہ میں پڑھتے تھے۔ مشاعرہ کی صدارت شاہد صدیقی صاحب نے کی تھی۔ مسعود حسین کو شعر و ادب سے بے حد لگاؤ ہے لیکن انہوں نے کبھی بھی ان دونوں شعبوں میں عملاً حصہ نہیں لیا۔ انتظامی امور میں ماہر تھے اور فیسٹول کی تمام سرگرمیوں سے نہایت عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے۔ ہر قسم کی ہنگامہ آرائیوں پر قابو پانے کی قدرت رکھتے تھے۔ الجھے ہوئے طلباء کو مطمئن کر دینا اور سلجھے ہوئے طلباء کو اپنے ربط و خلوص سے متاثر کرنا روز کا مسئلہ تھا۔ بہت کچھ متوقع اور غیر متوقع دشواریوں کے باوجود مسعود حسین صبر آزما امتحان سے مسکراتے ہوئے گزرتے رہے۔ مسعود حسین نے ہر مرحلہ پر جرأت، حوصلہ و ہمت سے کام لیا۔ طلباء و طالبات کی دوستیوں میں کبھی حائل نہیں ہوئے۔ فیسٹول کے دوران خاص طور پر طلباء و طالبات کی آپسی رنجشیں اور کبھی کبھی دوستیاں مسائل پیدا کرتی رہیں لیکن مسعود حسین نے کسی بھی ناخوشگوار واقعات کی صورت گری کا موقع نہیں دیا۔ اس فیسٹول کے دوران کئی داستانوں نے جنم لیا اور کئی داستانوں کے کرداروں نے تہذیبی روایات کی پاسداری کی۔ اس دور کے کچھ طلباء و طالبات کو میں بہت قریب سے جانتا ہوں جنھوں نے وہیں سے اپنی نئی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ فیسٹول کے وسیلے سے ہی ان کی آرزوؤں اور امنگوں کی دنیا سنور گئی۔ اس دور کے اہم کردار آج ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ۴۰ برس انسان کی زندگی میں بہت ہوتے ہیں۔ ۴۰ برس کی یادیں زندگی کی بہت بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔ ان میں اگرچہ کچھ لوگ

آج باقی نہیں ہیں لیکن ان کی یادوں کے چراغ آج بھی روشن ہیں۔ اور جو باقی ہیں وہ اپنی یادوں کو اپنے جسم و جاں کا ایک ناقابل فراموش حصہ بنائے ہوئے اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں۔ ان ۴۰ برسوں میں بعض اچھے اچھے دوست جو اس دارفانی سے کوچ کر گئے ہیں اُن میں سے ایک دوست آل دی فیسٹول کے لیے مثال جنرل سکریٹری الطاف حسین بھی ہیں۔ اُن کے والد محمد حسین صاحب برگ آئینہ پس کے بہت بڑے تاجر تھے الطاف حسین کی موت کا مجھے اب تک بھی صدمہ ہے وہ انتہائی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے جب کبھی سرراہ ملاقات ہوتی تو وہ اپنی منفرد رکھ کر مسکراتے ہوئے چہرے کے ساتھ خوش گوار لب و لہجے میں گفتگو کرتے تھے ـــــ اکثر دفعہ جب میں اور ہاشم حسن سعید بعض گزرے ہوئے دلوں کا جائزہ لیتے ہیں تو مسعود مبین کی شکل ایک کامیاب ہیرو کی طرح پردہ ذہن پر اُبھر کر آجاتی ہے۔ بڑے ہی اچھے انداز میں مسعود مبین کا ذکر جاری رہتا ہے۔ میرا ایسا خیال ہے کہ آر دو فیسٹول کے دور کے ساتھیوں میں مسعود مبین اور ہاشم حسن سعید آپس میں بہت گہرے دوست ہیں۔ دونوں کی دوستی مثالی ہے۔ ہاشم حسن سعید اس دور میں مجلہ عثمانیہ کے مدیر اعلیٰ تھے اور جامعہ عثمانیہ نمبر مرتب کرکے پہلی بار موسیٰ کی تاریخ کو یکجا کرنے کی کوشش کی۔ ہاشم حسن سعید نے اپنے زرین افسانہ پیر سنفائے افسانہ نگاری میں حصہ لے کر پریم چند ایوارڈ حاصل کیا تھا۔ بیت بازی اور دیگر علمی و ادبی سرگرمیوں میں بھی مصروف

رہتے تھے۔ صدر بزم اردو جامعہ عثمانیہ کی حیثیت سے مسعود متین باوقار انداز میں تمام کالجس کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں میں کامل تعاون کرتے تھے۔ بزم اردو جامعہ عثمانیہ کی سرگرمیوں کو بہت آگے بڑھایا تھا مسعود متین ایک ذہین طالب علم اور ایک باشعور اڈمنسٹریٹر کی طرح جامعہ عثمانیہ سے ملحقہ تمام کالجس کے اردو ماحول کو زندہ رکھنے میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس زمانے میں ہر کالج میں مختلف نوعیت کی ادبی سرگرمیاں جاری تھیں۔ جیسے بیت بازی تحریری، تقریری مقابلے، مقابلۂ شعر و سخن، مقابلۂ افسانہ نگاری وغیرہ۔ اس دور میں مختلف کالجوں کے مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں متعلقہ صدور و معتمدین مجھ سے تعاون حاصل کرتے تھے اس دور کے طلبا، شاعروں میں ڈاکٹر صادق نقوی، ڈاکٹر اشرف رفیع، سیدہ مجیدہ، طالب خوندمیری اور سید علی خیال نمایاں تھے۔ اکثر شعری مقابلوں میں ہمارا سامنا ہوتا تھا نظام کالج میں بین کلیاتی مقابلۂ شعر و سخن میں، میں نے بھی حصہ لیا تھا اس مقابلۂ شعر و سخن میں مجھے انعام اول ملا تھا۔ شیلڈ میرے حصہ میں آئی۔ اردو کالج کے لیے یہ پہلی شیلڈ تھی جو سجاد میموریل شیلڈ کے نام سے موسوم تھی۔ ہاشم حسن سعید نے ایم اے کرنے کے بعد کالج آف لنگویجس سے اپنا رشتہ جوڑ لیا اور پرنسپل کی حیثیت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے ان دنوں وہ انڈین کونسل آف سوشیل ویلفیر ٹریننگ سنٹر کے ڈائرکٹر ہیں۔ مسعود متین نے سرکاری ملازم کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا ۱۹۶۷ء میں پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ انکم ٹیکس آفیسر متعین ہوئے اور ڈپٹی

کمشنر جنرل ٹیکس کی حیثیت سے اپنی خدمات سے ریٹائر ہوئے۔ اور
یوں سکریٹریٹ میں اپنی ملازمت کے ۳۴ برس گزار کر اور سکشن آفیسر کی
حیثیت سے وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوا۔ ۱۹۵۹ء میں
صحافت سے وابستہ ہو گیا اور آج بھی وابستہ ہوں گذشتہ ۵ برسوں
سے ایک ادبی رسالہ قوس قزح مستقل شائع کر رہا ہوں۔ ویسے ماہنامہ قانون
دکن کا ۱۲ برس تک مدیر اعزازی رہ چکا ہوں۔ مسعود متین حج بیت اللہ
کی سعادت سے بھی سرفراز کیے گئے ہیں۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔
متین صاحب سے کبھی کبھی سر راہ —— کبھی ہاشم حسن سعید کے
پاس ملاقات ہو جاتی ہے شادیوں کی تقاریب اور تہذیبی محفلوں
میں بھی ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ مسعود متین معاشی طور پر بہت مستحکم
ہیں ذہنی سکون کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ میں اپنے
بہترین دوستوں میں مسعود متین کی اس لیے بھی قدر کرتا ہوں کہ انھوں نے
اردو فیسٹول کے دوران ابتدائی تعارف کے بعد مجھے اپنے قریبی دوستوں
میں شامل کر لیا شاید اس لیے کہ میں نے جب وہ الیکشن کے سلسلے
میں امداد حسین کے ساتھ اردو کالج آئے تھے تو بلا تامل ان دونوں
کی تائید کے لیے اپنی ایماندارانہ منصفانہ رائے کا اظہار کیا تھا۔ شاید
میری بے ساختگی کے جذبے نے انہیں متاثر کیا ہو۔ مسعود متین کو
میں نے اردو فیسٹول کے زمانے میں اعلیٰ درجہ کا اڈمنسٹریٹر پایا۔ انہوں
نے فیسٹول کے ہر مرحلہ پر اسے کامیابی سے ہم کنار کیا۔ کبھی غیر متوقع رکاوٹوں

کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کیا اور اپنی حکمت عملی سے اُلجھے ہوئے
مسائل کو سلجھایا۔ اتنے بڑے فیسٹولس کی کامیابی کی ذمہ داری قبول کی اور
نہایت کامیاب صدر فیسٹول ثابت ہوئے۔ اُس دور سے ہی کامیابی
کے ساتھ میرے شعری و ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ میں باقاعدہ شعری و ادبی
محفلوں کا ایک حصہ بن گیا۔ میں آج بھی مسلسل سفر میں ہوں۔ میری
زندگی کا سفر آج بھی خوشبو کے سفر کی طرح جاری ہے۔ ہمارے دور کا اُردو
فیسٹول جس کے صدر نشین مسعود متین تھے اُردو کا واحد اتنا بڑا جشن تھا کہ جس
کی نظیر جامعہ عثمانیہ کا شعبۂ اُردو آج تک نہیں پیش کر سکا۔ اس طرح اُردو
فیسٹول کی رعنائیاں ہمارے دور تک رہیں اور ہمارے ساتھ ختم ہو گئیں
فیسٹول کے حوالے سے جب میں اپنے ماضی کے اوراق اُلٹتا ہوں تو اکثر
صفحات پر مسعود متین بھی نظر آتے ہیں ہاشم حسن سعید کی طرح اور کچھ
مانوس و نامانوس چہرے بھی نظر آتے ہیں دوستوں اور محسنوں کی طرح
سچ ہی تو کہا کسی نے کہ یادیں زندگی کا عظیم سرمایہ ہوتی ہیں
اور میں پوری دیانت داری اور ایمانداری کے ساتھ یادوں کے اس
عظیم سرمایہ کی دل و جان سے حفاظت کر رہا ہوں۔ ▲

پروفیسر قادری بیگم

(قابل معزز، روشن دماغ خاتون، لائق ماہر تعلیم)

پروردگار عالم ہر انسان کو اس کی صلاحیتوں کے مطابق اپنی عنایتوں اور اپنے رحم و کرم کی فضیلتوں سے کچھ اس طرح نوازتا ہے کہ وہ اپنی قابلیت سے جس شعبۂ حیات سے بھی وہ تعلق کیوں نہ رکھتا ہو استفادہ کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے اپنی سرگرمیوں کا اظہار کرتا ہے کہ معاشرہ میں رنگ و نور کی بارش ہونے لگتی ہے۔ وہ لوگ واقعتاً مہذب معاشرہ کے لئے اہم ہوتے ہیں جو اپنے فکر و خیال کی روشنی سے معاشرہ کے تمام گوشوں کو منور کرتے رہتے ہیں۔ صلاحیتوں کا اظہار ہر انسان کے عمل سے ہوتا ہے ظاہری صلاحیتیں اپنا رنگ ضرور دکھلاتی ہیں لیکن نامعلوم صلاحیتیں زیادہ عرصہ تک منجمد نہیں رہتیں غیر مرئی صلاحیتوں کا استعمال بھی ایک باخبر دانشور و صاحبِ کمال شخصیت کا مرہونِ منت رہتا ہے۔ آئے دن کچھ ایسے لوگ بھی مرکزِ نظر رہتے ہیں جو اپنے

وجود کا احساس دلانے کے لیے جتن نظر آتے ہیں۔ پھر بھی ایک بات تو واضح ہے کہ اگر وسائل مہربان رہیں تو ایک باشعور و باخبر انسان سوسائٹی کی نظروں میں ہمیشہ نمایاں رہتا ہے۔ جو شخص اپنی بہترین صلاحیتوں کے باوجود بھی کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے اپنی چہار دیواری کا حصہ بنا رہتا ہے وہ نہ صرف خود اندھیروں کے حوالے ہو جاتا ہے بلکہ وہ اپنے وجود کے ساتھ بھی کھلی ناانصافی کرتا ہے۔ بہترین صلاحیتوں کو روبہ عمل لانے سے سارے ماحول میں خوشبوؤں کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ایک نہایت ہی خوشگوار شکل میں زندگی اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

اس تمہیدی پس منظر کے زیرِ سائبان پروفیسر قادری بیگم جیسی شخصیت بھی اپنے چراغِ علم و آگہی سے دل و دماغ کو روشن کرتی رہتی ہے پروفیسر قادری بیگم دختر جامعہ عثمانیہ ہیں۔ اپنے تعلیمی سفر کے دوران اپنی عمدہ صلاحیتوں کی وجہ سے تعلیمی میدان میں امتیازی مقام کی حامل رہیں اپنی تعلیمی و عملی سفر کے دوران شعبۂ درس و تدریس کے مقدس پیشہ سے وابستہ رہ کر بحیثیت پرنسپل ویمنس کالج جامعہ عثمانیہ ۱۹۸۵ء میں سبکدوش ہوئیں۔ وہ ۱۹۸۲ء میں پرنسپل مقرر ہوئی تھیں پروفیسر صاحبہ جامعہ عثمانیہ میں سینٹ کی رکن بھی رہیں۔ اپنی بہترین انتظامی صلاحیتوں سے ویمنس کالج کے ارد ا بتی شائستہ تہذیبی اور عصری ماحول کو گنگا جمنی تہذیب کے روپ میں ڈھالتے ہوئے نمایاں خدمات انجام دیں۔ مس پروفیسر قادری بیگم کو شعری و ادبی محفلوں کی وساطت سے

جانتا ہوں۔ میرا پہلا تعارف ممتاز شاعرہ نایاب سلطانہ کی معرفت ہوا محفلِ خواتین کی جانب سے آج سے ۵ سال پہلے غزلوں کی رات کی سالانہ تقریب کا اہتمام پیشِ نظر تھا۔ صدرِ محفلِ خواتین محترمہ عظمت عبدالقیوم کی یہ خواہش تھی کہ اس سال محفلِ خواتین کی سالانہ تقریب ویمنس کالج کوٹھی میں منعقد کی جائے۔ اجازت کا مسئلہ درپیش تھا اس سلسلے میں نایاب سلطانہ نے مکمل تعاون کیا اور اپنی ہم جماعت و بہترین دوست پروفیسر قادری بیگم سے اجازت حاصل کرلی۔ محفلِ خواتین کی وہ سالانہ تقریب اعلیٰ پیمانہ پر منعقد ہوئی۔ پروفیسر قادری بیگم کو ادبی اجلاس کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے پہلی بار اُن کی تقریر سنی بے حد متاثر ہوا۔ پروفیسر قادری بیگم ادب کے ہر موضوع پر اظہارِ خیال کا ملکہ حاصل ہے۔ محفلِ خواتین کی اس تقریب میں انھوں نے محفلِ خواتین کی سرگرمیوں پر پُراثر انداز میں اظہارِ خیال کیا تھا۔ اس تقریب کے بعد پروفیسر قادری بیگم محفلِ خواتین سے وابستہ ہوگئیں۔ انھوں نے اکثر ادبی تقاریب کی صدارت کی ہے۔ سالہا کی حیثیت سے بھی محفلِ خواتین کے ادبی جلسوں میں شریک رہا کرتی ہیں۔ پروفیسر قادری بیگم کالجس اور خواتین کی محفلوں میں اپنی تقریر کا جادو جگاتی رہیں۔ جب وہ کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے سالانہ جلسوں میں اپنے خطاب سے نوازنے لگیں تو شہر کی بعض ادبی انجمنوں کو یہ احساس ہوا کہ ایک قابل ترین خاتون کا ادبی محفلوں میں اضافہ ہونے والا ہے تو میں نے اپنے تاثر کو عملی جامہ

پہنچانے کے لیے پروفیسر قادری بیگم نے اپنے ہی زیر اہتمام ادبی جلسوں میں مدعو کرنا شروع کیا۔ جیسا کہ پروفیسر صاحبہ نے اظہار خیال کیا ہے پہلے لوگ کے بیشتر ادبی جلسوں میں شرکت کی ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ پروفیسر قادری بیگم اعلیٰ درجہ کی مقرر ہیں۔ بہترین ادیبہ بھی ہیں۔ ان کے کچھ مضامین "خوشبو کا سفر" میں شائع ہو چکے ہیں۔ علم و ادب سے ان کی گہری دلچسپی کو تقویت پہونچاتے ہیں ان کے گھر کا علمی و ادبی ماحول معاون رہا۔ تہذیب گھرانے کے بہترین ماحول نے ان میں شائستگی کا پیکر بنا دیا۔ شہری برگزیدہ خواتین میں اعلیٰ قدر و منزلت یا اعلیٰ حیثیت خاتون و شعور کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہیں۔ علمی، تعلیمی، ادبی، تہذیبی ہر موضوع پر کھل کر عالمانہ انداز میں مخاطب کرتی ہیں۔ ان کا لب و لہجہ پُر اثر کیفیات کی مکمل ترجمانی کرتا ہے اپنے مشاہدات اور تجربات کو کبھی مقرر کی حیثیت سے تو کبھی ادیبہ کی حیثیت سے منظر عام پر لاتی ہیں۔ پروفیسر قادری بیگم نہایت پُر وقار لائق و فائق خاتون ہیں۔ ان کا گھن گرج دار لب و لہجہ سامعین کو متوجہ کرنے میں کلیدی رول ادا کرتا ہے۔ جلسوں میں ہمیشہ وقت کی پابندی کرتی ہیں۔ با اصول زندگی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ وعدہ کی پابند رہتی ہیں اور چاہتی ہیں کہ سوسائٹی کا ہر فرد وعدہ کا پابند رہے اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کرے۔ پروفیسر قادری بیگم مجلسی خاتون ہیں جب وہ کسی موضوع پر لب کشائی کرتی ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک بہتی ہوئی ندی ہیں۔ کبھی ہی چلی جاتی ہیں تا وقتیکہ متعلقہ

ہم عصروں سے انصاف نہ کریں۔ سلسلۂ تقریر جاری رکھتی ہیں۔ قادری بیگم صاحبہ کو دینی علوم و فنون سے بھی گہری دلبستگی ہے چنانچہ وہ مذہبی اور دینی محفلوں میں بھی اپنی ہنر مندی کے جوہر دکھاتی ہیں۔ لیے معلومات آفریں خیالات سے سامعین کو پوری طرح مطمئن کر دیتی ہیں صدر کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی جناب جلیل پاشاہ تعلیمی کمیٹی کے ہر سالانہ جلسے میں قادری بیگم کی خدمات کے ذریعہ بھرپور تعاون حاصل کرتے ہیں تعلیمی کمیٹی کے سالانہ جلسوں میں شعبۂ خواتین کی وہی انچارج و سربراہ رہتی ہیں انہوں نے اپنی نگرانی و سرپرستی میں کل ہند تعلیمی کمیٹی کے سالانہ جلسوں میں کئی کامیاب محفلوں کا اہتمام کیا۔ ویمنس کالج کی پرنسپل کی حیثیت سے ان کا انتظامیہ مثالی رہا ہے ان کی زندگی میں باقاعدگی اور ڈسپلن کا بڑا دخل ہے۔ انتہائی باا خلاق، مہذب خاتون ہیں جیسے ہی محفل میں داخل ہوتی ہیں گرجدار آواز میں اسلام علیکم کہتی ہیں تمام محفل متوجہ ہو جاتی ہے اور عزت و احترام کے ساتھ انہیں مخصوص نشست تک لے جایا جاتا ہے۔ پروفیسر حبیب ضیاء کی طرح پروفیسر قادری بیگم بھی خاص طور پر ادارۂ محبان شہر حیدر آباد کے ادبی جلسوں کے لیے ناگزیر ہو گئی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ حاضرین محفل پروفیسر قادری بیگم کی دل و جان سے قدر کرتے ہیں ان کا احترام کرتے ہیں ہیں اور ان کے خطاب کو پوری توجہ سے سماعت کرتے ہیں پروفیسر قادری بیگم جس محفل میں بھی رونق افروز ہوتی ہیں اس محفل میں ایک خوشگوار

ہر دور ہر زمانے سے یہ بات درست رہی ہے کہ ہر معاشرہ میں کچھ ہی مشہور
شخصیتیں ہوتی ہیں جنہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جن کی
شخصیت کا اچھا اثر معاشرہ کے مختلف گوشوں پر پڑتا ہے۔ ادبی
حلقوں میں ان کی پذیرائی کے لیے شرکائے محفل چشم براہ رہتے ہیں۔
علمی و دینی محفلوں میں بھی ان کا چراغ روشن رہتا ہے پروفیسر قادری
بیگم نہایت ملنسار، خوش اخلاق، معتبر و پُروقار خاتون ہیں حیدرآباد
کو ہمیشہ اس بات کا فخر رہے گا کہ ہر دور میں صاحب کمال مرد
دانشوروں کے ساتھ قابل خاتون دانشوروں کی قدر افزائی
بھی ہوتی رہی ہے۔ پروفیسر قادری بیگم اپنی لیاقت، ذاتی صلاحیتوں
اور خدا کی مہربانیوں سے علمی و ادبی معاشرہ میں نمایاں حیثیت کی
حامل ہیں۔ ہم جان و دل سے اس معتبر دانشور خاتون کی قدر کرتے
ہیں اور ہمیشہ ان کے معلومات آفریں خطاب کے منتظر رہتے ہیں
ہم دعا گو ہیں کہ خدا پروفیسر قادری بیگم کی عمر دراز کرے تاکہ ہم ان
کے علم کی روشنی سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوتے رہیں۔

پروفیسر حبیب ضیاءؔ

دیدۂ پُرنم و لبِ خنداں کی ادبیہ ترجمان معتبر خاتون

ممتاز طنز و مزاح نگار نامور صاحب طرز ادیبہ، حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی وضع دار، باوقار و پُراثر شخصیت پروفیسر حبیب ضیاء کا میں شاگرد رہا ہوں۔ پروفیسر صاحبہ اورینٹل اُردو کالج میں ایم۔ او۔ ایل (جو ایم اے اُردو کے مماثل ہے) کے طلباء و طالبات کو تنقیدی و تحقیقی ادب پڑھاتی تھیں۔ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر حسینی شاہد کی ہدایت تھی کہ طلباء پابندی کے ساتھ اپنی جماعتوں میں حاضر رہیں۔ اُس زمانہ میں اُردو کالج کا تعلیمی معیار بہت بلند تھا۔ کالج کو قابل اساتذہ کی خدمات حاصل تھیں۔

میں پروفیسر حبیب ضیاء کو آج بھی نہایت احترام کے ساتھ اُن کے پدرسے وقار کو ملحوظ رکھتے ہوئے مخاطب کرتا ہوں۔

پروفیسر موصوفہ نے ۱۹۶۲ء میں جامعہ عثمانیہ سے "مہاراجہ سرکشن پرشاد حیات اور کارنامے" کے زیر عنوان ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ۱۹۶۷ء میں ان کا یہ حیثیت

لیکچرر اردو کالج میں تقرر ہوا۔ حبیب ضیاء نے ایک قابل مثالی استاد کی طرح نہ صرف اردو کالج میں ہی اپنا نام کمایا تھا بلکہ ویمنس کالج (جامعہ عثمانیہ) کی استاد کی حیثیت سے بھی نہایت ہی عمدگی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوئی ہیں۔ ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں وہ ایگزامینر اور اکسپرٹ کی حیثیت سے مامور رہی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ اردو کے بورڈ آف اسٹڈیز کی بھی چیرپرسن رہی ہیں۔ حیدرآباد میں یقیناً بہت سی قابل ترین خاتون اساتذہ رہی ہیں اب بھی ہیں۔ لیکن ہر دور میں کچھ ایسے اساتذہ اور استانیاں بھی رہی ہیں جو اپنی قابلیت و صلاحیت کی وجہ غیر معمولی شہرت رکھتی ہیں۔ اور بنیٹس اردو کالج کے طلبا و طالبات کی طرح ویمنس کالج کی بیشتر طالبات بھی ایسی رہی ہیں جو پروفیسر صاحبہ کے طریقۂ درس و تدریس سے بے حد متاثر تھیں۔ اور ایسے طلبا و طالبات بھی جو پروفیسر صاحبہ کے شاگرد خاص ہونے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پروفیسر حبیب ضیاء طنز و مزاح کی صف اول کی ادیبہ ہیں ان کی شگفتہ و شستہ مزاحیہ تحریریں اور ان کا طنز آمیز لب و لہجہ قاری و سامع کو یکساں طور پر متاثر کرتا ہے ان کی زبان، ان کا اندازِ بیان اور ان کا اسلوب مستند و نامور طنز و مزاح نگاروں کی یاد دلاتا ہے۔ طنز و مزاح کی اعلیٰ تحریریں پروفیسر صاحبہ کے قلم کی سحر کاری کا ایک اہم کرشمہ ہیں۔ پروفیسر صاحبہ ایک مشہور ادیبہ کی حیثیت سے اردو دنیا میں پورے اعتماد کے ساتھ اپنے ہونے کا احساس

دلانی رہتی ہیں۔ پروفیسر صاحبہ کی تاحال چھ کتابیں دکنی زبان کی قواعد، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، شاد و نیاز، گویم مشکل نہ گویم مشکل، انیس بیس اور جو مژگاں اٹھائیے شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی تقریباً تمام کتابوں پر انعامات مل چکے ہیں۔ پروفیسر صاحبہ لطافت و نفاست، شرافت و نجابت، صداقت و مروت اور حسنِ نظر اور فکر و خیال کا سرچشمہ ہیں وہ ایک ایسی پُروقار شخصیت کی حامل ہیں کہ جن کی تحریروں میں شعلہ و شبنم کا امتزاج ہے پروفیسر صاحبہ حیدرآباد کے ادبی حلقوں میں اپنی شائستگی، بُردباری، میانہ روی، صاف گوئی، نرم گفتاری اور سنجیدہ طبیعت جیسی نمایاں خصوصیات کی حامل ہیں۔ پروفیسر صاحبہ کا تعلق حیدرآباد کے ممتاز علمی و ادبی گھرانے سے ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت مشرقی ماحول میں ہوئی۔ گھر کا سارا ماحول خالص مشرقی ہے۔ پروفیسر صاحبہ حیدرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین کی ادبی انجمن محفلِ خواتین کی نائب صدر ہیں جبکہ ممتاز شاعرہ عزیز النساء صبا معتمد عمومی اور نامور شاعرہ مظفر النساء ناز شریک معتمد ہیں۔ شہر کی بعض ادبی انجمنوں ترقی پسند مصنفین، زندہ دلانِ حیدرآباد وغیرہ سے بھی پروفیسر صاحبہ وابستہ ہیں۔ نہایت سادہ مزاج، پُروقار اور محتاط رویوں کو اپنانے والی ادیبہ ہیں۔ پروفیسر حبیب ضیاء تصنع، بناوٹ اور ظاہری نمود و نمائش سے دور بہت ہی دور رہتی ہیں۔ نہایت سادہ لباس میں ملبوس رہتی ہیں سادگی نے پروفیسر صاحبہ کی شخصیت کو بہت زیادہ نکھارا ہے اور پُروقار بنا دیا ہے ڈاکٹر صاحبہ ادبی جلسوں میں

بہ پابندی وقت شرکت کرتی ہیں۔ کسی نے بھی کبھی بھی انہیں بناؤ سنگھار کے ساتھ شوخ لباس میں نہیں دیکھا ہوگا۔ ان کا اندازِ گفتگو، طرزِ تکلم مخاطب کو اس لئے بھی متاثر کرتا ہے کہ ان کا لب و لہجہ صاف ستھرا پرکشش اور پُر اثر ہوتا ہے۔ سلجھا ہوا طرزِ تخاطب ان کا وطیرہ ہے ادبی حلقوں میں اپنی شرافت، خاندانی وجاہت اور اپنی اعلیٰ صفات کی وجہ سے مقبول ہیں۔ ایک شاگرد کی حیثیت سے میں ہی نہیں سبھی پروفیسر صاحبہ کے قدر داں ہیں۔ میں بطورِ خاص ان کا احترام کرتا ہوں۔ میری یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ ادبی حلقوں میں زیادہ سے زیادہ اپنے افکارِ عالیہ سے تشنگانِ علم و ہنر، دانشورانِ فکر و خیال اور زبان و ادب کے شیدائیوں کو فائدہ پہونچاتی رہیں۔ چونکہ مجھے پروفیسر صاحبہ سے بے انتہا عقیدت ہے اس لئے میری یہ دلی خواہش رہتی ہے کہ وہ شعر و ادب کی دنیا میں بلند ترین مقام حاصل کریں۔ حیدرآباد کا تعلیم یافتہ طبقہ ان کے فن اور شخصیت کا معترف ہے پروفیسر صاحبہ کے مزاحیہ مضامین ہلکے پھلکے مگر طنز کے آئینہ دار ہوتے ہیں ان کے طنز کی دھار بہت تیز ہوتی ہے۔ خالص ادبی مزاح کی حامل ادبی تحریروں میں شگفتہ و تر و تازہ پھولوں کی سی خوشبو شامل رہتی ہے ڈاکٹر صاحبہ کو الفاظ کے استعمال کا بہت اچھا سلیقہ حاصل ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے مضامین پڑھنے کا انداز بھی سامع کو متاثر کرتا ہے۔ کیسا ہی ہنسنے ہنسانے والا جملہ کیوں نہ ہو وہ پڑھتے ہوئے ہنسنا تو دور کی بات زیرِ لب مسکراتی بھی نہیں۔

پروفیسر صاحبہ ایک کامیاب طنز و مزاح نگار ہیں ان کے طنز و مزاح کے مضامین ادبی رسائل کی زینت بڑھاتے ہیں روزنامہ سیاست میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ طنز و ظرافت کا معیاری رسالہ زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان شگوفہ میں بھی ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جس کے باصلاحیت مدیر ڈاکٹر مصطفیٰ کمال ہیں۔ ڈاکٹر حبیب ضیاء کے شوہر محترم رحیم الدین توفیق بھی طنز و مزاح میں مضامین لکھتے رہے۔ شگوفہ میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ سالِ گذشتہ اردو اکیڈیمی کی جزوی اعانت سے ان کی کتاب "کہیں دیکھا ہے" شائع ہوکر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے ڈاکٹر حبیب ضیاء طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے علاوہ سنجیدہ ادبی و تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی لکھتی ہیں۔ ادب کے مختلف موضوعات پر ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ شاعروں اور ادیبوں کی کتابوں کے لئے دیباچے بھی لکھتی ہیں۔ پروفیسر صاحبہ حیدرآباد کے تقریباً تمام اہم ادبی جلسوں میں شرکت کرتی ہیں محفلِ خواتین، زندہ دلانِ حیدرآباد اور ادارۂ میرا شہر میرے لوگ کے جلسوں میں نہایت پابندی سے شرکت کرتی ہیں میرا شہر میرے لوگ کے کئی ادبی جلسوں کو مخاطب کر چکی ہیں ڈاکٹر صاحبہ کو ادارۂ میرا شہر میرے لوگ سے دلی وابستگی ہے ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی شاید ہی کوئی ادبی تقریب ہوگی جس میں ڈاکٹر صاحبہ نے شرکت نہ کی ہو۔ میں جس قدر ڈاکٹر صاحبہ کا احترام کرتا ہوں وہ بھی اپنے شاگرد کا

اتنا ہی لحاظ رکھتی ہیں۔ محفلِ خواتین اور رشادل کالج کی بانی محترمہ عظمت عبد القیوم کی یاد میں سالانہ منعقد کی جانے والی تقریباً تمام تقاریب میں میری درخواست پر مضمون پڑھ چکی ہیں۔ پروفیسر صاحبہ کے اعتراف خدمات کے سلسلے میں ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے اجالوں کے مسافر کے زیرِ عنوان اعلیٰ پیمانے پر ادبی تقریب منعقد کی گئی تھی پروفیسر صاحبہ محفلِ خواتین سے وابستہ خاتون ادیبوں اور شاعرات کے علاوہ شہر کے دوسرے اہلِ قلم خواتین اور اپنے ساتھی اساتذہ میں کافی مقبول ہیں طالبات بھی ان کی پُرکشش شخصیت سے بے حد متاثر تھیں اور ان کے پیریڈ کا بے چینی سے انتظار کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحبہ خاموشی کے ساتھ اپنے علمی و ادبی کاموں میں مصروف رہا کرتی ہیں ڈاکٹر صاحبہ کا ادبی سفر جاری ہے میری خواہش پر ڈاکٹر صاحبہ نے کئی شاعروں، ادیبوں کے فن اور شخصیت پر مضامین لکھے ہیں۔ پڑھے ہیں۔ پروفیسر صاحبہ میری منہ بولی بہن صالحہ الطاف مدیر خاتونِ دکن کی بہت اچھی دوست رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ نے صالحہ الطاف صاحبہ کے سانحۂ ارتحال پر نہایت پُراثر مضمون لکھا ہے جو میری مرتب کردہ کتاب "صالحہ الطاف فن اور شخصیت" میں شامل ہے جس کے معاونین ڈاکٹر اختر سلطانہ اور ڈاکٹر صابرہ سعید ہیں۔ اسی طرح عظمت عبد القیوم فن اور شخصیت میں شامل ان کا مضمون قابلِ مطالعہ ہے۔ پروفیسر صاحبہ کا گھریلو ماحول خالص ادبی ہے ان کے شوہر محترم رحیم الدین توفیق صاحب کی رفاقت ان کے لئے بہت بڑا

سرمایہ رہی توفیق صاحب ان کے علمی وادبی کاموں میں ہمیشہ معاون رہا کرتے تھے پروفیسر صاحبہ کی ازدواجی زندگی نہایت کامیاب رہی نتیجہ ہی تو ڈاکٹر صاحبہ کا ادبی کام بغیر کسی الجھن کے جاری رہا۔ ان کا زورِ قلم مسلسل رعنائیاں بکھیر رہا ہے۔ ان کی تحریریں ادب کے سرمایے میں اضافہ ثابت ہو رہی ہیں ڈاکٹر صاحبہ ادبی جلسوں میں وقت پر شرکت کرتی ہیں کسی بھی جلسے میں درمیان سے جاتے ہوئے کسی نے بھی انہیں نہیں دیکھا ہوگا ادارۂ ادبیاتِ اردو کے ادبی جلسوں میں بھی ڈاکٹر صاحبہ مضامین سناتی ہیں ان کے مضامین بہت مختصر مگر پُر اثر ہوتے ہیں۔ سننے پر یہی محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحبہ نے دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے ڈاکٹر صاحبہ مذہبی جلسوں کو بھی مخاطب کرتی ہیں ملک کی کئی یونیورسٹیوں کے سمینار میں شرکت کر چکی ہیں۔ پوری توجہ کے ساتھ ڈاکٹر صاحبہ کی تقریروں اور تحریروں کی پذیرائی ہوتی ہے۔ شہر کے صفِ اول کے قلمکاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے شہر میں آئے دن بہت سی ادبی تقاریب ہوتی ہیں لیکن ڈاکٹر صاحبہ اپنے معیار کو متاثر ہونے نہیں دیتیں۔ شہر کے تمام صاحبانِ فکر وفن سے واقف ہیں ڈاکٹر صاحبہ کا اندازِ تخاطب پُر اثر ہوتا ہے اپنے مخصوص لب ولہجے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کے سنجیدہ و ادبی مضامین کا لب ولہجہ بھی متاثر کن ہوتا ہے۔ ایک اچھے استاد کی طرح ان کا یہ وتیرہ ہے کہ اپنے اساتذہ کے احترام میں بھی کوئی کسر باقی نہیں رکھتیں اسی طرح سینیئر قلمکاروں کی عزت کرنا بھی اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتی ہیں

اُردو کے فروغ کے لئے کام کرنے والوں کی قدر کرتی ہیں چاہے وہ کسی بھی مکتبِ خیال سے کیوں نہ تعلق رکھتے ہوں ۔ انھیں اس سے مطلب نہیں رہتا کہ کونسی ادبی انجمن کس ادبی مسلک کی ترجمان ہے وہ صرف یہ دیکھتی ہیں کہ اُردو زبان و اُردو تہذیب کے تحفظ و بقاء کے لئے کون کونسی انجمنیں اور کون کونسی شخصیتیں سرگرمِ عمل ہیں وہ اُن کے ساتھ ہمیشہ تعاون کرتی ہیں اُن کی ہم زبان بھی ہوتی ہیں اور ان کے ہم قلم بھی رہتی ہیں ۔ علمی و ادبی مباحثہ میں بھی حصہ لیتی ہیں ۔ ان کی گفتگو دلائل کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔ علمی و ادبی معاملات میں نہایت ذمہ داری سے اپنا کام انجام دیتی ہیں کسی بھی موضوع پر کیوں نہ ہو جب قلم اُٹھاتی ہیں تو قلمکار سے بھی انصاف کرتی ہیں اور اُس کی تخلیق سے بھی ۔ ان کا لب و لہجہ اثباتی پہلوؤں کا آئینہ دار ہوتا ہے ۔ ان کا ناقدانہ انداز ناصحانہ ہوتا ہے جارحانہ نہیں ۔ صرف اشاروں کنایوں میں اپنی بات کہہ جاتی ہیں یہ ایک ایسا وصف ہے جو ڈاکٹر صاحبہ کی علمی بصیرت کا غماز ہے میں بھی چاہوں گا کہ میری اُستاد کی شہرت بامِ عروج تک پہونچے ۔

عزیز النساء صبا

دکن کی کُل ہند شہرت یافتہ شاعرہ، شائستہ خاتون

اُردو شعر و ادب کا تہذیبی ماحول اُن باشعور قلمکاروں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتا رہا ہے جو اُردو زبان اور اُردو تہذیب کی دل و جان سے [illegible] کرتے ہیں اور جو اپنے فکر و خیال کے نکھرے ستھرے اور شائستہ رویہ سے معاشرہ کے خد و خال میں کچھ اس طرح رنگ بھرتے ہیں کہ ان کا رنگ و روپ تر و تازہ تر ہوتا چلا جاتا ہے۔

کوئی بھی فن کیوں نہ ہو وہ چاہتا ہے کہ اس کی خونِ جگر سے آبیاری کی جائے اور اس کو اس انداز سے برتا جائے کہ اس کے چہرہ کی رنگت میں کمی نہ آنے پائے۔ فن چاہتا ہے کہ اس کا حسن و جمال نکھرتا ہی چلا جائے۔ جن فنکاروں کے خیالات میں جولانی ہوتی ہے جذبات میں پاکیزگی، مشاہدات میں سچائی اور محسوسات میں شدت ہوتی ہے ایسے فنکار کبھی بھی کاغذ قلم کی آبرو کو متاثر ہونے نہیں دیتے۔ خدا نے برتر سے برتر تخلیق کاروں کے ہاتھوں میں قلم تھما دیا

ہے ان سے کبھی ایسا نغمہ جنم نہ لے جو اپنی ماہیت کھو بیٹھے۔ زندگی کے مختلف رنگوں میں ایک ایسا رنگ بھی ہوتا ہے جو ہر موسم میں نکھرتا چلا جاتا ہے۔ ہر اچھی شاعری ہر اچھی تخلیق پھولوں کے گل دستہ کی طرح اپنے ماحول کو مہکاتی رہتی ہے۔

غزل کی شاعری ہر مہذب شاعر کا خیر مقدم کرتی رہے گی۔ جو تخلیق کار دیانت داری کے ساتھ اپنے شاعرانہ منصب کا جائزہ لیتا ہے وہ اپنے تجربات و مشاہدات اور دلی کیفیات کو پُر اثر انداز میں پیش کرتا رہتا ہے اس کا فن اور اس کی شخصیت دامانِ شعر و ادب کو ہمیشہ مہکاتی رہتی ہے۔ ایسی ہی شائستہ و شگفتہ خصوصیات کی حامل شاعرہ عزیز النساء صبا بھی ہیں۔

شہرِ محبت حیدرآباد کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں ہر دور میں حیاتِ فکر و شعر کا بول بالا رہا ہے ہر شعبۂ حیات میں اپنی صلاحیتوں کا احساس دلانے والے ہنر مندوں نے سرزمینِ گوہر شناس کو سرچشمۂ حیات اور اس کو اپنے وجود کا ایک حصہ بنایا ہے۔

اس سرزمینِ مروت نواز کو بے شمار باکمال لوگوں نے اپنے ذہن و فکر کی دولت سے مالا مال کیا ہے۔ حیدرآباد کا دامن ہمیشہ علوم و فنون کی دولت کی ترویج و اشاعت اور اس کی برتری کے لئے کشادہ رہا ہے۔ ماں کے دامن کی طرح۔

آج بھی اس شہرِ دلنواز میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔

عزیز النساء صبا ہمارے شہر کی ایک معتبر، باوقار اور قابلِ احترام شاعرہ کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہیں جن کی شاعری دل و دماغ کو تہہ نشین رہتی ہے۔ میں عزیز النساء صبا سے اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں سے اُس وقت سے واقف ہوں جب وہ پوری توانائیوں کے ساتھ محفلِ شعر و ادب کا ایک حصہ بنیں۔ حیدرآباد کی شعری محفلوں نے عزیز النساء صبا کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ رفتہ رفتہ ان کی شاعرانہ شہرت سارے ملک میں پھیل گئی۔ صبا صرف حیدرآباد کے مشاعرے ہی نہیں پڑھتیں بلکہ ملک بھر کے مشاعروں میں ان کے کلام کی دل کھول کر پذیرائی کی گئی۔ مجھے صبا کے ساتھ کئی کل ہند مشاعرے پڑھنے کا موقعہ ملا ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ انہیں ہر مشاعرہ میں بھرپور داد و تحسین سے نوازا جاتا رہا۔ ربِ العزت نے صبا کو ظاہری و باطنی حسن و جمال سے نہایت فراخ دلی کے ساتھ نوازا ہے ان کی شخصیت کا سارا اثر ان کی شاعری میں ملتا ہے۔ جو فنکار جس قدر شائستہ و برگزیدہ ہوتا ہے اس کی تخلیقات اتنی ہی پُر اثر اور پُرکشش ہوتی ہیں۔ صبا خوش نصیب ہیں کہ انہیں شاعرہ کی حیثیت سے اچھی خاصی شہرت ملی۔ صبا جس محفل میں بھی جاتی ہیں وہاں ان کی شاعرانہ عظمت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ صبا کا اندازِ گفتگو مقابل کو متاثر کرتا ہے ان کی نرم گفتاری ان کا بیناد صفت ہے ذاتی شرافت اور طبیعت کی

نفاست نے انہیں اور بھی معتبر بنا دیا ہے ان کا منفرد طرزِ تکلم لطیف
[illegible] کا ترجمان رہا کرتا ہے سلجھی ہوئی شاعرہ ہونے کی وجہ
سے وہ [illegible] کل مسلک پہ عمل پیرا ہیں۔
صبا تقریباً ۲۵ برس سے شعر کہہ رہی ہیں۔ زیادہ تر غزلیں [illegible]
ہیں بہت کم شاعر ایسے ہوتے ہیں جن کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ان کی
ابتدائی شاعری کے زمانے ہی سے ہوتا ہے اور آخری دم تک نوازے
جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ صبا نے مختلف اصنافِ سخن میں شعر
کہے ہیں لیکن صنفِ غزل سے انہیں گہری وابستگی ہے۔ ان کے کلام میں
کلاسیکیت کی تمام اقدار کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کے سلگتے ہوئے
[illegible] کی بھی بھرپور عکاسی مل جاتی ہے ان کا سحر انگیز ترنم ان کے شعر اثر
[illegible] نمایاں ہوتا ہے شعر سناتی ہیں تو ساری محفل کو مسحور کر دیتی ہیں ان
نکھرے ستھرے لب و لہجے سے ایک خوشگوار کیفیت کا اظہار رہتا ہے۔
صبا حیدرآباد کی ایک بہت ہی اعلیٰ درجہ کی ادبی انجمن
محفلِ خواتین کی بانیوں میں سے ایک ہیں محفلِ خواتین کی سرگرمیوں [illegible]
بامِ عروج پر پہنچانے میں ان کی سعی و دلچسپی کو فراموش نہیں کیا [illegible]
ان دنوں وہ محفلِ خواتین کی جنرل سکریٹری کی حیثیت سے نمایاں [illegible]
انجام دے رہی ہیں۔ انہیں خاص طور پر محفلِ خواتین کی ناموراں شاعرہ
مظفر النساء ناز کا مکمل تعاون حاصل ہے۔
ادبی رسائل میں بھی ان کی تخلیقی سوغاتوں کی پذیرائی ہوتی

ہیں۔ اندنوں شہر کی بزموں سے آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن کے ذریعہ
بھی ہم ان کے کلام سے محظوظ و مستفیض ہو رہے ہیں۔ وہ نہایت
خوش اخلاق، ملنسار، رسم و راہ کو سلیقے سے برتنے والی شگفتہ
مزاج، شائستہ و مہذب شاعرہ ہیں۔ ان سے جو کوئی بھی ملتا ہے وہ
ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ صبا اپنے ساتھی
شاعرات میں مقبول ترین شاعرہ سمجھی جاتی ہیں۔ ہم حیدرآبادیوں
کو یہ فخر حاصل ہے کہ صبا ہمارے شہر کی ایک ایسی شاعرہ ہیں جن
کے فکر و فن کے نذرانے ہمیشہ چمکتے رہیں گے اور جن کی شاعری و
شخصیت کی خوشبو ہر موسم میں اپنا بھرپور احساس دلاتی رہے گی۔

ڈاکٹر اختر سلطانہ

(شائستہ گھرانے کی نیک سیرت خاتون، صاحب طرز ادیبہ)

ڈاکٹر اختر سلطانہ میری منہ بولی بہن ہیں۔ صالحہ الطاف سے رشتے کے ستے کی ایک روشن علامت۔ صالحہ آپ کے گھرانے کے تمام لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ صالحہ آپا جامعہ عثمانیہ کی گریجویٹ تھیں۔ ایک ادبی رسالہ خاتونِ دکن کی مدیر تھیں بہت سے علمی، ادبی، تعلیمی و تہذیبی موضوعات پر مضامین لکھ چکی ہیں ایک کتاب "آؤ اقبال سے ملیں" شائع کیں۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ، صالحہ الطاف کی چھوٹی بہن ہیں۔ دوسری بہنیں نجمہ سعید (مرحوم)، ڈاکٹر صابرہ سعید اور عذرا سعید ہیں۔

میں جب رسالہ خاتونِ دکن سے وابستہ ہو گیا تو ڈاکٹر اختر سلطانہ کے صرف نام سے واقف تھا ان سے نہ تو ملاقات ہوئی تھی اور نہ ہی انھیں میں نے کہیں دیکھا تھا۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ اپنے سسرال میں رہتی تھیں صالحہ الطاف صاحبہ کے گھر پر خاتونِ دکن کا آفس تھا صالحہ الطاف اپنے والدین

اور بھائی بہنوں کے ساتھ ان کے گھر واقع محلہ مکڑ کی باؤلی میں رہتی تھیں۔ سوائے اختر سلطانہ کے تمام افراد خاندان سے میری ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ کو اُردو ادبیات سے کافی لگاؤ ہے ان کے شوہر جناب محبوب علی سنگ سیلو کے مشہور تاجر ہیں۔ سکریٹریٹ کے قریب علی گڈھ کلب سے متصل اُن کا مکان تھا وہاں مجھے ۳، ۴ دفعہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ عذرا سعید اُن کی چھوٹی بہن ہیں جو ایک بہت ہی عمدہ آرٹسٹ ہیں اُن کی پینٹنگ کے سلسلے میں اخبار سیاست کے لئے مضمون لکھنا تھا عذرا سے ملنے کے لئے جاتا تھا جب ڈاکٹر صابرہ سعید نے جامعہ عثمانیہ سے اُردو میں افسانہ نگاری کے زیر عنوان پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تو اس سلسلے میں ایک تہنیتی تقریب ڈاکٹر اختر سلطانہ کے گھر پر منعقد ہوئی تھی۔ جہاں پر پروفیسر سینی تنسیم، پروفیسر گیان چند جین، ڈاکٹر غلام عمر خان اور دیگر اساتذہ ——— بھی مدعو تھے۔ ایک اور تقریب میں میں بھی مدعو تھا اُس تقریب میں مشہور کرکیٹر جناب غلام احمد صاحب بھی مدعو تھے ڈاکٹر اختر سلطانہ اُن دنوں ادبی محفلوں میں شاید ہی شرکت کرتی تھیں۔ انہیں ایک ادیب کی حیثیت سے شعر و ادب کی دنیا سے واسطہ رکھنے کا شاید کبھی خیال بھی نہ آیا ہو۔ ویسے اُن کے مطالعہ میں شعر و ادب سے متعلق مختلف مکاتب خیال کے دانشوروں کی کتابیں رہتی تھیں۔ اُردو کے علاوہ انگریزی ادبیات کا بھی اُن کا گہرا مطالعہ ہے۔ شعر میں مضامین کے لئے اختر سلطانہ سے فون پر گفتگو ہوتی

رہی۔ جب ان کے مضامین مجھ کو ملتے تو انھیں پڑھ کر مجھے حیرت ہوتی کہ ایک ایسی خاتون جو کسی شعری و ادبی محفل میں دکھائی نہیں دیتیں۔ سمینار یا سمپوزیم میں حصہ نہیں لیتیں وہ کس طرح اتنی عمدہ تحریروں کی خالق ہیں۔ اختر سلطانہ کے مضامین نہ صرف ادب کے موضوع پر ہی ہوتے ہیں بلکہ تہذیبی اور اصلاحی موضوعات پر بھی ملتے رہے ہیں۔ انھوں نے دوسری زبانوں کے قلمکاروں کی اکثر تخلیقات کا ترجمہ کیا ہے کچھ ترجمہ شدہ کہانیاں "خوشبو کا سفر" میں چھپ چکی ہیں۔ ماہنامہ "سب رس" میں بھی اختر سلطانہ کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ـــ اختر سلطانہ سے میری پہلی شخصی ملاقات صالحہ الطاف کے تعزیتی جلسہ میں ہوئی تھی جو ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی جانب سے مولانا ابو الکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا تھا۔ دوسری ملاقات صالحہ الطاف کی زیر اشاعت کتاب "صالحہ الطاف فن اور شخصیت" کے سلسلے میں الطاف بھائیؒ (الطاف حسین) کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی ڈاکٹر صابرہ سعید بھی اُس وقت موجود تھیں۔ کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں ہم تینوں کو آپس میں مشورہ کرنا تھا۔ ویسے خوشبو کا سفر کے سلسلے میں فون پر گفتگو ہوا کرتی ہے۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ کا لب و لہجہ انتہائی شائستہ، متوازن، پُراثر و باوقار رہتا ہے۔ اندازِ گفتگو سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ مہذب معاشرہ کی پروردہ، شائستہ و باسلیقہ خاتون ہیں۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ نے ہی مجھے صالحہ الطاف کے انتقال کی خبر دی تھی۔ صالحہ الطاف کی کتاب کی اشاعت کا جب میں نے مصمم ارادہ

کر لیا تو سب سے پہلے میں نے الطاف بھائی (سید الطاف حسین) سے ذکر کیا انہوں نے کہا کہ بہت ہی اچھا خیال ہے۔ کتاب شائع کیجئے۔ میں نے کہا تھا کہ صالحہ آپا کی خدمت میں میرا یہ نذرانۂ عقیدت ہوگا۔ کتاب کی صورت گری کا آغاز ہوا۔ کتاب میں اُن کے مضامین، سفرنامے، افسانے، خطوط اور دیگر تحریروں کے علاوہ ان سے متعلق شاعروں، ادیبوں اور اُن کے افرادِ خاندان کے مضامین بھی شامل کیے گئے۔ اگرچہ میں اس کتاب کا مرتب ہوں لیکن میں نے ڈاکٹر اختر سلطانہ اور ڈاکٹر صابرہ سعید کے نام معاون مرتب کی حیثیت سے شامل کیے ہیں۔ چونکہ میں نے کتاب کی ترتیب کے دوران دونوں بہنوں سے تعاون حاصل کیا تھا اس کتاب سے ان دونوں بہنوں کا جذباتی تعلق برقرار ہے۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ نے صالحہ الطاف کے تعزیتی جلسہ میں بہت ہی پُراثر مضمون پڑھا تھا جو خراجِ عقیدت کے سلسلے کی ایک پُراثر تحریر تھی۔ ڈاکٹر اختر سلطانہ نے "قرۃ العین حیدر۔ حیات اور کارنامے" کے زیرِ عنوان سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے وہ ایک گھریلو خاتون ہیں اپنی ذمہ داریوں کو پوری طرح نبھاتی ہیں پھر زبان و ادب کی طرف متوجہ ہوتی ہیں ڈاکٹر اختر سلطانہ صاحبانِ فکر و فن کے حلقوں میں توقیر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہیں صرف خواتین کی ادبی محفلوں میں شرکت کرتی ہیں محفلِ خواتین سے ان کی وابستگی ہے انہوں نے محفلِ خواتین کے جلسوں میں صدارت بھی کی اور مضامین بھی پڑھے۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو (شعبۂ خواتین) کے زیرِ اہتمام ہونے

والی محفلوں میں بھی شرکت کرتی ہیں اور اپنی عمدہ تحریروں سے اپنی صلاحیتوں کا احساس دلاتی ہیں عام تقاریب میں شرکت کرنا انہیں پسند نہیں ہے ان کا زیادہ تر وقت اپنے گھر ہی میں اچھی اچھی کتابوں کے مطالعہ میں گذرتا رہتا ہے یا پھر شوہر اور بچوں کی خدمت میں لگی رہتی ہیں اختر سلطانہ کا گھر بھی صالحہ الطاف کے گھر کی طرح پُر سکون ہے گھر کے تمام افراد شائستگی اور اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں۔ ذاتی شرافت، طبیعت کی پاکیزگی، پاک و صاف ذہن اور شفاف آئینہ کی طرح ان کا دل ایسی باتوں کو کبھی قبول نہیں کرتا جو معاشرہ کے لئے سوالیہ نشان بنا رہتا ہے۔

ڈاکٹر اختر سلطانہ کے بارے میں ان کی قابلیت، اور ان کی ادبی صلاحیتوں اور تخلیقات کے بارے میں صالحہ الطاف اور ڈاکٹر صابرہ سعید سے اکثر فون پر بات ہوا کرتی تھی۔ اختر سلطانہ، صالحہ الطاف کا بے حد احترام کرتی تھیں صالحہ الطاف اُن کی بڑی بہن تھیں آپس کے مرتبے کا ہمیشہ خیال رکھتی تھیں، جو چھوٹوں پر ہے حد خلوص و پیار ہے صالحہ الطاف کے انتقال کا اختر سلطانہ کو بھی بے حد صدمہ ہے وہ اپنی ایک شفیق بہت اچھی دوست سے محروم ہوئی ہیں۔ صالحہ الطاف، اختر سلطانہ، صابرہ سعید جیسے شائستہ گھرانے شہر میں بہت کم رہ گئے ہیں جہاں خیر و برکت کی بارش ہوتی رہتی ہے یہ گھرانے ان کے اپنے بزرگوں کی روایات کے امین ہیں یہ لوگ اپنے والدین اور اسلاف کی دعاؤں کے زیر سایہ خوشحال زندگی گذار رہے ہیں۔ خدا ان گھرانوں کو ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے۔

مظفر النساء نازؔ

حیدرآباد کی پُروقار خاتون سلجھی ہوئی شاعرہ

احاطۂ سکریٹریٹ میں محکمۂ قانون سے وابستہ ایک برقعہ پوش لڑکی پر جب پہلی دفعہ میری نظر پڑی تو میں ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اس کے ہمراہ محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ایک لڑکی شمیمہ بھی تھی۔ یہ دونوں جی۔ اے۔ ڈی اور محکمۂ تعلیمات کے موڑ پر محوِ گفتگو تھیں۔

اُن دنوں سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ آل انڈیا ریڈیو اور دیگر ادبی و شعری پروگرامس کے سلسلے میں مجھے سکریٹریٹ میں کام کرنے والے باصلاحیت فنکاروں، شاعروں اور ادیبوں کی تلاش تھی۔ سکریٹریٹ میں بہت سی ادب دوست لڑکیاں کام کرتی تھیں۔ یاد نہیں کہ مظفر النساء نازؔ سے میرا تعارف کہاں اور کس جگہ ہوا تھا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ محکمۂ قانون سے وابستہ ایک آندھرائی ڈرامہ آرٹسٹ عبدالغفور نے تعارف کرایا تھا۔ مظفر النساء

سے تعارف کے بعد میں نے اُن سے سکریٹری اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں شامل ہونے کی خواہش کی۔ مظفر النسا ناز سکریٹری کی دیگر شریکوں کے ساتھ شریک انجمن ہوگئیں۔ میں نے مظفر النسا ناز کو شعبۂ خواتین کا انچارج بنایا۔ سکریٹری کی جن شریکوں نے اُردو اسوسی ایشن سے وابستگی اختیار کی اور پروگرامس میں حصہ لینا شروع کیا، اُن میں۔ مظفر کے علاوہ شمسیہ شیریں قابلِ ذکر ہیں۔

مظفر النسا ناز کو شاعری کا بے حد شوق ہے وہ اُن دنوں افسانے بھی لکھا کرتی تھیں مظفر النسا ناز بیک وقت میری شاگرد بن گئی اور بہن بھی۔ میں نے سکریٹری اُردو اسوسی ایشن کے مشاعروں کے علاوہ شہر کے بعض اچھے اور ثقہ قسم کے مشاعروں میں کلام سنانے کی ترغیب دی۔ جب محفلِ خواتین کا قیام عمل میں آیا تو وہ محفلِ خواتین سے وابستہ ہوگئیں۔ مظفر النسا ناز کے شوہر فخر الدین نیاز بھی شعر کہتے ہیں لیکن وہ مشاعروں میں کلام نہیں سناتے۔ مظفر کے ادبی ذوق کی ترغیب میں نیاز صاحب کا بھرپور تعاون شامل ہے شعر و ادب کی وساطت سے ہمارے روابط بڑھنے لگے۔ مظفر بلاتکلف میرے گھر آیا کرتی۔ میرے اہلِ خاندان' مظفر کی فراخ دلی سے پذیرائی کیا کرتے۔ جب تک مظفر النسا ناز سکریٹریٹ میں رہیں اسوسی ایشن کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہیں۔ جب ان کا تقرر انگریزی بورڈ (دیہت سودھا) میں ہوا تو انہوں نے وہاں کی بزم

اُردو کی سرگرمیوں میں دلچسپی لینی شروع کی۔ مظفر النسا ناز کے شعری ذوق کو محسوس کرتے ہوئے میں نے صدر محفلِ خواتین عظمت عبدالقیوم سے خواہش کی تھی کہ مظفر النسا ناز کو محفلِ خواتین کا رکن بنائیں۔ محترمہ عظمت عبدالقیوم نے نہ صرف رکن ہی بنایا بلکہ شریک معتمد و خازن کی ذمہ داری بھی سونپ دی۔ مظفر ایک اچھی شاعرہ ہی نہیں ایک اچھی آرگنائزر بھی ہیں۔ محفلِ خواتین کے لئے مظفر کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ مظفر النسا ناز حیدرآباد کی شاعرات میں اپنے مزاج کی شائستگی، طبیعت کی پاکیزگی۔ سلیقہ شعاری اور وضعداری کی وجہ سے اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں مظفر نے شہر کے مشاعروں کے علاوہ اضلاع کے بعض خاص خاص مشاعرے بھی پڑھے ہیں۔

محفلِ خواتین کی سرگرمیوں کے سلسلے میں ہم عظمت عبدالقیوم کی رہائش گاہ "خیابان" امیر پیٹ میں اکثر ملا کرتے تھے۔ عظمت عبدالقیوم مظفر کو بہت چاہتی تھیں۔ محفلِ خواتین کی سرگرمیوں میں اُن پر بھروسہ کرتی تھیں۔ عظمت عبدالقیوم کے تفویض کردہ ہر کام سلیقہ سے انجام دیا کرتی تھیں۔ وہ آج بھی محفلِ خواتین کی شریک معتمد اور خازن ہیں۔ اور پُر اعتماد فضا میں کام کر رہی ہیں۔ مظفر النسا ناز مشرقی ماحول کی ایک ـــــ مہذب خاتون ہیں۔ خاموشی، کم سخنی، بُردباری اور بزرگوں کا احترام اُن کی طبیعت کا خاصہ ہے

بانیانِ محفلِ خواتین میں ایک اہم نام مظفر النسا ناز کا بھی ہے

جو قیام محفلِ خواتین (۱۹۷۲ء) یعنی ۳۲ برسوں سے محفلِ خواتین کی شریک معتمد و خازن کی ذمہ داریوں کو نہایت خوش اسلوبی، دیانت داری اور فرض شناسی کے ساتھ نبھا رہی ہیں۔ شعری ادب سے مظفر النساء ناز کی والہانہ دلچسپی اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ وہ اردو ادب اور اردو تہذیب کی پروردہ ہیں۔

مظفر النساء ناز کی خواہش پر ان کے شعری ذوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے مشورۂ سخن کے لئے سرپرستی قبول کی۔ مظفر النساء ناز ایک باصلاحیت، تر و تازہ دل و دماغ کی حامل شاعرہ و ادیبہ ہیں۔ انہیں اردو شاعری سے والہانہ وابستگی ہے ان کا شعری سفر جاری ہے خوشبو کے سفر کی طرح۔ مظفر النساء ناز کا کلام روزنامہ سیاست کے علاوہ خوشبو کا سفر میں بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ سیدھے سادے پُر اثر خیالات سے مزین ان کی شاعری دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ مظفر النساء ناز کے تاحال تین شعری مجموعے بات پھولوں کی (۱۹۸۶ء) روشنی (۱۹۹۸ء) اور کتنا روشن میرا گھر ہے (۲۰۰۲ء) میری زیرِ نگرانی شائع ہو چکے ہیں۔ مظفر النساء ناز ان دنوں مینیجر ای سیوا سنٹر (تھری ٹیئم) حکومت آندھرا پردیش کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں۔ اگر انسانی رشتوں کی بنیاد بے لوث خلوص، پاکیزہ جذبات اور شرافت نفس کی آئینہ دار ہو تو ایسے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے بلکہ جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں۔ اُن رشتوں کی تازگی اور شگفتگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

یوسف یکتا

(شعری محفلوں کی برگزیدہ شخصیت۔ معتبر شاعر)

بعض لوگوں کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ [illegible] شرافت
زندگی کی [illegible] جارہی ہے۔ یہ بات غلط بھی نہیں ہے لیکن
دیکھا گیا ہے کہ کچھ شریف لوگ ابھی باقی ہیں۔ ویسے بھی اچھے لوگ
کم ہی ملتے ہیں۔ جب کبھی کچھ مخلص اور شائستہ اور باکردار لوگوں
سے ملاقات ہوتی ہے تو کچھ دیر کے لیے ہی آس پاس کا ماحول گل
افشاں رہتا ہے۔ محبت و شرافت، نفاست اور مروت کی
روشنی زندگی کے خدوخال میں اس انداز سے رنگ بھرتی ہے کہ اس
کا وقار بڑھنے لگتا ہے۔ شریف لوگوں کی صحبت کا ایک ایک لمحہ
لمحہ سہاونا بن جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگوں سے ملاقات کرتے
ہوئے، ان سے گفتگو کرتے ہوئے ایک خوشگوار مسرت کا احساس

ہوتی ہے۔ اگر ہر سوسائٹی میں تھوڑے بھی شریف لوگ ہو جائیں تو تو وہ تمام کی ساری رعنائیاں موسم بہاراں کی پہلی ... کی طرح خوشی و مسرت کا پیغام لے آتی ہیں۔ اگر مجھ سے کوئی کہے کہ میں اپنے دوستوں میں شامل کچھ منتخب لوگوں کی فہرست بناؤں تو اس میں یوسف یکتا صاحب کا نام بھی ملے گا۔ میرے دوستوں کی فہرست میں کچھ ایسے شریف لوگ بھی شامل ہیں کہ جن کو ایک دوسرے پر فوقیت دینے کے لیے کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔ یوسف یکتا صاحب میرے دیرینہ شاعر دوست ہیں۔ ان سے میرے شاعرانہ دوستانہ مراسم زائد از ۳۵ برس سے ہیں لیکن ۸۵ء سے میرے بہت نزدیک آگئے ہیں۔ جب کبھی میرا کسی شخص کی زندگی، شخصیت اور دوستی کے مختلف گوشوں پر کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے تو تمہیدی عبارت کا آغاز اس مخصوص شخص کی ابتدائی ملاقات سے کرتا ہوں اور میں جب کسی شخص کے بارے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں تو اولین ملاقاتوں سے کچھ لمحے سرگوشیاں کرتے ہوئے میرے پاس ہی رہنے لگتے ہیں۔ یوسف یکتا صاحب سے میری ملاقات اُن کے ابتدائی آفس محکمہ صنعت و حرفت کے زیرِ اہتمام منعقدہ ایک مشاعرہ کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ اُن دنوں نریندر لوتھر صاحب اُس محکمہ کے ناظم تھے۔ اُس زمانے میں یوسف یکتا صاحب کا کلام شہر کے بعض اخبارات میں شائع ہوا کرتا تھا۔ اُس دور کے مخصوص و نمائندہ مشاعروں میں قدیم و جدید شعراء اپنا کلام سنانے تھے یوسف یکتا صاحب سے گاہے گاہے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ یوسف یکتا صاحب

ڈپٹی ڈائرکٹر ہیلتھ سروس کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔ یقیناً وہ اپنے آفس کے ساتھیوں اور عہدہ داروں میں اپنی شرافت اور اپنی منکسر المزاج طبیعت کی وجہ سے مقبول رہے ہوں گے۔ سکندرآباد میں ہونے والے مشاعروں میں بھی ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ وہاں کی ادبی انجمنوں کی سرگرمیوں سے یکتا صاحب کا قریبی لگاؤ تھا۔ وہ مشاعروں کے بہترین انعقاد کے لئے ہمیشہ سرگرم عمل رہتے تھے۔ ان کے رفقائے کار میں ان کے ہم خیال ممتاز شاعر شاغل ادیب ہیں۔ سکندرآباد کی ادبی انجمنوں سے ان کی وابستگی کہیں تو کسی عہدہ دار کی حیثیت سے اور کہیں رکن کی حیثیت سے رہا کرتی تھی۔ سکندرآباد کے مشاعروں کے علاوہ شہر میں اُن [illegible] عمدہ مشاعروں میں ہم نے ساتھ ساتھ شعر پڑھے ہیں۔ جب یوسف یکتا صاحب ادارہ میرا شہر میرے لوگ سے وابستہ ہوگئے تو ان کی شاعرانہ عظمتوں کو سمجھنے کا مجھے زیادہ موقع ملا۔ مجھے اندازہ ہونے لگا کہ اس مختصر پیکر میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو بعض اساتذۂ سخن کی خصوصیات ہوا کرتی ہیں۔ میں یوسف یکتا صاحب کے اندازِ گفتگو ان کے رکھ رکھاؤ اور ان کی وضع داری سے متاثر ہو کر اُن کی جانب کھنچتا چلا گیا۔ اب تو یہ حال ہے کہ ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی محفلوں میں ان کی شرکت لازمی ہوا کرتی ہے اس کے علاوہ سوغاتِ نظر، خورشید احمد جامی میموریل اکیڈیمی بزمِ جمہور اور محبانِ اردو کے مشاعروں میں شریک ہو کر اپنے بہترین کلام اور پُر اثر ترنم سے مشاعرہ پر چھا جاتے ہیں۔ ان کی شاعری کی عمر زائد از ۴۰ سال

کی ہے۔ ان کے دو شعری مجموعے گونگی دعا (۱۹۹۴ء) اور غنچۂ عطر بیز (۲۰۰۱ء) شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ یوسف یکتا صاحب کا کلام شہر کے اردو اخبارات "سیاست" اور "منصف" میں شائع ہونے کے علاوہ ماہنامہ خوشبو کا سفر میں بھی شائع ہوتا رہتا ہے۔ یوسف یکتا صاحب کو میں نے ہمیشہ متاثر کن ترنم میں کلام سناتے دیکھا ہے جب وہ کلام سناتے ہیں تو ایک سماں بندھ جاتا ہے اور ساری محفل پر کیف و سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یوسف یکتا صاحب جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں ان کے اندازِ تخاطب سے پتہ چلتا ہے کہ معززہ صاحبانِ قرطاس و قلم کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انکساری، بردباری، شرافت اور اخوت ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔ یہ ایسے پر خلوص انسان ہیں کہ ان سے ملنے اور گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یکتا صاحب پرانی تہذیب کے آدمی ہیں۔ ان کی نرم گفتاری سبک خرامی قابلِ تقلید ہے۔ اپنے دوستوں سے خوش دلی کے ساتھ محوِ کلام رہتے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہماری محفل کا ہر شاعر یہ چاہتا ہے کہ وہ ان کے قریب بیٹھا رہے۔ معاشرہ میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جانا بہت اچھا کی بات ہے۔ یوسف یکتا ہماری محفلوں کا وقار بڑھانے والے ایک اہم شاعر ہیں۔ میں ایسے شریف لوگوں کو ہمیشہ اپنے قریب پاتا ہوں۔ یوسف یکتا صاحب ایک بہترین انسان نفیس دوست اور ایک نامور شاعر کی حیثیت سے ہماری محفلوں کی پہچان بن چکے ہیں۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ ان کی شریفانہ و شاعرانہ پہچان ہمیشہ برقرار رہے۔ یوسف یکتا صاحب کے لیے

ہیں سخن سازی کا شوق نہیں ہے لیکن جب وہ کسی انجمن سے وابستہ ہو جاتے یا کسی انجمن کی تشکیل ضروری سمجھتے ہیں تو اس بات کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ وابستگان انجمن نہ صرف معقول لوگ ہوں بلکہ انہیں واقعتاً زبان و ادب سے دلچسپی ہو۔ یوسف یکتا صاحب اس وقت جن ادبی انجمنوں سے وابستہ ہیں ان میں تقریباً ان کے ہم خیال احباب شامل ہیں۔ یوسف یکتا صاحب پرانی اقدار کی ایک باوقار شخصیت ہیں۔ تہذیبی و انسانی رشتوں کی دل و جان سے قدر کرتے ہیں۔ نہایت سیدھے سادے شریف آدمی ہیں۔ جس کسی سے بھی ملاقات کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بھرپور مسرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یوسف یکتا صاحب بعض اضلاع کے مشاعروں میں بھی ہمارے ساتھ رہے ہیں محفل کے آدمی ہیں تحت میں شاید ہی کبھی کلام سنایا ہو۔ پُر اثر ترنم سے کلام سنا کر سماں باندھ دیتے ہیں یوسف یکتا صاحب مختلف اصناف سخن میں شعر کہتے ہیں ان کے دونوں مجموعوں میں غزلوں کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی کلام ملتا ہے یوسف یکتا صاحب جیسے وضع دار لوگ شعری و ادبی محفلوں کی زینت بڑھایا کرتے ہیں شاعری کے اتنے لمبے سفر کے بعد بھی ان کا قلم چل رہا ہے۔ خدا کرے ان کا قلم چلتا ہی رہے۔

شاغل ادیب

(رسائل کی دنیا کا شاعر۔ شریف آدمی۔ بہترین دوست)

اب تو ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ شاغل ادیب کا لکھنا پڑھنا ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا ہے۔ جب کبھی شاغل ادیب سے ملاقات ہوتی ہے تو ان کے ہاتھوں میں کوئی ایک ادبی رسالہ دکھائی دیتا ہے جیسے آجکل تو کبھی شاعر، کبھی کتاب نما، کبھی انشاء، کبھی اُردو دنیا، کبھی انتساب، کبھی شب خون تو کبھی خوشبو کا سفر۔ ملک بھر کے رسائل اس بات کے ضامن ہیں کہ اردو کے تقریباً تمام اہم ادبی رسائل میں ان کی شاعری یا ان کی تحریر موجود رہتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شاغل ادیب کا یہ حال ان کے ریٹائرمنٹ کے بعد کا ہے بلکہ وہ جس وقت برسرِ خدمت تھے اُس وقت بھی وہ ادبی رسائل کی معرفت اپنی بہترین شاعری اور عمدہ نثر نگاری کا ثبوت دیا کرتے تھے۔

شاغل ادیب ریلوے اکاونٹس کے صدر دفتر میں اکاونٹس آفیسر

ی خدمت انجام دیتے رہے۔ وہ ہبلی (کرناٹک) اور بھساول پور (مہاراشٹرا)
میں بھی رہے۔ سکندرآباد ریلوے آفس میں وہ برسوں رہے۔ سکندرآباد
کی علمی و ادبی و ثقافتی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے ہیں جب تک
وہ سروس میں تھے سکندرآباد کی شعری و ادبی محفلوں سے کچھ زیادہ ہی وابستہ
رہے۔ سکندرآباد کی جن ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے ان میں بزمِ اُردو
سکندرآباد، ساؤتھ سنٹرل ریلوے اُردو اسوسی ایشن، کاروانِ ادب اور
بزمِ عبرت قابلِ ذکر ہیں۔ رہتے تو ہیں مشیرآباد میں لیکن سکندرآباد میں
ان کی ملازمت ہونے کی وجہ سے ان کی پہلی پہچان سکندرآباد کی ادبی محفلوں
اور شاعروں سے ہی ہوئی۔ سکندرآباد میں کئی مشاعرے پڑھے یوسف یکتا
ان کے قریب ترین شاعر دوستوں میں شمار کیئے جاتے ہیں۔ شاغل ادیب
کی شاعری اور نثر میں تاحال آٹھ کتابیں شائع ہوئی ہیں (۱) ذکرِ اعظم
(۲) دریائے کرم (۳) حروفِ تابندہ (۴) دکھوں کا سمندر، سکھوں کا جزیرہ
(۵) فیضِ بشارت (۶) ادبی مضامین کا مجموعہ (۷) شاعری حصہ میں
آگئی ہے (۸) بچپن کے گیت ــــ لکھنے پڑھنے کی شریفانہ مصروفیات
نے ان کو اپنے دامن سے باندھ رکھا ہے۔ انتہائی خوشگوار اور علمی مصروفیات
میں اپنے شب و روز گزار رہے ہیں۔ شاغل ادیب نہ صرف ایک عمدہ
شاعر کی حیثیت ہی سے اُردو دنیا میں شہرت رکھتے ہیں بلکہ بہترین
نثر نگار کی حیثیت سے بھی انہوں نے اپنی پہچان بنالی ہے۔ ادبی رسائل
میں کلام کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی مضامین بھی شائع ہونے لگتے ہیں

اکثر شاعر ایسے بھی ہیں جو نثری ادب سے کم دلچسپی لیتے ہیں لیکن شاغل
ادیب نثر و نظم دونوں سے انصاف کرتے ہیں جامعہ عثمانیہ سے بی اے
اور شیواجی یونیورسٹی کولھاپور سے امتیازی حیثیت سے ایم اے اردو کیا
کیا۔ شاغل ادیب غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ مذہبی شاعری
میں بھی پوری عقیدت و احترام کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے
ہیں۔ شاغل ادیب کلاسیکی اقدار کے شاعر ہیں۔ کلاسیکی شاعری کو
بنیاد بنا کر عصرِ حاضر کے تقاضوں پر مشتمل خیالات کو بھی شاعری کا
لباس پہنا رہے ہیں۔ ان کی بعض کتابوں پر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش
اور اترپردیش اردو اکیڈمی نے انعامات سے نوازا ہے۔ کیا ہی شاعر کیوں
نہ ہو وہ عصری آگہی سے بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی شاعر یہ کہتا
ہے کہ وہ جدید شاعر ہے تو اسے دعویٰ کرنے کا حق پہنچتا ہے لیکن
وہ جدید شاعر سے پہلے قدیم شاعر بھی ہے یعنی کوئی شاعر کیوں نہ ہو وہ
شاعری کی قدیم روایات سے وابستہ رہتا ہے اگر کوئی شاعر ایسا بھی
ہے جو پوری طرح کلاسیکی اقدار سے اپنا رشتہ توڑ رکھتا ہو تو وہ ادبی
فضاؤں میں معلق ہو کر رہ جاتا ہے وہ لاکھ کوشش کے باوجود اپنے
فن سے باذوق سامعین و ذہین قارئین کو متاثر نہیں کر سکتا۔ اس
کی شاعری برائے نام رہ جاتی ہے کوئی تاثر نہیں چھوڑتی۔ شاغل ادیب
ایک رواں دواں شاعر ہیں ان کا کلام متحرک ہے وہ زندہ حقیقتوں
کو اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں ان کی شاعری میں زندگی کی حرارت ملتی ہے

مشاہدات کی گرمی اور جذبات کی تروتازگی ملتی ہے وہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں اور جو کچھ دیکھتے ہیں ان کیفیات کو اپنے کلام میں سمو تے ہیں۔ انھیں اپنے کلام کا ایک اہم عنصر بناتے ہیں۔ ان واردات کو خوبصورت انداز میں اشعار کے روپ میں پیش کرتے ہیں معاشرہ وہ سب کچھ دیتا ہے جس کی ان کو ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شاغل ادیب اپنے فکر وفن کی قدر جانتے ہیں۔ اپنی بات اور اپنے محسوسات کو سلیقے سے پیش کرتے ہیں اور سامعین و قارئین تک اپنا پیغام پہونچاتے ہیں اچھے شاعر کا یہی تو ایک اچھا وصف ہوتا ہے کہ وہ اپنے اشعار سے معاشرہ کے شب و روز کو شفاف آئینہ کی طرح پیش کرتا ہے اور اس کی پیش کشی کو دنیائے ادب قبول کرتی ہے۔ شاغل ادیب زیادہ چھپنے والے شاعر ہیں مشاعرے بھی پڑھتے ہیں لیکن رسائل کی دنیا سے وہ زیادہ قریب ہیں شاغل ادیب سے میری ملاقات شاید ۳۰ برس پہلے ہبلی (کرناٹک) کے مشاعرے میں ہوئی تھی اس کے بعد برسوں ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی سکندرآباد کے مشاعروں میں ملاقات ہو جاتی تھی شہر کے مشاعروں میں کہیں بھی ان سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ ادھر گذشتہ ۱۰-۱۲ برس سے وہ شہر کے شاعروں اور ادبی محفلوں میں دکھائی دینے لگے ہیں۔ شاغل ادیب انتہائی شریف پاک و صاف انسان ہیں۔ ایسے لوگ جن کا ظاہر و باطن یکساں رہتا ہے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ جب شاغل ادیب شہر کی بعض محفلوں میں نظر آنے لگے تو میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ شخص تو اپنے ہی قبیلے کا ہے پھر وہ ہمارے

محفلوں میں یعنی ادارۂ میرا شہر میرے لوگ، ایوانِ پرنس معظم جاہ شجیع سوغاتِ نظر، جامی میموریل اکیڈیمی اور بزم جوہر میں شرکت کرنے لگے۔ وہ میرا شہر میرے لوگ کی محفلوں میں نسبتاً دوسری محفلوں کے زیادہ اور پابندی سے شریک ہوتے ہیں اور اپنے بہترین کلام سے سامعین کو محظوظ کیا کرتے ہیں آل انڈیا ریڈیو سے ان کا کلام اور مضامین نشر ہوتے ہیں وہ دور درشن سے بھی کلام سناتے ہیں شاغل ادیب ترنم سے بھی کلام سناتے ہیں اور تحت اللفظ میں بھی۔ پہلے زیادہ تر ترنم میں اپنا کلام سنایا کرتے تھے لیکن اِدھر کچھ عرصہ سے وہ تحت اللفظ میں کلام سُنا رہے ہیں ان کا ترنم دھیمے سروں سے شروع ہوتا ہے اور اپنی ساری مٹھاس کے ساتھ غزل کے آخری شعر یعنی مقطع تک پہنچتا ہے۔ شاغل ادیب تقریباً تمام اصنافِ سخن میں شعر کہتے ہیں۔ شاغل ادیب ایک متحرک، فعال اور کارکرد فن کار کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں وہ ایک ایسی رواں دواں شخصیت کا نام ہے جن کے قدم بڑھتے ہی رہتے ہیں رکتے نہیں۔ اور ایسے لوگ جو مسلسل سفر میں رہتے ہیں ان کی نگاہ روشن، دل منور اور اُن کی فکر تازہ رہتی ہے۔ کئی برسوں سے یہ محسوس کر رہا ہوں کہ وہ بادِ صبا کی طرح ادبی محفلوں میں آتے ہیں اور اپنی شعری سوغات ساری محفل پر نچھاور کرتے ہیں مجھے اس زود گو شاعر، بہترین دوست اور شریف آدمی سے مل کر بے حد مسرت ہوتی ہے معاشرہ

ہیں ایسے پاک وصاف لوگ جن کا ظاہر و باطن آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہو بہت کم ملتے ہیں۔ جب کبھی شاغل ادیب سے ملاقات ہوتی ہے میں انھیں شگفتگی کا مظہر پاتا ہوں جس شخص کی زندگی کھلے آسمان کی طرح باہیں پھیلا رہی ہو اور جس کی عطر زمین دیدہ و دل کی تسکین کا باعث بن رہی ہو وہ سوسائٹی کے اہم لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ شاغل ادیب کی شاعری نہ صرف ان کی قلبی واردات کی عکس جمیل ہے بلکہ انھوں نے خارجی کیفیات اور مشاہدات کی تازہ کاری سے بھی اپنی فکر کو پُراثر بنا دیا ہے کثرت مطالعہ نے ان کی شخصیت کے اُن گوشوں کو بھی منور کر دیا ہے جن سے اہل علم روشنی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے فن اور شخصیت میں کسی قسم کا تضاد نہیں ہے ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ فنکار کے فن میں اور اس کی زندگی میں یکسانیت رہے۔ شاغل ادیب محفلوں میں کچھ اس انداز سے آتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا۔ نہ آہٹ، نہ سرسراہٹ، دبے قدموں آتے ہیں اور دبے قدموں جاتے ہیں۔ کم گوئی کا یہ عالم ہے کہ سانس تک احتیاط سے لیتے ہیں۔ کوئی خاص بات ہو تو زیر لب مسکرا دیتے ہیں۔ میں نے انھیں قہقہہ لگاتے ہوئے بہت کم دیکھا ہے علوم و فنون سے انھیں غیر معمولی دلچسپی ہے شعر و ادب کے تمام رموز و نکات سے واقف ہیں علم و فن کی باریکیوں اور اس کی رعنائیوں سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ترقی پسند رجحانات اور جدیدیت

کی آمیزش ہے۔ ایسا شخص سارے معاشرہ میں کامیاب رہتا ہے جو زندگی کی مثبت قدروں کا ترجمان بنا رہتا ہے۔ میں ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کی ادیبانہ رفعت کا قائل ہی نہیں ہوں بلکہ ان کی دوستی کا بھی معترف ہوں۔ شاغل ادیب مرزا جاؔ غزل کے قریب ہیں ان کا کلام تمام فنی خوبیوں سے مملو ہے کہنہ مشق شاعر ہونے کی وجہ سے انہیں لفظوں کو برتنے کا سلیقہ ہے استادانہ رنگ میں بھی ان کی غزلیں ہمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ شاغل ادیب ہندی زبان سے بھی کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہندی زبان کے بعض الفاظ نہایت خوبصورتی سے جگہ پانے میں شاغل ادیب بہترین دوست ہیں، بہترین انسان ہیں کسی کی نہ برائی کرتے ہیں نہ کسی کی برائی سنتے ہیں۔ روشن خیالات کے حامی انسان ہیں۔ ہر اچھی بات ان کے دل و دماغ کا ایک حصہ بن جاتی ہے احباب سے نہایت خلوص کے ساتھ ملتے ہیں شاعرانہ مراسم کے ساتھ ساتھ دوستانہ مراسم کے بھی قدر شناس ہیں غیر معمولی آدمی ہیں۔ معاملے کے کھرے آدمی ہیں وقت کے پابند ہیں۔ اصول پسندی، راست گوئی ان کا مسلک ہے ان کے شاعر دوستوں کی فہرست طویل ہے لیکن کچھ ہی شاعر ایسے ہیں جن سے وہ کھل کر ملتے ہیں۔ میرے حلقے کے تمام شاعر شاغل ادیب کی نرم گفتاری شگفتہ روی اور ان کے شریفانہ طرزِ سلوک کے قائل ہیں۔ شاغل ادیب کو مشاعرے پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں ہے جہاں کہیں انھیں محبت

سے ملوایا جاتا ہے۔ یہ خوشنی جانتے ہیں۔ ہماری انجمنوں کے جلسوں میں شرکت کرکے ہی جب انہیں تشفی ہو جاتی ہے تو وہ ادھر ادھر کے شاعروں کے بارے میں سوچتے بھی نہیں۔ شاغل ادیب ایک اچھے شاعر ہیں اور ایک ایسے دوست ہیں جن کے ذکر سے ہی مسرت کی زیریں لہریں دل و دماغ کو تروتازگی بخشتی ہیں۔ معاشرہ میں ایسے شریف لوگوں کی بے حد ضرورت ہے وہ لوگ واقعتاً خوش نصیب ہیں جنہیں شاغل ادیب جیسے پاک وصاف انسان سے روابط رکھنے اور روابط بڑھانے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ شاغل ادیب میں ایک اچھی بات یہ ہے کہ وہ یک درگیر محکم گیر کے قائل ہیں وہ ذہنی طور پر ہمارے اداروں سے وابستہ ہیں۔ ہماری محفلوں میں شرکت کرنا کافی سمجھتے ہیں ویسے شہر کے تمام ادبی حلقوں سے اُن کے روابط ہیں وہ ایک محبت کرنے والے انسان ہیں اچھی شاعری کرتے ہیں اچھی گفتگو کرتے ہیں اور اچھے لوگوں میں رہتے ہیں اور کیا چاہیئے ایک مہذب شہری کے لئے جو شخص معاشرہ کی نظر میں ارفع و اعلیٰ رہتا ہے یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس کا وجود کسی بھی شخص کے لئے بار نہیں ہوتا بلکہ اس کا وجود دوسروں کے لئے فیض رساں رہتا ہے

مومن خان شوق

مہذب انسان۔ معتبر شاعر قناعت پسند شخصیت

ہمارا مشاہدہ ہی نہیں تجربہ بھی ہے کہ زندگی گزارنے کے رویہ میں انسان بسا اوقات تضاد کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہمارا یہ بھی مشاہدہ ہے کہ ایک تہذیب یافتہ معتبر انسان کچھ ایسے حالات سے بھی گزرتا ہے کہ بعض مقامات پر اس کے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں۔ ثابت قدمی اس کے لیے سوالیہ نشان بن جاتی ہے۔ پاؤں کے نیچے سے زمین سرکنے لگتی ہے لیکن ایک ثابت قدم، اعلیٰ روایات کی پاسداری کرنے والا انسان زندگی کے ہر مرحلے پر، ہر قدم پر، ہر قسم کے حالات کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کرتا ہے۔ صاف گو، پاک طینت اور سنجیدہ طرزِ حیات سے گزرنے والا انسان زندگی کے ہر موڑ پر شادمانی و کامرانی کے ساتھ سفر طے کرتا ہے۔ ایسے ہی ایک معتبر اور مہذب شخصیت جن سے مل کر خوشبو کا احساس ہوتا ہے وہ مومن خان شوق ہیں

مومن خان شوق ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو زندگی کے نرم و گرم حالات کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرتے ہوئے مستقل مزاجی کے ساتھ کاروانِ حیات کا ایک حصہ بنے ہوئے ہیں۔ جناب شوق بہترین شاعر اور نفیس انسان ہونے کے علاوہ اردو زبان کے خدمت گزار بھی ہیں۔

مومن خان شوق سے میری جان پہچان ادبی رسائل کے ذریعہ ہوئی۔ اکثر دفعہ یوں بھی ہوا کہ مومن خان شوق کا اور میرا کلام بعض ادبی رسالوں میں ساتھ ساتھ شائع ہوتا رہا۔ غالباً ۲۰ ۲۲ برس پہلے کی بات ہے کہ ان سے میری ملاقات ایوانِ اردو (ادارۂ ادبیاتِ اردو) میں ہوئی۔ میں سکریٹریٹ سے کبھی کبھی لنچ کے اوقات میں ادارۂ ادبیات اردو جایا کرتا تھا۔ جہاں مجھے اردو کے بہت سے رسالے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ ان دنوں میرا کلام انڈو پاک کے ادبی رسالوں میں بہت چھپتا تھا۔ یہ خواہش ہوتی تھی کہ کسی بھی ادبی رسالے میں اپنا کلام دیکھ لیا کروں۔ ادارۂ ادبیات اردو سے میری گہری وابستگی اس لئے بھی ہے کہ مجھے اس ادارہ سے ایک جذباتی لگاؤ ہے۔ ڈاکٹر زور مجھے بے حد چاہتے تھے۔ میری ادبی سرگرمیوں سے خوش ہوتے تھے۔ میری حوصلہ افزائی میں انہوں نے ہمیشہ فراخدلی سے کام لیا۔ میں نے اپنے

ترقی کی تکمیل کے لیے ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے امتحانات اُردو عالم اور اُردو فاضل امتیازی حیثیت سے کامیاب کیئے۔ محمد قلی قطب شاہ کی سالانہ تقاریب کے علاوہ ادارۂ ادبیاتِ اردو میں وقتاً فوقتاً ہونے والے جلسوں اور مشاعروں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوا کرتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس ادارہ میں مجھے پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے والدِ محترم ممتاز شاعر تلوک چند محروم سے ملاقات کرنے کا موقع ملا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس ادارہ کی ایک ادبی تقریب میں ممتاز ترقی پسند شاعر جناب سجاد ظہیر سے بھی مجھے ملنے کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ میں نے اس مشاعرے میں ایک غزل سنائی تھی جس کو صدرِ مشاعرہ جناب سجاد ظہیر نے بہت پسند کیا تھا۔ اس غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے

اونچے محلوں کی روشنی کے لیئے ٭ اجنبی شہر میں غریب جلے

داد دینے کے دوران اُن کا مسکراتا ہوا چہرہ اب بھی میری نگاہوں میں پھرتا ہے۔ اس ادارہ کے معرکتہ الآراء ادبی مجالس اور مشاعروں میں میں نے نہ صرف شرکت کی بلکہ عملی طور پر حصہ لیا ہے۔ ایوانِ اردو میں خواجہ احمد عباس کی فلم "آسمان محل" کے مشاعرہ کی شوٹنگ کے وقت بھی میں موجود تھا اور بحیثیت شاعر میں نے کلام سنایا تھا۔ صدارت ممتاز ترقی پسند شاعر جناب علی سردار جعفری نے کی تھی۔

ایوانِ اردو شاعروں اور ادیبوں کے لیے ایک ایسا علمی و ادبی و

تہذیبی مرکز ہے جہاں نہ صرف بیرونِ ریاست کے دانشور ہی آیا کرتے ہیں بلکہ شہر کے شاعر و ادیب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایوانِ اردو کی کشش، شہر کے دوسرے اہلِ قلم کے ساتھ ساتھ جناب مومن خان شوق کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتی تھی۔ شوق صاحب اُن دنوں زرعی یونیورسٹی کے دفتر واقع "دلکشا" میں کام کرتے تھے۔ ان کا آفس ایوانِ اُردو کے بالکل قریب تھا۔ ادارۂ ادبیاتِ اُردو کے دارالمطالعہ سیکشن میں اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ کبھی کبھی ایوانِ اُردو میں ملاقات ہوتی رہتی۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ میں نے انہیں پہلی دفعہ کہاں سُنا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جناب مومن خان شوق نے مرکزِ ادب کے ایک سالانہ مشاعرہ میں جو جانکی پرشاد ہال انوارالعلوم کالج میں منعقد ہوا تھا مدعو کیا تھا۔ غالباً میں اور رئیس اختر اس محفل کے مہمانانِ خصوصی تھے۔ یہ تقریباً ۲۴ برس پہلے کی بات ہے۔ ویسے "سیاست" اخبار اور شہر کے دوسرے اخباروں میں ان کا کلام شائع ہوتا تھا۔

جب میں نے محلہ ملے پلی میں مستقل سکونت اختیار کی تو اس محلے میں مقیم ممتاز شاعر جناب مومن خان شوق کو یہ معلوم ہوا کہ میں نے یہاں مکان خرید لیا ہے تو انہوں نے پُرتپاک انداز میں اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

ملے پلی سے مجھے ایک دیرینہ نسبت ہے۔ اس محلہ میں علامہ حیرت بدایونی کی قیام گاہ اور جناب شاذ تمکنت کی رہائش گاہ پر شاعروں

ادیبوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ میں زیادہ تر علامہ حیرت بدایونی کے پاس آتا تھا۔ اُن دنوں علامہ حیرت بدایونی کی صدارت میں نمائش کلب اور شہر کے دوسرے متعلقات پر مشاعرے ہوا کرتے تھے وہ بعض مشاعروں کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے تھے۔ بعض مشاعروں میں شرکت کے لیے مجھے بھی یاد فرمایا کرتے تھے۔

شاذ تمکنت صاحب سے میری ملاقات بہت کم ہوتی تھی کوئی خاص بات ہو یا کسی خاص مشاعرہ کے سلسلے میں اُن سے ملنا ضروری ہوتا تو اُن سے ملاقات ہو جاتی تھی۔

اِس محلہ میں ایک ایسی شخصیت سے بھی میری والہانہ وابستگی تھی جو میری شاعری کا مرکز تھی جس کی گلی میں آج بھی رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں۔ گلِ تازہ کی طرح۔ میری سانسوں کی گرمی میرے قدموں کے نشان اُس گلی میں آج بھی میرے ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ اُس ایک خاص کشش نے مجھے برسوں اپنی طرف متوجہ کیا۔ آج سب کچھ بدل گیا ہے لمحے دنوں میں اور دن مہینے اور سالوں میں بدل گئے ہیں اب کچھ بھی تو نہیں رہا۔ سب کچھ اوراقِ ماضی کی نذر ہو گیا ہے جب بھی اُس گلی سے گزرتا ہوں تو یادِ ماضی کی پرچھائیاں سائے کی طرح میرے ساتھ ہو جاتی ہیں اور اس مقام پر میرے لیے سائبان بن جاتی ہیں۔ جہاں جلتی ہوئی دھوپ بھی سایہ فگن رہتی تھی —— پاکیزہ رشتوں کی ضمانت کے لیے۔

مومن خان شوق کا مکان "اشرف ولا" ملے پلی کی بڑی مسجد کے عقب میں واقع ہے جن کی قیام گاہ مسجد کی قربت کی وجہ سے ہر لمحہ نور افشانی کی کیفیت سے سرشار رہتی ہے۔ ان کے گھر کا ماحول نورانی ہے۔ تمام لوگ تعلیم یافتہ ہیں مشرقی آداب سے آراستہ اردو لکھنے پڑھنے والے بچے مومن خان شوق کا سرمایۂ حیات ہیں۔ ان کی سب سے نایاب دولت ان کے والدہ ہیں۔ ان کی دینداری نیک صفت والدہ محترمہ شوق صاحب کی پاکیزہ زندگی اور نیک اطوار کی ضامن ہیں۔ ان کے والدین نے شوق صاحب کو زندگی کی ہر جائز خوشی سے سرفراز کیا ہے۔ ماں باپ کے قدموں میں پڑے رہتے سے ان کے ہر عمل سے شائستگی، شرافت اور محبت ٹپکتی ہے۔ طرزِ حیات کا بانکپن طبیعت کی شگفتگی اور زندگی کے معاملے میں دیانتدارانہ رویہ یہ سب کچھ ایسی علامتیں ہیں جو ان کی زندگی کے خدوخال میں رنگ بھرنے کی محرک رہا کرتی ہیں۔

مومن خان شوق ایک بے داغ، صاف گو، باکردار، نیک صفت اور پُر خلوص انسان ہیں جو شخص ایک دفعہ ان کی دوستی کی گرفت میں آجاتا ہے وہ پابہ زنجیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ شوق صاحب شیریں کلام تو ہیں ہی نرم گفتار بھی ہیں۔ ٹھہر ٹھہر کر ان کا گفتگو کرنا دانشورانہ طرزِ عمل کی ترجمانی کرتا ہے۔ ہر وہ مسئلہ جو زندگی کی مثبت قدروں سے وابستہ رہتا ہے اس پر اظہارِ رائے کے لیے تحفظِ ذہنی

کا ذکر کار نہیں ہوتے۔ ان کے کردار کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر شخص کے بارے میں نیک تمنائیں رکھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے احباب زیادہ ہونے کے باوجود بادر کھنے کے قابل ہیں۔ مجھے مسرت ہوتی ہے یہ کہتے ہوئے کہ میں شوق صاحب کا دوست ہوں۔ اگرچہ ہم دونوں کی عمر میں تفاوت ہے لیکن ذہنی طور پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی کشتی میں، ایک ہی منزل کا سفر کر رہے ہیں۔

جن لوگوں کی زندگی صاف ستھری ہوتی ہے وہ کینہ پروری، ذہنی تحفظات، کج روی اور بے راہ روی سے دامن کشا رہتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ خوش رہتے ہیں جو اپنے بہترین مستقبل کی تمنا رکھتے ہیں۔ شوق صاحب کے ملنے والوں میں ہر قسم کے خیالات رکھنے والے لوگ ہیں لیکن ان کے پاس شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ شوق صاحب سے ہر روز نہ سہی ہفتہ میں ۳، ۴ بار ضرور ملاقات ہوتی ہے۔ میں جب بھی ان سے ملتا ہوں تو مجھے خوشگوار مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے بار بار ملاقات ہوتی رہے۔

ہماری دوستی کی بنیاد صرف اور صرف شاعری ہے۔ ہم نے شعر کی وسیلے سے ہی اپنے مراسم بڑھائے ہیں۔ میں گزشتہ ۱۲ سال سے دہلی میں اپنے ذاتی مکان میں مقیم ہوں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے

کہ سکتے ہیں کہ میرے عزیز دوست مومن خان شوق میرے ہم نشین ہی نہیں بلکہ ہم مکتب بھی رہ چکے ہیں وہ ایسے پیڑ کی طرح ہیں جن کی سانسوں کی خوشبو، جن کے قدموں کی آہٹ اور جن کے حسن سلوک اور بہترین طور طریق نے مجھے ان کا بے ریا، بے غرض اور والہانہ دوستی میں محصور کیا ہے
مومن خان شوق کی شاعری کی عمر ۳۰، ۳۲ برس کی ہوگی۔ اس دوران ان کے چار شعری مجموعے "بیسلنے موسم" "چاندنی کے پھول" "کرن کرن اُجالا" اور "نشاطِ آرزو" شائع ہو چکے ہیں ان کتابوں پر ملک کی اردو اکیڈیمیوں سے انعامات ملے ہیں۔ ان کا کلام آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتا ہے۔ دور درشن سے بھی کاسٹ ہوتا رہتا ہے۔ روزنامہ "سیاست" کے علاوہ ملک کے تقریباً تمام اردو رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے مومن خان شوق غزلیں بھی کہتے ہیں۔ قطعات، نظمیں اور نعتیہ کلام بھی۔
مومن خان شوق اپنی ذاتی محنت اور شعر و ادب سے اپنی شخصی دلچسپی کی وجہ سے شعری و ادبی محفلوں میں جس طرح ایک فعال شخصیت کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں اسی طرح اپنے باوقار شاعرانہ رویے کی وجہ سے بھی اپنی الگ پہچان کے ساتھ اپنے وجود کو سرخ رو بنائے ہوئے ہیں۔ مومن خان شوق کا محبوب مشغلہ شعری و ادبی کتابوں کا مطالعہ ہی نہیں بلکہ مشاہدات و تجربات کو اپنے تخلیقی سفر کا ایک اہم حصہ بنانا بھی ہے۔ ان کے اشعار میں داخلی و خارجی پہلو اپنی

اپنی جگہ پر اپنا منصب ادا کر رہے ہیں۔ زندگی کے مختلف گوشوں
پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی شاعری زندگی کی آئینہ دار ہے جو شاعر
اپنی پہچان کے لیے باوقار انداز میں اپنے فکروفن کی منزلیں طے کر رہا
ہے اس کے قدم بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں جو قدم بڑھتے ہی چلے
جاتے ہیں اُن کا سفر کامرانی کے ساتھ گزرتا رہتا ہے۔ مومن
خان شوق نے جس سلیقے کے ساتھ اپنی زندگی کے سفر کو کامیاب
راستوں سے روشناس کرتے ہوئے جاری رکھا ہے اُس میں اُن کی
مستقل مزاجی اور شائستہ روی کا بھی دخل ہے شوق صاحب
محفلوں کے آدمی ہیں۔ محفلیں سجاتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں
کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ اصول پسندی، وقت کی پابندی
اعلیٰ کردار کی پاسداری ان کا ذاتی وصف ہے۔ مومن خان شوق
کا کلام ملک بھر کے ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے شہر کے اردو
اخباروں میں خاص طور پر "سیاست" میں اُن کا کلام زیادہ ہی شائع
ہوتا رہتا ہے۔ ریڈیو، دوردرشن سے بھی ان کا کلام ہم تک پہونچ
جاتا ہے مومن خان شوق ایک منتظم مزاج شاعر کی حیثیت سے بھی
ادبی حلقوں میں مشہور ہیں۔

جناب مومن خان شوق ادارہ "میرا شہر میرے لوگ" اور ایوانِ
پریس معظم جاہ کے سکریٹری ہیں۔ ادارہ سوغاتِ نظر اور نگارستان
بانو طاہرہ سعید کے جنرل سکریٹری ہیں۔ سہ ماہی ایوانِ ادب دہلی کے

ممبر برائے حیدرآباد اور ماہنامہ "خوشبو کا سفر" کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں۔

مومن خان شوق کو کئی ادبی و فلاحی اداروں اور انجمنوں کی جانب سے اعزاز ایوارڈز مل چکے ہیں۔ مومن خان شوق کو یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ انہوں نے راج بھون کے چار مشاعروں میں کلام سنایا۔ محترم کرشن کانت صاحب کی گورنری کے زمانے میں دو مشاعروں میں اور موجودہ گورنر آندھرا پردیش ڈاکٹر سی رنگا راجن کی موجودگی میں "دربار ہال" میں منعقدہ دو مشاعروں میں ـــ

مومن خان شوق کا چوتھا مجموعہ کلام "کرن کرن اُجالا" کو بزمِ عثمانیہ جدہ نے شائع کیا ہے۔ انہیں "انیکتا میں ایکتا" اندرا گاندھی ایوارڈ شہر کے نامور شخصیتوں کے ساتھ ملا۔ جن میں قابلِ ذکر ڈاکٹر سی نارائن ریڈی، نواب شاہ عالم خان، محبوب حسین جگر، ڈاکٹر شیام سندر وغیرہ شامل ہیں۔

ادارۂ سوغاتِ نظر مومن خان شوق کی پہچان بن چکا ہے مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ وہ ادارۂ میرا شہر میرے لوگ اور ماہنامہ خوشبو کا سفر کے شعبۂ نشر و اشاعت سے متعلق بھی اپنی ذمہ داری کو نہایت عمدگی سے نبھا رہے ہیں میرا شہر میرے لوگ ایوانِ بیرِس معظم جاہ شجیع کے مشاعروں کی کارروائی بھی عمدگی کے ساتھ چلاتے ہیں ـــ

ہمارے شاعرانہ روایط کا ایک خوشگوار وسیلہ ہمارے ادبی جلسے اور مشاعرے ہیں۔ ان جلسوں کے سلسلے میں اور شہر اور اضلاع کے مشاعروں کے بارے میں ہماری ملاقاتیں ناگزیر ہو گئی ہیں۔ میں نے دوران گفتگو محسوس کیا ہے کہ مومن خان شوق کسی بھی مسئلہ پر اظہار خیال میں محتاط روی کا ثبوت دیتے ہیں۔ صاحب رائے شخصیت کے مالک ہونے کی وجہ سے نپے تلے انداز میں اپنی بات کہتے ہیں۔ گفتگو کے دوران قیمتی الفاظ ضائع نہیں کرتے۔ بسی اور مناسب موقع کے لئے اٹھائے رکھتے ہیں۔ یہ ان کی طرز تکلم کی خصوصیات ہیں مشاعروں میں اعتماد کے ساتھ کلام سناتے ہیں تحت اللفظ میں شعر سناتے وقت اپنی ساری شخصیت کو شعر کے معنیٰ و مفہوم میں سموتے ہیں۔ ترنم سے بھی کلام سناتے ہیں لیکن بہت کم ـــ

شوق صاحب کے کلام سنانے کا انداز پراثر ہوتا ہے۔ سامعین متوجہ ہو جاتے ہیں اشعار پر داد دیتے ہوئے مقطع تک پہنچ جاتے ہیں شوق صاحب جس طرح زندگی کے دیگر مسائل کو عمدگی اور سلیقے سے سرانجام دیتے ہیں اسی طرح شعر و سخن کے معاملات میں بھی وہ ذمہ دارانہ رول ادا کرتے ہیں۔ ہر ادبی کام خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہیں اور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

میری دلی تمنا ہے کہ شوق صاحب کی ساری زندگی باوقار انداز میں اسی طرح گزرتی رہے پھولوں اور خوشبوؤں کے درمیان ـــ

شفیع اقبال

باکردار انسان۔ سینیر صحافی۔ باوقار دوست

معاشرہ کے وہ لوگ جو اپنی زندگی کے تانے بانے محنت شاقہ، بہترین صلاحیتوں اور جہد مسلسل کے پس منظر میں خوبصورتی اور سلیقے کے ساتھ بُنتے رہتے ہیں لاکھ الجھنوں اور بے شمار مشکلوں کے باوجود بھی اپنے سفر کو جاری رکھتے ہیں وہ سفر چاہے زندگی کا ہو کر شعری و ادبی، علمی و معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی سا اپنی فہم وادراک اور اپنے فکر و خیال سے استفادہ کرنے والے لوگوں میں ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو اپنی زندگی کے ہر گوشے کو پُر نور بنائے رکھتے ہیں۔ شفاقیت ایسے لوگوں کی زندگی کا ایک محور ہوتی ہے جس کے سبب وہ اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو خوشگوار بنا لیتے ہیں اور کچھ اس طرح اپنے شب و روز کو آئینہ مثال بنالیتے ہیں کہ ان کی ہر حرکت، ہر عمل لائق تحسین و قابلِ تقلید بن جاتا ہے

ایسے ہی حالات سے گزرنے والے باصلاحیت، باکردار، صاحب فہم و ذکا اور جہدِ مسلسل سے اپنی زندگی کو سنوارنے والے ایک شاعر شفیع اقبال بھی ہیں شفیع اقبال ہمارے شہر کے نمائندہ شاعروں میں اپنی ایک خاص پہچان رکھتے ہیں۔ بہترین نثر نگار ہونے کے علاوہ سلجھے ہوئے مقرر، باوقار صحافی اور بہترین منتظم بھی ہیں۔ شعری و ادبی محفلوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ محفل کے آدمی ہیں۔ سنجیدہ بھی ہیں اور بذلہ سنج بھی۔ وعدے کے پابند بھی ہیں وقت کے قدرشناس بھی ہیں۔ بے شمار خوبیوں کے حامل شفیع اقبال نہایت پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے گریجویٹ ہیں۔ علمی، ادبی، تہذیبی و شعری صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ شہر کی علمی و ادبی محفلوں میں ان کے رکھ رکھاؤ، ان کی شائستگی، شگفتگی، سلیقہ مندی اور ان کے خلوص کو سراہا جاتا ہے۔ آدابِ محفل اور تہذیبی قدروں کی پاسداری کرتے ہیں۔ روشن خیال ہونے کے ساتھ ساتھ کلاسیکی اقدار کو بھی دل و جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ اپنی بہترین شاعری سے شعری و ادبی محفلوں میں اپنی ایک منفرد شناخت بنا چکے ہیں۔

شفیع اقبال سے میری ملاقات تقریباً ۴۰ برس پہلے ہوئی تھی۔ ہوٹل کیفے سعدی حبیب نگر (ملے پلی) کے روبرو ان کا ایک جنرل اسٹور تھا۔ اُس زمانے میں وہ ہماری منزل کے نام سے ایک ہفت روزہ جریدہ نکالتے تھے۔ اُن کی دوکان پر زیادہ تر اُن کے ہم خیال شعراء و ادیب دکھائی دیتے تھے اُس زمانے میں ملے پلی کے ایک خاص دوست کے پاس میرا آنا جانا تھا اکثر

دفعہ بیاں اسی راہ سے گزرتا تھا۔ علیک سلیک ہوتی تھی۔ ہم نے بے شمار مشاعر
ایک ساتھ پڑھے ہیں۔ اُس دَور کے ان کے قریب ترین دوستوں
میں رحمٰن جامی، عزیز بھارتی، برق یوسفی بھی تھے۔ اُس زمانے میں میری
اُن سے کوئی خاص رسم و راہ نہیں تھی۔ صرف معمولی شناسائی تھی دن گزرتے
گئے۔ حالات بدلتے رہے۔ مشاعروں میں کبھی کبھی اُن سے ملاقات
ہو جاتی تھی۔ جس زمانے میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیاں عروج
پر تھیں اُن دنوں وہ ہنری مارٹن انسٹیٹیوٹ میں منعقد ہونے والے انجمن
ترقی پسند مصنفین کے جلسوں اور مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اُن
دنوں انہوں نے ایک ادبی انجمن عصری ادب کی سرگرمیوں کو بھی جاری رکھا۔
اُن کے بڑے بھائی صادق نوید اُس انجمن کے صدر رہے اور وہ معتمد۔ کچھ
عرصے تک عصری ادب کے ادبی جلسے اور مشاعرے ہوتے رہے لیکن پتہ نہیں
کیوں کئی برسوں سے اس انجمن کی سرگرمیاں بند ہیں۔

ادارہ میرا شہر میرے لوگ کی تشکیلِ جدید کے بعد سے وہ ادارہ
میرا شہر میرے لوگ کے جلسوں میں بہ پابندی شرکت کر رہے ہیں۔ اس ادارہ
کے وہ رکن عاملہ ہیں۔ خورشید احمد جامی میموریل اکیڈمی اور انجمن محبانِ اردو
کے سکریٹری ہیں۔ نہایت عمدگی سے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہیں
ان کا شاعرانہ و ادیبانہ طرزِ تخاطب متاثر کن ہوتا ہے۔ سلجھے ہوئے انداز
میں شعری و ادبی، تہذیبی و معاشرتی موضوع پہ اظہارِ خیال کرتے ہیں اکثر
مذاکروں میں حصہ لیتے ہیں۔ انہیں ہر موضوع پہ کھل کر اظہارِ خیال کرنے کا

ملکہ حاصل ہے۔ شفیع اقبال وعدہ کے نہایت پابند ہیں۔ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا۔ جو کچھ بھی کہتے ہیں صاف صاف لفظوں میں دو ٹوک انداز میں کہتے ہیں۔ مصلحت کے لیے ان کے ہاں کوئی جگہ نہیں ہے مہذب شہری کی طرح باعمل و باکردار انسان ہیں۔ شہر کے نمائندہ مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے بہترین کلام سے ساری محفل کو سرشار کر دیتے ہیں کلاسیکی اقدار سے ان کی شاعرانہ وابستگی نے انہیں کچھ زیادہ ہی پُر وقار بنا دیا ہے۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ جو شاعر اپنی بنیادی قدروں کی اہمیت کو سمجھتا ہے وہ کبھی بھی تہذیبی اقدار کے تحفظ میں ناکام نہیں رہتا۔ شفیع اقبال کل ہند مشاعرے بھی پڑھ چکے ہیں۔ خود انہوں نے ۳۰ برس پہلے گاندھی بھون تھیٹر میں کل ہند مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ وہ مشاعرہ ہفت روزہ "ہماری منزل" کی جانب سے منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں ملک کے بعض اہم شاعروں نے بھی شرکت کی تھی۔ جناب عابد علی خان مدیر "سیاست" نے صدارت کی تھی۔ جناب محبوب حسین جگر کی انہیں سرپرستی حاصل تھی۔ شفیع اقبال اضلاع کے مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے ہیں شہر کے مشاعروں کی طرح اضلاع کے مشاعروں میں بھی اُن کا کلام پسند کیا جاتا ہے۔ اضلاع کے اکثر مشاعرے ہم نے ساتھ پڑھے ہیں اضلاع کے ایسے مشاعرے جن میں، میں شریک رہتا ہوں شفیع اقبال لازماً شریک رہتے ہیں۔ بلکہ ہم ایک ہی کار کے ذریعہ مشاعروں میں شرکت کے لیے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں "گلشنِ نارسا" کے نام سے ان کا مجموعہ کلام

ہو لیے ہیں۔ اس وقت ان کے ہاں اتنا کلام موجود ہے کہ وہ دو اور مجموعے شائع مجموعے شائع کر سکتے ہیں۔ نہایت با اخلاق، با مروت، نیک سیر انسان ہیں۔ بہت پہلے اگرچہ کہ ان کی نشست و برخواست کچھ مخصوص شاعروں کے ساتھ رہی لیکن گذشتہ ۸، ۱۰ برس سے ہمارے ادبی حلقے سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ اور ہماری انجمنوں اور اداروں (ادارۂ میرا شہر میرے لوگ، ایوان پرنس معظم جاہ شجیع، سوغات نظر، خورشید احمد جامی میموریل اکیڈیمی انجمن محبانِ اُردو، بزم جوہر) میں شامل ہیں۔ شہر کی نامور شخصیتوں سے ان کے مراسم ہیں۔ شہر کی بعض نمائندہ محفلوں کے علاوہ وہ راج بھون میں منعقد ہونے والی ادبی و تہذیبی تقاریب میں بھی مدعو رہتے ہیں۔ سنہ ۱۹۹۸ء میں راج بھون میں منعقدہ مشاعرہ میں بھی انھوں نے کلام سنایا جس کے داعی گورنر آندھرا پردیش ڈاکٹر سی رنگا راجن تھے۔ سنہ ۱۹۹۵ء میں راشٹرپتی نلائم میں منعقدہ مشاعرہ جس کی صدارت صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے کی تھی کلام سنایا۔ شفیع اقبال ہندی ادیبوں کی محفلوں خاص طور پر گیت چاندنی اور ہندی لیکھک سنگھ میں بہ پابندی شرکت کرتے ہیں۔ ہندی حلقوں میں بھی ان کا کلام پوری توجہ کے ساتھ سنا جاتا ہے شفیع اقبال اپنے محلہ چھترہ کی مسجد مخدومیہ کے صدر ہیں۔ دینی مصروفیات میں بھی اپنا کچھ وقت گزارتے ہیں۔ فلاحی و اصلاحی معاملات سے بھی انھیں دلچسپی ہے اپنے محلہ کی پیس اینڈ ویلفیر کمیٹی (امن کمیٹی) اور محلہ کمیٹی کے صدر ہیں کئی اہل غرض لوگوں کو ان کا تعاون حاصل ہے اپنے محلے کے سربراہ کی حیثیت

سے بھی شہرت رکھتے ہیں اپنے جن دوستوں کو ذہنی طور پر اپنے قریب پاتا ہوں اُن میں شفیع اقبال بھی ہیں۔ شفیع اقبال سمجھ بوجھ رکھنے والے انسان ہیں خاص طور پر ادبی مسائل پر ان کی رائے کو اہمیت دی جاتی ہے اپنے بہترین مشوروں سے مسائل کی یکسوئی میں معاون ثابت ہوتے ہیں شفیع اقبال کا کلام ملک کے ادبی رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے خوشبو کا سفر کے علاوہ اُردو اکیڈمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے رسالہ قومی زبان اور محکمہ اطلاعات سے شائع ہونے والے رسالے آندھرا پردیش اور دیگر رسالوں میں بھی ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ شفیع اقبال گذشتہ ۱۴ برس سے آل انڈیا ریڈیو سے اپنا کلام سُنا رہے ہیں۔ کشمیر ریڈیو سے بھی ان کا کلام نشر ہو چکا ہے جبکہ کبیر احمد کشمیر ریڈیو کے ڈائرکٹر تھے۔ روزنامہ سیاست میں بھی ان کا کلام پڑھنے کو ملتا ہے دوردرشن سے بھی ان کی شاعری ٹیلی کاسٹ ہوا کرتی ہے شہر کی تقریباً تمام ادبی انجمنوں کے سربراہوں سے ان کے مراسم ہیں مشاعروں میں بھی حصہ لیا کرتے ہیں۔ اپنے پاک وصاف شاعرانہ رویے کے سبب تمام ادبی حلقوں میں پسند کیے جاتے ہیں۔ شفیع اقبال کا شعری و ادبی سفر جاری ہے شعری ادب میں نئے نئے گل کھلاتے رہتے ہیں بہترین نثر نگار اور اچھے مقرر ہیں ان کے کلام میں مسائلی اشعار کے ساتھ رومانی اشعار بھی ملتے ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن میں شعر کہتے ہیں۔ نئی اصنافِ سخن ہائیکو اور ثلاثی بھی اُن کی پسندیدہ اصنافِ سخن ہیں قطعات کے علاوہ معرا و پابند نظمیں بھی کہتے

بہار ان کی مذہبی شاعری (نعتیں، منقبتیں) بھی پسند کی جاتی ہے غزل ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ ہمارے شہر کے ایک مہذب شاعر کی حیثیت سے قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ شفیع اقبال ایک باشعور صحافی کی حیثیت سے بھی شہرت رکھتے ہیں۔ مشرقی ماحول کے پروردہ ہیں۔ پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔

بشیر امجد

شاعرِ حسن و جمال، وضعدار شخصیت

تخلیقی ادب کے تجزیہ نگاروں، علم و فن کے نبض شناسوں اور مبصرینِ شعر و ادب کا یہ بھی خیال ہے کہ اعلیٰ اقدار کی پاسداری کرنے والے صاحبانِ فہم و ادراک کی نکھری ستھری زندگی کا عکسِ جمیل نہ صرف اُن کے آئینۂ زندگی میں جلوہ افروز رہتا ہے بلکہ ان کے فکر و خیال کی وسیع کائنات میں بھی کچھ اس طرح پھیل جاتا ہے کہ ان کے فن اور شخصیت کے تمام پہلو روشن ہو جاتے ہیں۔

جب بھی وضع دار شخصیتوں کا حُسنِ خیال، فکر و آگہی کی وسعتوں میں ڈھل جاتا ہے تو صالح روایات کی ترجمانی کرنے والی ایک ایک کرن کو خراج پیش کرتا رہتا ہے جن فن کاروں کی ساری زندگی سفیرانِ نورِ سحر کی طرح روشنی تقسیم کرتی رہتی ہے تو ان کا ہر تخلیقی عمل روشن اور منور ہوتا چلا جاتا ہے اور ایسے شاعر و ادیب جن کی

سانسوں میں عطر و عنبر کی مہک اور تازہ پھولوں کی خوشبو موجود ہو ان کی تخلیق سارے ماحول کو مہکاتی رہے گی۔ بعض اہل قلم یہ بھی کہتے ہیں کہ شخصیت کے بہت سے نمایاں پہلو تخلیق کار کے فکر و فن کے آئینہ دار ہوتے ہیں جو شاعر سچے جذبات، زود اثر مشاہدات اور شدید واردات قلبی کو شعری پیکر عطا کرتے ہیں تو ان میں روشن لکیروں کی تمازت اور پھولوں کی تازگی پائی جاتی ہے۔ پاک و صاف زندگی گزارنے والا فن کار سادگی، شگفتگی اور نفاست کی ایک نئی دنیا بساتا ہے اور اس کا تخلیقی کردار باد صبا کی پہلی انگڑائی سے شروع ہو کر سارے گلشن کو شادابی عطا کرنے تک باقی رہتا ہے اور بلا قید موسم گلستان رنگ و بو کو نکھارتا رہتا ہے۔

بزرگ و محترم کہنہ مشق شاعر بشیر احمد بھی ان خوش نصیب قلمکاروں میں سے ایک ہیں جن کا علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی پس منظر بے داغ موسم گل کی طرح فروزاں ہے بشیر احمد صاحب کی شاعری زندگی کی تابناک شعاعوں کی طرح ادبی و شعری ماحول کو جگمگا رہی ہے۔ ایک دیانت دار، نیک صفت انسان کی طرح شاعری کے ساتھ ان کا مخلصانہ رشتہ ہے وہ خود بھی فن کی قدر و قیمت کو محسوس کرتے ہیں۔ اپنے فن کا احترام کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے دلی جذبات کی ترجمان ہے وہ زندگی کی خوبصورتی کو پوری دیانت داری کے ساتھ برتتے ہیں۔ شاعرانہ طرحداری کا

ان کا مزاج ہے۔

بشیر احمد کے تاحال ۴ شعری مجموعے "رنگِ حیات" "تصویرِ حیات" "آئینہ حیات" اور "سازِ حیات" شائع ہو چکے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ بشیر احمد کو زندگی کی روشن حقیقتوں اور خوشبو کی دیر پا مہک سے کافی لگاؤ ہے جو شاعر اپنی شاعری کو اپنی زندگی کی طرح چاہتا ہے تو اس کے شاعرانہ بانکپن میں وہ تمام خوبیاں شامل ہو جاتی ہیں جو مہکتے مہکتے گل و گلزار کے کیف آور ماحول کی یاد دلاتا ہے۔

جہاں تک مجھے یاد ہے بشیر احمد صاحب سے میری پہلی ملاقات ان کی حقیقی بھتیجی، میری منہ بولی بہن ممتاز شاعرہ انجم قمر سوز کی معرفت اس وقت ہوئی تھی جب ان کے مجموعۂ کلام "سوزِ قمر" کی رسم اجراء تقریب منعقد کی گئی تھی۔

رسم اجراء کی یہ یادگار تقریب انجم قمر سوز کے والدِ محترم ممتاز عثمانین ریٹائرڈ سشن جج جناب فصیح الدین صاحب کی رہائش گاہ واقع سالار جنگ کالونی میں انجام پانے والی تھی رسم اجراء کی تقریب سے قبل پُر تکلف عشائیہ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سوزِ قمر کی رسم اجراء کی تقریب سابق گورنر مہاراشٹرا جناب صادق علی کے ہاتھوں انجام پائی۔ جلسے کو شہر کے نامور دانشوروں نے مخاطب کیا تھا مشاعرہ کی صدارت حضرت سعید شہیدی نے کی تھی۔ مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر علی احمد جلیلی اور امیر احمد خسرو نے شرکت کی تھی۔ ادبی اجلاس و

مشاعرہ کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی تھی۔ ان شعرائے کرام کے علاوہ جناب بی قمر الدین قمر، صلاح الدین نیر، انجم قمر سوز، رئیس اختر، ڈاکٹر صادق نقوی نہپال سنگھ درما، بشیر احمد نے کلام سنایا تھا۔

بشیر احمد صاحب کے بڑے بھائی جناب فصیح الدین کے اہل خاندان، شعر و ادب اور فن موسیقی سے بے حد دلچسپی رکھتے ہیں۔ انجم قمر سوز کے شوہر محترم ڈاکٹر قمر الدین قمر بھی اچھے شاعر ہیں۔ انجم قمر سوز کے بھائی نسیم احمد اپنے دور کے مشہور فرزند جامعہ عثمانیہ رہے ہیں ان کی چھوٹی بہن نغمہ اور صفیہ کو شعر و ادب سے اچھا خاصا لگاؤ ہے۔ ان کی والدہ محترمہ کو فن موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔ ایک اور چھوٹی بہن رضیہ حسیب نہایت باذوق، اعلیٰ درجہ کا شعری مذاق رکھنے والی خاتون دکھن ہیں جن کی گفتگو کا ہر جملہ شاعرانہ دانشورانہ فکر و خیال کا ترجمان بنا رہتا ہے اس طرح کے شگفتہ، شستہ اور نغمہ پرور کیفیات سے بشیر احمد صاحب کی شخصیت وابستہ رہی ہے اس قسم کے شائستہ اور خوشگوار ماحول نے ان کے شعری سفر کو جاری رکھنے میں بڑی مدد کی ہے بشیر احمد صاحب ایک سیدھی سادی طبیعت کے انسان ہیں۔ وضع داری گویا ان کی نس نس میں رچ بس گئی ہے ان کے لب و لہجے میں شائستگی کے وہ تمام انداز نمایاں ہیں جو شریف و معتبر اعلیٰ ظرف گھرانوں کی پہچان ہوا کرتے ہیں۔ ان کے طرز تکلم سے خلوص کی خوشبو آتی ہے ان کا مخلصانہ رویہ آج کا نہیں ہے برسوں سے ہم انہیں اسی انداز

سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ حیدر آبادی تہذیب کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کرتا ہی نہیں ان کا مسکراتا ہوا چہرہ بھی مخاطب کو اپنے دائرہ خلوص میں باندھ لیتا ہے۔ ان کے لفظوں کے جادوئی اثر سے کوئی بچ نہیں پاتا۔ نہایت شریف انسان ہیں وقت کی پابندی، وعدہ کی پاسداری کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ ان سے ملاقات کرنی ہو تو ان کے گھر پہونچ کر دستک دینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ حیدر آباد کے شرفاء کا مخصوص لباس شیروانی زیب تن کئے ہوئے صدر دروازہ کے روبرو ٹہلتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ جسم وجاں کو مہکانے والے عطر کے شوقین ہیں۔ ان کے جسم کی خوشبو جہاں دل و دماغ کو معطر کرتی ہے وہیں عطر حنا، جنت الفردوس کی خوشبو ان کے لباسِ فاخرہ کو مہکاتی رہتی ہے خوش لباسی کی وجہ سے وہ سب کی نظر میں رہتے ہیں۔ صاف ستھری شیروانی کے اوپر کے ۲-۳ بٹن ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ ان کے سرخی مائل رخسار کو غازہ کی ضرورت ہی نہیں ہے وہ ہر اضافی شئے سے بے نیاز ہیں البتہ خوشبودار پان کا استعمال ان کے لبوں کی تراوٹ میں اضافہ کرتا ہے مشاعروں میں ان کا پان کھاتے ہوئے آنا اچھا لگتا ہے ان کی شخصیت کے بہت سے پہلو ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ان کی شرافت ہے۔ انسانی رشتوں سے انہیں والہانہ وابستگی ہے وہ کسی کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتے۔ قبل اس کے کہ

کسی مصیبت زدہ شخص کی آنکھ سے آنسو نکل پڑیں وہ ان آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ مستحق اور قابلِ اعانت لوگوں کی اس طرح مدد کرتے ہیں کہ ایک ہاتھ کی خبر دوسرے ہاتھ کو نہیں ہوتی۔ بشیر احمد صاحب اپنی عمر کی موجودہ منزل پر پہونچنے تک کئی دور دیکھ چکے ہیں۔ وہ ایسے حالات سے بھی گزرے ہیں جو پھولوں اور کانٹوں کے درمیان پگڈنڈی کی شکل اختیار کرتے رہے ہیں۔ ان کی زندگی کا سفر آج بھی پوری متانت اور اصول پسندی کے ساتھ جاری ہے۔ بشیر احمد صاحب کی شاعری اگرچہ غزل کی شاعری ہے لیکن وہ مسائلی شاعری سے بھی وابستگی رکھتے ہیں ان کی شاعری کا رنگ بعض اساتذۂ سخن کے کلام کی طرح مخصوص فکر کا حامل ہے قاری ہو کر سامع ان کے اشعار سے فرحت محسوس کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ دیر تک کلام سناتے رہیں ان کے کلام سے جہاں طبع سلیم کو تسکین ملتی ہے وہیں دل و دماغ کو راحت بھی ملتی ہے۔

بشیر احمد صاحب کے شاعر دوستوں کی فہرست پہلے بہت کم تھی لیکن جب سے وہ "ادارہ میرا شہر میرے لوگ" ایوانِ پریس منظم جاہ ستیج" "ادارہ صوغات ادب" "خورشید احمد جامی میموریل اکیڈیمی کے مشاعروں میں پابندی سے شرکت کر رہے ہیں فہرست طویل ہوتی جارہی ہے بشیر احمد صاحب جن شاعروں کو بہت زیادہ اپنا سمجھتے ہیں ان شاعروں میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی، صلاح الدین نیر، رئیس اختر، ڈاکٹر

حمایت نقوی، نہپال سنگھ ورما، مومن خان شوق، شفیع اقبال، اخترعطوری، شمائل ادیب، ڈاکٹر راہی، ہاشم حسن سعید، رشید جلیلی، یوسف عنقا قابلِ ذکر ہیں۔ ادبی محفلوں میں اگر وہ کسی وجہ سے شرکت نہ کرسکیں تو ان کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی ہے وہ ایک خوش گفتار، خوش اخلاق، خوش مزاج انسان ہونے کے علاوہ ایک مہذب شہری بھی ہیں ایسے صاحبان کج کلاہ، وضع دار لوگ شہر میں بہت کم رہ گئے ہیں۔ بشیر امجد کی شاعری ان کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہے سیدھے سادے لفظوں میں خوبصورت بات کہہ جاتے ہیں۔ ان کا شاعرانہ طرز اساتذۂ سخن سے ملتا ہے۔ رواں دواں بحروں میں شعر کہتے ہیں ان کی زبان ستھری اور ان کا لب و لہجہ شگفتہ ہے چونکہ بشیر امجد صاحب ایک آئینہ صفت، پاک و صاف دل و دماغ رکھنے والے شاعر ہیں اس لئے ان کے اشعار ان کے جذبات و مشاہدات کے سچے ترجمان بن کر صفحۂ قرطاس پر بکھر جاتے ہیں ان کے شعر سنانے کا انداز بھی منفرد ہے۔ تحت میں شعر سناتے ہیں لیکن ادھر کچھ دنوں سے ترنم میں شعر سنا رہے ہیں ان کا ترنم سماعت پر گراں نہیں گزرتا۔ بشیر امجد صاحب کے فن اور شخصیت کے مختلف گوشوں کی تہ در تہ افشاں کیفیات کا سلسلہ بہت طویل ہے

ڈاکٹر راہی

معتبر قلمکار، روشن خیال شاعر، حرکیاتی شخصیت

معاشرہ کے وہ کار آمد لوگ جو زندگی بھر رواں دواں رہنے کو ایک کار خیر سمجھتے ہیں اور جو اپنی حرکیاتی زندگی سے یہ ثابت کر دکھاتے ہیں کہ خوشگوار لمحوں کی قدر و قیمت اور انکی عظمت و منزلت کیا ہے ایسے لوگ نہ صرف خود کے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی ایک ایسا روشن چراغ بن جاتے ہیں جن کی روشنی میں معاشرہ کا ہر گوشہ پُر نور دکھائی دیتا ہے۔ خاص طور پر ایسے لوگ جو دوسروں کی فلاح و بہبود کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ وقف کر دیتے ہیں وہ ہر دور میں پسند کئے جاتے رہیں گے۔ اس انتشاری دور میں کتنے ایسے لوگ ہیں جو اپنی تنہائی کو مصروف زندگی کا ایک اہم حصہ بنا دیتے ہیں۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جو پُر ہجوم حالات سے گذرتے ہوئے بھی اپنی ذات کو مجروح ہونے نہیں دیتے۔ انا کا مسئلہ ہر باشعور شخص کے لئے

ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے جو شخص اپنے آپ کو اپنی ہی نظروں سے گرا دیتا ہے وہ سماج کا بدترین شخص سمجھا جاتا ہے اور وہ شخص جو اپنی شخصیت کی ہر لمحہ حفاظت کرتا ہے وہ معاشرہ میں سرخرو رہتا ہے۔ اپنی خوشیوں کو بانٹنے کا فن ہر ایک کو نہیں آتا۔ جو لوگ خوشیاں تقسیم کرتے ہیں اگر ان کی زندگی میں محرومیاں ہوں بھی تو وہ اپنی محرومیوں میں کسی اور کو حصہ دار نہیں بناتے۔ اور ان کا یہ فلسفہ اپنی جگہ کارفرما رہتا ہے کہ جس کا غم اس کے ساتھ یہ اس لئے کہ ہر ایک کا دکھ، درد اپنا ہوتا ہے۔ وہ اپنی خوددار طبیعت اور اپنی شائستہ مزاجی کے تحفظ کے لئے خود ہی ہر قسم کی تکالیف کا سامنا کرتا رہتا ہے۔ دوسروں کو شریک غم ہونے نہیں دیتا۔ ایک ایسا شخص جس کی صبح روشنی کی علامت بن کر معاشرہ میں رفتہ رفتہ پھیل جاتی ہے اور وہاں وہاں تک روشنی پہونچاتی ہے جہاں جہاں اندھیرے ہیں تو ایسا شخص ایک کامیاب زندگی کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کے اجالوں اور اندھیروں سے گزرنے والے ایک شاعر ڈاکٹر راہی بھی ہیں جن کی زندگی کا ہر لمحہ صبح صادق کی طرح اجالوں کی بشارت دیتا ہے۔ ڈاکٹر راہی نے ایک مسیحا کی حیثیت سے ہزاروں انسانوں کی خدمت کی ہے (اور کر رہے ہیں) لیکن ایک شاعر اور ایک ادیب و صحافی کی حیثیت سے بھی بے شمار صاحبان فکر و فن سے خراج وصول کر لیے ہیں۔ ڈاکٹر راہی پیشے کے اعتبار سے

ایک معروف ترین ڈاکٹر ہیں۔ صبح کی اولین ساعتوں سے لے کر رات کے پہلے حصہ تک وہ مصروف رہتے ہیں مسیحائی کا یہ سلسلہ خیر و خوبی کے ساتھ زائد از ۲۵ برسوں سے جاری ہے۔ میں واقف ہوں کہ ان کے مطب کہاں کہاں واقع ہیں لیکن میں یہ ہی جانتا ہوں کہ مغل پورہ کمان سے متصل کلینک ریڈیینٹ بہت قدیم ہے یہاں وہ زیادہ تر شاعروں وادیبوں کی بھی طبی اعانت کرتے رہتے ہیں۔ جب کبھی مجھے اُن سے ملاقات کے لئے اُن کے مطب جانا پڑا تو میں نے اکثر دفعہ دیکھا ہے کہ کوئی نہ کوئی شاعر موجود رہتا ہے انھیں اپنے پاس سے دوائیں مفت دیتے ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے دوستوں کے علاج کے سلسلہ میں کوئی فیس نہیں لیتے۔ یعنی اُن سے اپنی خدمت کا معاوضہ نہیں لیتے۔ فرصت ہو تو کلینک میں انڈین نیوز سروس کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔ شاعر کی حیثیت سے بھی کافی مشہور ہیں۔ ان کی بزم جوہر کی خدمات بھی قابلِ تحسین ہیں۔ گذشتہ ۱۴ برسوں سے بزم جوہر کی ادبی و شعری سرگرمیاں جاری ہیں۔ ہر ماہ نہایت پابندی سے شعر و ادب اور معاشرہ سے متعلق مختلف ادبی اجلاس منعقد کیا کرتے ہیں میں بزم جوہر کے اکثر جلسوں میں شریک رہا کرتا ہوں۔ بزم جوہر کے اجلاس عائشہ منزل (قریب مغل پورہ کمان) پر منعقد کرتے ہیں مختلف دانشورانِ شعر و ادب ادبی اجلاس اور مذاکروں میں حصہ لیتے ہیں شعر و سخن کی محفل میں بحیثیت شاعر کلام سناتے ہیں بزم جوہر کی

محفل میں شہر کی نمائندہ شخصیتیں مدعو رہتی ہیں جو اپنے فکر و فن کی موتیاں لٹاتے رہتے ہیں۔ ایسے دانشور، شاعر و ادیب بھی شرکت کرتے ہیں جن کے فکر و فن کی دولت سے اُن کا دامن ہمیشہ بھرا ہوا رہتا ہے۔
ڈاکٹر راہی بزم جوہر کے سالانہ جلسے بڑے اہتمام سے منعقد کرتے ہیں عام جلسوں کے مقابلے میں سالانہ جلسوں میں کچھ اور نمایاں شخصیتیں شریک رہا کرتی ہیں یہ ایک ایسی بزم ہے کہ جس کی سرگرمیاں شہر کی ادبی انجمنوں میں اپنی منفرد کارکردگی کی وجہ سے اہم بھی جاتی ہے ڈاکٹر راہی تنہا اس انجمن کے سب کچھ ہیں سارے انتظامات وہی کرتے ہیں اگرچہ بزم جوہر کے کچھ اراکین بھی تعاون کا جذبہ رکھتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر راہی کے کام کرنے کا طریقہ کچھ ایسا ہے کہ وہ اپنا کام خود کرنا چاہتے ہیں تاکہ کارکردگی میں کسی قسم کا جھول پیدا نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ بزم کے بانی ہیں جو ہر حال میں اپنے جلسوں کو کامیابی سے ہم کنار کرنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر راہی نہ صرف غزل کے شاعر ہیں بلکہ انہوں نے بہت ہی اچھی اچھی نظمیں بھی کہی ہیں ان کے شعری مجموعوں میں عمدہ عمدہ نعتیں بھی ملیں گی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ راہی حبِّ رسول پاک میں ڈوب کر شعر کہتے ہیں ڈاکٹر راہی کے تاحال تین شعری مجموعے دستک تب تاب مہک کے نام سے شائع ہو چکے ہیں نثر میں ان کی ایک کتاب شائع ہونے والی ہے جو ان کے ادبی مضامین پر مشتمل ہوگی۔ ڈاکٹر راہی کے کچھ مضامین ادبی رسائل میں چھپتے رہتے ہیں ڈاکٹر راہی شگفتہ شائستہ نثر

سکتے ہیں۔ بزم جوہر کے جلسوں میں ان کے کلیدی نوٹ کی بھی کافی اہمیت رہتی ہے ایک جملہ بھی بھرتی کا نہیں ہوتا۔ ان کا نوٹ مبصرین تقریب کے لئے سرچشمہ موضوع ثابت ہوتا ہے۔

ڈاکٹر راہی سے میری ملاقات کا سلسلہ بہت قدیم ہے۔ میری ابتدائی شاعری کے زمانے میں جو شعرا مشاعروں میں شرکت کرتے تھے ان میں سے تقریباً ۷۵٪ شاعر کہاں ہیں کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ۴۰ برسوں میں جو شعرا اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا احساس دلاتے رہے ہیں ایسے شاعر مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ ڈاکٹر راہی کو میں گذشتہ ۱۲، ۱۵ برسوں سے کچھ زیادہ ہی جاننے لگ گیا ہوں۔ جب سے ادارہ شہر میرے لوگ سے وابستہ ہو گئے ہیں ادارہ کے جلسوں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں مجھ سے متعلق اور میرے خاص شاعر دوستوں سے متعلق جو ادبی محفلیں سرگرم عمل رہتی ہیں ان میں ڈاکٹر راہی موجود رہا کرتے ہیں جیسے ادارۂ میرا شہر میرے لوگ، ایوانِ پریس معظم جاہ شجیع، سوغاتِ نظر، خورشید احمد جامی میموریل اکیڈیمی وغیرہ۔

مسلسل ملاقاتوں نے دوستی اور مراسم کو کافی استحکام بخشا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ ہر اہم مشاعرہ میں جس میں میں شرکت کرتا ہوں یا میرے زیر انتظام رہتا ہے ڈاکٹر راہی بھی شریک رہتے ہیں۔ اضلاع کے مشاعروں میں بھی ڈاکٹر صاحب ساتھ رہتے ہیں۔ اضلاع کے مشاعروں میں تقریباً ۱۲، ۱۵ سال سے شرکت کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر راہی یار باش

باکردار، اصول پسند، صاف گو اور اپنے دوستانہ مراسم میں دیانت دار آدمی ہیں جو بات کہتے ہو صاف صاف کہتے ہیں وہ اپنے دوستوں کو ہمیشہ خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے شاعر دوست انتہائی خوشگوار ماحول میں اپنا شعری و ادبی سفر جاری رکھیں اور شعر و ادب کی جو اعلیٰ اقدار ورثے میں ملی ہیں ان کی پاس داری کریں اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو یاد کرتے رہیں۔ نہ صرف اپنی بہتری کے لئے بلکہ معاشرہ کی بہتری کے لئے بھی۔ ڈاکٹر راہی صرف ایک شاعر ہی نہیں مبصر بھی ہیں اور بہترین نقاد بھی ہیں تمام اصناف سخن سے انھیں دلچسپی ہے لیکن غزل ان کے شاعرانہ مزاج سے ہم آہنگ ہے بڑے سلیقے سے شعر کہتے ہیں تحت اللفظ میں کلام سناتے ہیں ان کا شعر سنانے کا انداز بہت منفرد ہے مشاعروں میں چھا جاتے ہیں شعر اس انداز سے پڑھتے ہیں کہ سامع پوری توجہ کے ساتھ ہمہ تن گوش ہو جاتے ہیں ایسا شاعر ہمیشہ کامیاب رہتا ہے جس کے اشعار کے ساتھ سامعین بھی سفر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر راہی کے ساتھ اضلاع کے مشاعروں کا سفر نہایت کامیاب رہتا ہے خوشگوار موڈ میں رہتے ہیں سنجیدہ، شائستہ و پُر لطف لطیفے سناتے ہیں لیکن سنتے زیادہ ہیں۔ اضلاع کے مشاعروں میں ہم ذریعہ کار جاتے ہیں کار کا سفر ہمارے لئے سہولت بخش رہتا ہے وقت پر پہنچ جاتے ہیں اور آرام سے جاتے اور آتے ہیں مشاعرے کے فوراً بعد شہر کے لئے

روانہ ہوتے ہیں صبح ۶ ، ۷ بجے تک شہر لوٹ جاتے ہیں ساری رات جاگنے
میں کٹ جاتی ہے عموماً اضلاع کے مشاعروں میں شرکت کے لئے ہم دوپہر
کے بعد اپنے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔ میں اور میرے ہم خیال
مشاعر ۳۰ برس سے اضلاع کے مشاعروں میں شرکت کر رہے ہیں۔
اضلاع کے مشاعروں میں میرے ہم خیال شاعر زیادہ مدعو کئے جاتے ہیں
ڈاکٹر راہی نہ صرف مشاعروں کی گہما گہمی سے دلچسپی رکھتے ہیں بلکہ اردو
تحریک اور اردو کاز کے لئے بھی کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نہ صرف
شہر کے اور اضلاع کے مشاعرہ میں ہی شرکت کرتے ہیں بلکہ کل ہند
مشاعروں میں بھی مدعو کئے جاتے ہیں۔ کل ہند مجلس اتحاد المسلمین کے
زیر اہتمام منعقدہ کل ہند نعتیہ مشاعرہ میں بھی کلام سناتے ہیں مشاعرہ میں
ڈاکٹر صاحب کو میں نے کبھی شیروانی پہنے نہیں دیکھا البتہ کوئی خاص تقریب
ہو تو شیروانی پہنتے ہیں ڈاکٹر راہی کسی سے دوستی کرتے ہیں تو جم
کر کرتے ہیں ان کی دوستی مثالی ہوتی ہے دوستوں کے کام آتے ہیں وہ شہر
کے والا جاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر راہی خوش مزاج، نفاست
پسند، دین دار اور با مروت آدمی ہیں ان کا یہ وصف آج کا نہیں برسوں کا

قاضی انجم عارفی

(مُسلم معاشرہ کی مہذب شخصیت۔ کہنہ مشق شاعر)

وہ لوگ جو اعلیٰ قدروں، انسانی رشتوں اور تہذیبی افکار کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی زندگی کے ایک ایک لمحہ کو کیف آور، سرسبز و شاداب اور خوشگوار بنانے کا ہنر جانتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی طرح داری، کج کلاہی اور وضع داری کو اپنی بہترین زندگی اور اپنے عمدہ طرزِ حیات کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور وہ لوگ جو محبت و اخوت، شرافت و نجابت، مروت و صداقت، رواداری، روایت پسندی اور تہذیب و ثقافت کو حاصل زندگی سمجھتے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے رہن سہن، اپنے طور و طریق اور اپنے رکھ رکھاؤ کے تناظر میں اپنے اسلاف کی روشن علامتوں کے ترجمان ہوتے ہیں، اور وہ لوگ جن کا ایک ایک پل معاشرہ کی سُرخروی اور اس کی بہتری کے لئے سرگرم عمل رہتا ہے اور وہ لوگ جو دوسروں کی مسرتوں کو دوبالا کرنے کے لئے اپنے حصہ کی خوشیاں دوسروں میں بانٹ

دیتے ہیں اور وہ لوگ جن کا مقصدِ حیات ہی پھولوں کو تازگی بخشنا، ماحول کو تر و تازہ بنانا، نسیمِ صبح کی ہر انگڑائی کو اپنا ہم نوا بنانا اور معطر فضاؤں کو ساری انسانیت کے لیے چشم نگراں کا اعزاز عطا کرنا ہوتا ہے اور وہ لوگ جن کا دامن مہکتے ہوئے پھولوں، تازہ ہواؤں، کرن کرن اجالوں اور حیات افروز لمحات سے معمور ہوتا ہے ایسے ہی دانشورانِ شعر و ادب اور صاحبانِ علم و دانش میں قاضی انجم عارفی کا بھی شمار ہوتا ہے۔

ہر انسان کو اپنی زندگی میں کچھ ایسے لوگوں سے بھی تعارف ہوتا ہے جن کے بارے میں سوچنے، سمجھنے اور غور کرنے سے دل و دماغ مہکنے لگتے ہیں۔ خوش مزاجی و خوش طبعی، دل پذیری و دل آویزی، دلبستگی و بُردباری، ملنساری و اعلیٰ ظرفی، روابط میں بے ساختگی اور معاملاتِ دین و دنیا میں صداقت پسندی، راست گوئی، حق پرستی و قدر شناسی انسان کو اعلیٰ و ارفع بنا دیتی ہے۔

قاضی صاحب اپنے عمدہ خصائل، اپنی اعلیٰ قدر و قیمت اور اپنے پُر اثر تہذیبی رشتوں کو محسوس کرنے والی شخصیت کی حیثیت سے اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ شعری و ادبی ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے اُن کے والدِ محترم قاضی میر لطف علی عارف البو العلائی اپنے وقت کے ممتاز شاعر و ادیب ۱۲ کتابوں کے مصنف / مؤلف تھے انجم عارفی صاحب اپنے ورثے کے تقدس کے تسلسل میں اپنے

شعری و ادبی سفر کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری، ان کی زندگی کی آئینہ دار ہے چاہے وہ مذہبی شاعری ہو کہ غیر مذہبی شاعری غزل گوئی یا نظم نگاری۔ وہ پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ قلم و قرطاس کی آبرو کو باقی رکھتے ہوئے اپنے منصبِ شاعری پر فائز ہیں۔

قاضی صاحب سے میرے ایک یا دو دن کے نہیں برسوں کے مراسم ہیں۔ ہماری شناسائی کو دوستی کا روپ اختیار کرنے ہیں کچھ زیادہ دن نہیں لگے۔ ہماری ابتدائی پہچان رفتہ رفتہ دوستی کے زمرہ میں داخل ہوگئی۔ اب ہماری دوستی دوستی کے معیار پہ پوری اُتر چکی ہے۔ قاضی صاحب سے میرے روابط اُس وقت زیادہ استوار ہوئے جب مجھے اپنے رشتے کی ایک بہن کے میرج سرٹیفکٹ کے سلسلے میں فی الفور اُن سے تعاون حاصل کرنا ضروری تھا (چونکہ میری بہن بیرون ملک جانے والی تھی) مجھے یاد نہیں ہے کہ قاضی صاحب سے میری پہلی ملاقات کب، کہاں اور کس سلسلے میں ہوئی تھی البتہ مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ پہلی ملاقات تعمیر ملت کے سالانہ جلسۂ رحمتہ للعالمین کے موقع پر ہوئی تھی وہ بھی اُس جلسے میں نعت شریف سنانے والے تھے۔ اسی جلسے میں مجھے بھی نعتیہ کلام سنانے کی سعادت حاصل ہوئی تھی (یہ بات شاید زائد از ۲۵ برس پہلے کی ہے) قاضی صاحب سے جب میرے روابط میں اضافہ ہونے لگا تو میں نے اُن میں وہ تمام خوبیاں پائیں

جو ایک بہترین انسان اور ایک بہترین دوست کی نمایاں خصوصیات سمجھی جاتی ہیں۔ میں نے یہ طے کیا کہ قاضی صاحب جیسے ایک اچھے انسان اور ایک اچھے شاعر کو اپنی محفلوں میں مدعو کرنا چاہیئے۔ چنانچہ میں نے انہیں اپنے ہم خیال حلقوں سے متعلق ادبی جلسوں اور مشاعروں میں مدعو کرنا شروع کیا۔ مجھے اُس وقت زیادہ خوشی ہوتی تھی جب وہ اپنی پوری شخصیت کے ساتھ محفلِ شعر و ادب میں داخل ہوا کرتے تھے۔ اور اپنی ایک صاف ستھری غزل سُنا کر محفل میں اپنی شاعرانہ عظمتوں کا رنگ جماتے تھے۔ مشاعروں کے علاوہ اُن سے دیگر ادبی و تہذیبی علمی و ثقافتی محفلوں میں بھی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ہر ملاقات میں ان کا اندازِ گفتگو، ان کی شرافت و محبت اور ان کے بے لوث خلوص کے بہت سے جوہر کُھلنے لگے۔

کہا جاتا ہے کہ اچھے لوگوں سے رسم و راہ رکھنے سے زندگی کا زاویہ ہی بدل جاتا ہے۔ لوگ اچھے دوستوں اور اچھے انسانوں کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن مجھے اچھے دوستوں کی تلاش میں زیادہ محنت نہیں لگی۔ تازہ پھولوں کی مہک کی طرح مجھے اچھے دوست ملتے رہے اور میں ہر موسم کی تازہ ہواؤں کی طرح ان کا خیر مقدم کرتا رہا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اپنے بعض دوستوں پر بہت زیادہ نازاں ہوں جن میں سے ایک دوست قاضی انجم عارفی بھی ہیں۔ قاضی صاحب انتہائی پُر خلوص، با اعتماد، پُر وقار صلح کُن، پاکیزہ طینت، شائستہ طبیعت اور عمدہ اقدار کی ترجمانی کرنے والے

ایک مہذب شہری ہیں۔ ان سے جو بھی ملتا ہے یا تو وہ اُن کا بن جاتا ہے یا اُن کو اپنا بنا لیتا ہے لیکن زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو اُن کے بن جاتے ہیں۔ ہماری محفلوں میں قاضی صاحب جب رونق افروز ہوتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ موسم بہاراں کو لا رہے ہیں ہمارا تجربہ ہے کہ شخصیت ہر ایک کی نہیں بنتی۔ جن کی بن جاتی ہے اُن کے پیچھے اُن کی شرافت و کردار کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے معاشرہ میں بے شمار لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے لیکن سیکڑوں لوگوں میں سے کچھ ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی پہچان کے ساتھ ملتے ہیں۔ قاضی انجم عارفی کو کون نہیں جانتا۔ شہر کے تمام علماء و مشائخین ہی نہیں تقریباً تمام شاعر و ادیب اور مختلف علمی و ادبی اداروں سے وابستہ اصحاب بھی اُن کے قدرشناس ہیں۔

قاضی صاحب نے وقف بورڈ کی اپنی خدمات کے ذریعہ لوگوں کی بروقت مدد کی ہے (آج بھی کرتے ہیں) ہمیں یہ بات بھول نہیں ہوں کہ جناب عابد علی خان صاحب اور محبوب حسین جگر (سیاست) قاضی صاحب کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ وقف بورڈ سے متعلق اگر کوئی کام ہوتا تو مجھ سے فرماتے کہ قاضی صاحب سے کہہ دو کہ ہم سے مل لیں۔ قاضی صاحب فی الفور دفتر سیاست آتے اور انتہائی سعادت مندی کے ساتھ تفویض کردہ کام بہ حسن و خوبی انجام دیتے۔ شہر میں بہت سے ایسے صاحبانِ علم و فن ہوں گے جو قاضی صاحب سے تعاون حاصل کرتے ہوں گے۔

ہر شخص کی زندگی میں اپنے دوستوں کی ایک فہرست ہوتی ہے۔
کسی کی فہرست بہت طویل ہوتی ہے تو کسی کی بہت مختصر۔ لیکن قاضی صاحب اتنے فراخ دل واقع ہوئے ہیں کہ ان کے دوستوں کی ایک بہت بڑی فہرست ہے۔ قاضی صاحب کو میں نے ہمیشہ شگفتہ موڈ میں پایا۔ نہ تو وہ زمانے کی شکایت کرتے ہیں اور نہ ہی زمانے والوں کی۔ انجم عارفی جیسے مطمئن لوگ بہت کم ہوتے ہیں اپنے ہر کام کو اللہ کی مرضی پر چھوڑنے والے لوگ ہمیشہ خوش رہتے ہیں مجھے یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے کہ وہ ایک سایہ دار درخت کی طرح صدر خاندان کے فرائض نہایت سعتری اور وضع داری کے ساتھ نبھا رہے ہیں نیک اولاد ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی پتہ نہیں کونسی نیکیوں نے قاضی صاحب کو اپنے تمام اہل خاندان سے اس قدر جوڑ رکھا ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ خدا کی مہربانی کے ساتھ ساتھ ان کے والدین کی دعائیں بھی ان کے ساتھ ہیں تہذیب یافتہ باادب بیٹوں کے تذکروں سے وہ اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے انہیں دنیا کی ساری دولت مل چکی ہے۔ اپنے شاعر بیٹے فاروق عارفی ہی نہیں بلکہ تمام بیٹوں (قاضی سلیم عارفی، قاضی ساجد عارفی، قاضی جاوید عارفی اور قاضی خسرو عارفی) پر ان کا دست شفقت بلند رہتا ہے (تبھی تو تمام بیٹے تہذیبی اقدار کے پاسدار ہیں) قاضی صاحب کے گھر کا ہر فرد معطر فضاؤں اور لوازمات کی برکتوں سے مالا مال ہے ان تمام پر رحمتِ خداوندی سایۂ فگن ہے۔ اور جس گھر پر خدا کی خاص

در بانی ہوتی ہے وہاں کا حال ہی کچھ اور ہوتا ہے سارے گھر میں روشنی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جس طرف بھی نظر اٹھائیے اجالا ہی اجالا نظر آئے گا۔

انجم عارفی ایک شاعر دوست کی حیثیت سے بھی اپنی شاعر برادری میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ میں نے انہیں معاشرہ کی ہر اونچی سطح پر دیکھا ہے چاہے وہ سرکاری ماحول ہو کہ غیر سرکاری ماحول قاضی صاحب اپنے شناساؤں اور اپنے وسیع حلقۂ احباب میں گھرے ہوئے رہتے ہیں۔ علماء و فضلاء کی مجالس ہوں کہ شاعروں، ادیبوں صحافیوں کی محفلیں ہوں بے حد پسند کئے جاتے ہیں۔ میں نے قاضی صاحب کو جہاں راشٹرپتی نیلائم میں سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما اور راج بھون میں سابق گورنر آندھرا پردیش (موجودہ نائب صدر جمہوریۂ ہند) جناب کرشن کانت کو شعر سناتے ہوئے دیکھا ہے وہیں انہیں چھوٹی چھوٹی شعری محفلوں میں بھی کلام سناتے ہوئے دیکھا ہے بزرگوں نے کہا ہے کہ بہترین انسان اپنے بہترین فن کا مظاہرہ کرتا ہے اور ایک اچھا انسان اپنے نکھرے ستھرے خیالات سے معاشرہ کے تمام گوشوں کو فیض پہونچاتا رہتا ہے۔ عارفی صاحب شہر کی خاص خاص ادبی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں ادارہ میرا شہر میرے لوگ ایوانِ پرستش معظم جاہ شجیع، سوغاتِ نظر، بزمِ جوہر، خورشید احمد جامی میموریل اکیڈمی کے ادبی جلسوں اور مشاعروں میں پابندی سے شرکت کرتے

ہیں۔ ان کی شاعری جہاں کلاسیکل اسکول کی نمائندگی کرتی ہے وہیں
عصر حاضر کے رجحانات کی بھی عکاس ہے۔ عارفی صاحب بنیادی طور
پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انہوں نے موضوعاتی نظمیں بھی کہی ہیں
ان کا نعتیہ کلام عقیدت میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ مجلس اتحاد المسلمین
کے سالانہ کل ہند نعتیہ مشاعروں میں وہ لازماً مدعو کئے جاتے ہیں۔
گذشتہ ۱۵، ۱۶ سال سے میں انہیں سن رہا ہوں۔ حب رسول میں
سرشار ان کی شاعری عاشقان رسول پاک کے قلب کو تسکین پہونچاتی
ہے ان کی غزلیہ شاعری بھی انسانی رشتوں کے اظہار کا موثر ذریعہ بنی
ہوئی ہے۔ عارفی صاحب کی شاعری پوری توجہ کے ساتھ پڑھے جانے کی
متقاضی ہے باشعور قاری اور صاحب نظر سامع سے داد و تحسین
حاصل کرتی رہتی ہے۔ قاضی انجم عارفی ایک دیدہ ور انسان ہیں۔ ان کے
اعلیٰ کردار کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ایک یار باش آدمی ہیں
لیکن اپنے رکھ رکھاؤ اور روابط میں کبھی کبھی فاصلے کی اہمیت کو بھی
پیش نظر رکھتے ہیں ہر ایک سے کھل کر ضرور ملتے ہیں لیکن خاص خاص
لوگوں سے اپنے روابط کو اولیت دیتے ہیں۔ وہ فطرتاً خوش طبع
خوش مزاج انسان ہیں۔ انہیں میں نے ہر موڑ پر کھرا اور سیدھا پایا۔

افتخار احمد اقبال

(بہترین شاعر۔ نامور ادیب، عمدہ انسان)

اگر کسی گھر میں تمام کے تمام لوگ لائق و فائق ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است"۔ چاہے ان کا تعلق زندگی کے کسی بھی شعبہ سے کیوں نہ ہو اور اگر کسی گھر کا سارا ماحول علمی و ادبی سرگرمیوں کا آئینہ دار ہوتا ہے تو وہاں کا ہر فرد اپنے اپنے ذوقِ سلیم کے مطابق اپنی صلاحیتوں کے بہترین اظہار کے موقف میں رہتا ہے۔ خاص طور پر ایسے گھرانوں کے لوگ جو علمی و ادبی مجلسوں سے وابستہ رہ کر معاشرہ کے لیے قابلِ قبول ہوتے ہیں وہ اپنی انفرادیت کے ساتھ خوشگوار زندگی گزارتے ہیں اس طرح کے لوگوں میں بہترین استاد اردو، نامور شاعر و ادیب جناب افتخار احمد اقبال بھی شامل ہیں۔ جن کے اسلاف نے علم و آگہی کے چراغ جلانے میں اپنی عمر گزار دی۔ افتخار احمد اقبال ممتاز شعرائے کرام خورشید احمد جامی اور امیر احمد خسرو کے چھوٹے بھائی ہیں۔ افتخار احمد اقبال صاحب

کا تعلق پیشہ درس و تدریس سے رہا ہے۔ وہ نہ صرف ایک عمدہ شاعر ہی ہیں بلکہ ایک نامور ادیب بھی ہیں جن کی نثر کا بہترین مظاہرہ روزنامہ "منصف" میں شائع شدہ تحریروں سے ہوتا رہتا ہے۔ افتخار احمد اقبال کی تحریروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انھیں نہ صرف کسی خاص موضوع پر ہی اظہار خیال کا ملکہ حاصل ہے بلکہ وہ بہترین انشاپرداز اور خاکہ نگار بھی ہیں۔ ہر نئے اور اچھوتے موضوع پر اس طرح خامہ فرسائی کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک صاحب طرز ادیب ہیں۔ انھوں نے کچھ سال کے لئے بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں جو بہت پہلے حیدرآباد کے بعض اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اقبال صاحب عمدہ نظمیں غزلیں رباعیات و قطعات بھی لکھتے ہیں۔ ان کی شاعری سے خاص طور پر شعرائے کرام اور مختلف مکاتب خیال رکھنے والے خورشید احمد جامی جیسے بھی ان کے مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان کی شاعری کلاسیکی شعری ادب کا بہترین نمونہ ہے لیکن عصری رجحانات سے بھی وہ لاعلم نہیں ہیں۔ شعر تحت میں بھی سناتے ہیں اور ترنم میں بھی۔ ان کا ترنم جگر اسکول کے شاعروں کی یاد دلاتا ہے۔ افتخار احمد اقبال کو میں تقریباً ۲۵، ۳۰ برسوں سے جانتا ہوں۔ ان سے میری اکثر ملاقات اس وقت ہوا کرتی تھی جب میں امیر احمد خسرو صاحب سے ملاقات کے لیے ان کے دولت خانہ پر پہونچتا تھا۔ اقبال صاحب، خسرو صاحب کے مکان بسیر اگارڈن سلطان پورہ میں رہتے ہیں، نہایت مخلص اور

نفیس انسان ہیں۔ خورشید احمد جامی میموریل اکیڈمی کے صدر نشین ہیں بلکہ یہیں اس اکیڈمی کا مشیر بھی رئیس اختر صاحب معتمد عمومی اور شفیع اقبال معتمد، شارق خسرو خازن ہیں۔ خورشید احمد جامی میموریل اکیڈمی کے ادبی اجلاس و مشاعرے ہر ماہ پابندی سے ہوا کرتے ہیں۔ اس اکیڈمی کے بانی جناب امیر احمد خسرو تھے۔ اکیڈمی کا افتتاح بڑے پیمانے پر ۱۹۹۶ء میں گاندھی بھون میں ہوا تھا افتتاحیہ جلسہ کے بعد کچھ مہینوں تک اکیڈمی کی ادبی محفلیں ہوتی رہیں لیکن خسرو صاحب کے انتقال کے بعد اس کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ لیکن ایکدن میں نے افتخار احمد اقبال سے کہا کہ جس انجمن کی بنیاد امیر احمد خسرو صاحب نے ایک خاص مقصد کے لیے رکھی تھی اس میں کسی قسم کا بھی تعطل مناسب نہیں ہے میری توجہ دہانی کے بعد اکیڈمی کی سرگرمیوں کا احیاء ہوا اور الحمد اللہ یہ اکیڈمی گذشتہ تین برسوں سے انتہائی پابندی کے ساتھ اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ اکیڈمی کے اجلاس، ادبی وسماجی، تہذیبی و ثقافتی موضوعات پر ہوا کرتے ہیں۔ مذاکرہ کا ہر موضوع اچھوتا اور چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ تاحال بیسیوں مذاکرے ہو چکے ہیں۔ اجلاسوں میں منتخب شعراء اپنا کلام سناتے ہیں۔ صدر اکیڈمی افتخار احمد اقبال انتہائی خلوص کے ساتھ میزبانی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ افتخار احمد اقبال کا تاحال ایک مجموعۂ کلام بھی شائع نہیں ہوا۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ وہ اپنا مجموعۂ کلام ترتیب دے چکے ہیں جو بہت جلد زیورِ طباعت سے

بہتر سے بہتر انداز میں آراستہ ہونے والا ہے۔ افتخار احمد اقبال
ایک اچھے مقرر بھی ہیں ان کے علمی و ادبی، سیاسی و سماجی معلومات
قابلِ تحسین ہیں۔ ہر موضوع پر مکمل کر اظہارِ خیال کرتے ہیں شعری ادب
ہو کہ نثری ادب ان کا مطالعہ گہرا ہے بہت ہی عمدگی کے ساتھ اپنا
مافی الضمیر ادا کرتے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں نامور شاعر خورشید احمد جامی کے
منتخب کلام کو جمع کر کے ایک ضخیم مجموعہ "انتخاب کلام جامی" کے نام سے شائع
ہو چکا ہے جس کے مرتب جناب رئیس اختر ہیں اس کتاب کی ترتیب و
تزئین اور اشاعت کے مراحل میں افتخار صاحب کی شخصی دلچسپی کا بھی
بہت بڑا دخل رہا ہے۔ افتخار احمد اقبال کے بعض قریبی رشتہ داروں
میں نامور مزاح نگار رشید قریشی اور عزیز قریشی پروگرام اگزیکیٹو آل
انڈیا ریڈیو بھی شامل ہیں جو اب ہم میں نہیں رہے۔ افتخار احمد اقبال
کو علم عروض سے بھی اچھی خاصی واقفیت ہے۔ محبت شناس انسان ہیں
دورانِ گفتگو یہ احساس ہوتا ہے کہ ان میں حسِ مزاح بھی موجود ہے
مذاکروں کے دوران ان کی گفتگو گرچہ طویل رہتی ہے لیکن بامعنی ہوتی ہے
وہ ایک اچھے شاعر و ادیب کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں شہرت
رکھتے ہیں وہ اس بات کی تمنا رکھتے ہیں کہ ادبی سرگرمیاں پُراثر انداز میں جاری رہیں
اور ارتقائی منزلیں طے کرتی رہیں۔ زمانہ ایسے لوگوں کو ہمیشہ اچھی نگاہوں سے دیکھتا ہے
جو اپنے بزرگوں کی یاد کو تازہ رکھتے ہیں۔ اکیڈمی کے ذریعہ خورشید احمد جامی اور امیر احمد خسرو کی
یاد کو تازہ کیا جا رہا ہے خدا ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم ہمیشہ اپنے بزرگوں کی اعلیٰ

روایات کو باقی رکھیں اور ان کے نقشِ قدم پر گامزن رہیں۔

افتخار احمد اقبال کو میں نے خورشید احمد جامی میموریل اکیڈمی کے قیام سے پہلے کبھی کسی مشاعرے میں کلام سناتے ہوئے نہیں دیکھا تھا شاید انہیں مشاعروں میں شرکت کرنا اور کلام سنانا پسند نہیں۔ بعض شاعر ایسے ہوتے ہیں جو صرف اپنے مخصوص احباب کو ہی کلام سناتے ہیں۔ افتخار احمد اقبال ایسے شاعر بھائیوں خورشید احمد جامی اور امیر احمد خسرو کی بہت عزت کرتے تھے افتخار احمد اقبال فارسی زبان پر بھی عبور رکھتے ہیں ان کے کلام میں اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور ہندی کے بہت سے الفاظ ملیں گے۔ افتخار احمد اقبال صاحب، ہندی زبان سے بھی اچھی طرح واقف ہیں ان کے کلام میں ہندی کے مانوس لفظ بڑی خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ ان کا کلام شہر کے اخباروں میں بھی شائع ہونا چاہیئے اور ادبی رسالوں میں بھی۔ "خوشبو کا سفر" میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے افتخار احمد اقبال کا رکھ رکھاؤ بھی ان کے بزرگوں کی اعلیٰ روایات کی ترجمانی کرتا ہے۔ خوش مزاج، شائستہ طبیعت اور معقول انسان ہیں۔ افتخار احمد اقبال سے کسی بھی محفل میں ملاقات ہوتی نہیں کیونکہ وہ ادبی و شعری محفلوں میں شرکت کرنے سے گریز کرتے ہیں البتہ خورشید احمد جامی میموریل اکیڈمی کی ادبی تقریب میں اُن سے لازماً ملاقات ہو جاتی ہے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے بھائی امیر احمد خسرو کی قائم کردہ ادبی انجمن خورشید احمد جامی میموریل اکیڈمی کو بہتر سے بہتر سرگرم عمل کے لیے شخصی دلچسپی لیا کرتے ہیں۔

رشید جلیلی

(خانوادۂ جلیل کا ایک اور چراغ۔ ایک اچھے شاعر)

اُردو شعروادب کی تاریخ میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ بعض شاعروادیب اپنے اسلاف کے کارناموں کا عکسِ جمیل بن کر ابھر چکے ہیں۔ اور اب بھی اس طرح کے قلم کار و فن کار ملتے ہیں جو اپنے باکمال پرکھوں کی روایت کے امین ہیں۔ جن شاعروں کو شاعری ورثے میں ملی ہے ان کے نام شعری وادبی محفلوں میں پچھلی روایتوں کے حوالے سے لیے جاتے ہیں۔ ایسے بھی بہت سے شاعروادیب گزرے ہیں اور موجود ہیں جن کے اسلاف میں کوئی ایک بھی صاحبِ قرطاس و قلم نہیں تھا حیدرآباد کے ایک کہنہ مشق شاعر جناب رشید جلیلی کا تعلق اس تمہید کے پہلے حصہ سے ہے۔ اس لیے میں نے خانوادۂ جلیل کا ایک اور شاعر لکھا ہے خانوادۂ فصاحت جنگ جلیل کے سب سے روشن و مستند شاعر، ادیب و نقاد ڈاکٹر علی احمد جلیلی ہیں۔ رشید جلیلی کی شاعری کا

کارشتہ بھی وضاحت بنگ جلیل کے فکر و فن کی پرچھائیوں اور رعنائیوں کا ایک تسلسل ہے جنہیں ڈاکٹر علی احمد جلیلی سے شرفِ تلمذ حاصل ہے
رشید جلیلی کی ملازمت کا تعلق محکمہ ٹیلی کمیونیکیشنز سے رہا ہے۔ ان کی ملازمت کا آغاز ۱۹۶۵ء سے ہوا اور ۱۹۹۸ء میں بہ حیثیت اسسٹنٹ انجینئر ٹیلی کمیونکیشنز وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ ملازمت کے سلسلے میں رشید جلیلی صاحب کو ملک کے کئی مقامات (احمد آباد۔ سورت، ممبئی وغیرہ) پر جانا پڑا۔ جہاں بھی وہ رہے شعر و ادب سے دلچسپی لیتے رہے۔ کئی مشاعروں میں حصہ لیتے رہے۔ رشید جلیلی نے جامعہ عثمانیہ سے اُردو میں ایم اے کیا۔ جبل پور (مدھیہ پردیش) سے ٹیلی کمیونکیشنز انجینئرنگ کا ڈپلوما لیا۔ رشید جلیلی سنگا ریڈی میں بھی اسسٹنٹ انجینئر ٹیلی کمیونکیشنز کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ سنگا ریڈی میں مشاعروں کا اہتمام کیا۔ منتظمین مشاعرہ کے ساتھ تعاون کیا۔ جب رشید جلیلی کا تبادلہ حیدرآباد ہوا تو وہ مشاعروں سے دلچسپی لینے لگے اور جب ہمیں معلوم ہوا کہ رشید جلیلی، ڈاکٹر علی احمد جلیلی کے شاگرد ہیں تو ہم نے انہیں اپنی محفلوں میں شرکت کی دعوت دی۔ "میرا شہر میرے لوگ" "سوغاتِ نظر" خورشید احمد جامی میموریل اکیڈمی، بزمِ حیدرآباد رحیانِ اُردو کے مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ رشید جلیلی غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں اور قطعات بھی۔ نعتیں اور منقبتیں بھی کہتے ہیں۔ کلام ترنم میں سناتے ہیں داد و تحسین سے نوازے جاتے ہیں۔ عنقریب ان کا مجموعۂ کلام "آبرو کے قدم"

کے نام سے شائع ہونے والا ہے۔ رشید جلیلی نہایت منکسر المزاج، وضع دار اور نیک صفت انسان ہیں۔ ان کی شخصیت کچھ اس طرح کی ہے کہ ان سے ملنے والا پہلی ملاقات ہی میں اُن سے متاثر ہو جاتا ہے۔ بہت ہی پاک وصاف، با اخلاق، مخلص آدمی ہیں۔ آداب محفل کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اختتام محفل تک شریک محفل رہتے ہیں جو ان کی شائستگی اور ان کے اخلاق کی دلیل ہے۔ ادبی و شعری محفلوں میں وقت پر آتے ہیں۔ پوری توجہ کے ساتھ تقریریں بھی سنتے ہیں اور شعر بھی سنتے ہیں۔ اچھے شعر سن کر داد دینے کا انداز بھی باوقار ہوتا ہے۔ خندہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ اپنے احباب سے ملتے رہتے ہیں۔ ان کے چہرہ پر دوران ملاقات مسکراہٹ نمایاں رہتی ہے۔ وعدہ کے پابند اور ایک با اصول انسان ہیں۔ ہماری محفلوں میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں کبھی کبھی غزل سنانے سے قبل قطعات بھی سناتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ اپنے حلقے کے بہت سے شاعروں و ادیبوں کو ٹیلیفون ڈپارٹمنٹ کی بعض کارروائیوں کے سلسلے میں تعاون کرتے ہیں میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ وہ دوسروں کا مدد کرکے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وعدہ خلافی کے لئے ان کے ہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ نہایت کھرے اور سیدھے سادے انسان ہیں۔ میرے بہت سے شاعر دوستوں کی طرح رشید جلیلی بھی اپنے مزاج کی شگفتگی، طبیعت کی نفاست اور جذبۂ دوستی کو محفوظ رکھتے ہوئے مجھ سے

ملتے ہیں۔ رشید جلیلی کا کلام آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہوتا رہتا ہے روزنامہ سیاست کے علاوہ "خوشبو کا سفر" میں بھی اشاعت پذیر ہوتا رہتا ہے۔ پابند صوم و صلوٰۃ نیک انسان ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ خانوادہ جلیل کے ایک منفرد شاعر کی حیثیت سے شعری و ادبی حلقوں میں اپنا نام روشن رکھیں گے۔ اور ان کی شاعری شعری و ادبی حلقوں میں پسند کی جاتی رہے گی۔

سردار نانک سنگھ نشتر

(صاف گو۔ نیک سیکولر انسان، شاعر و ادیب)

حیدرآباد میں سکھوں کی تعداد بہت کم ہے یا سیرل، بدھسٹ اور جین مت کے ماننے والوں کی طرح۔ زیادہ تر سکھ تجارت پیشہ ہیں۔ کچھ سکھ ملازم سرکار بھی ہیں۔ ان ہی سکھوں میں سے ایک کا ہمارے شہر کی محفلوں میں بہت زیادہ شہرہ ہے۔ جو بنیادی طور پر ایک ادیب، شاعر مقرر اور فلاحی کاموں میں مصروف رہنے والے سیکولر انسان ہیں اور جن کا نام آئے دن اخبارات میں کبھی شاعر اور کبھی مقرر کی حیثیت سے دکھائی دیتا ہے۔ معاشرہ کی وہ نامور شخصیت سردار نانک سنگھ نشتر ہیں۔ نشتر صاحب اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کا بھی احترام کرتے ہیں۔ کافی فراخ دل، روشن خیال اور دیانت دار آدمی ہیں۔ وحدانیت کے قائل ہیں۔ میں اپنے تجربات کی روشنی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ وہ اپنے مذہب کے بعد مذہب اسلام سے بہت قریب ہیں۔ دیگر

مذاہب کے سلسلے میں بھی اُن کی معلومات قابلِ تحسین ہیں۔ نشتر صاحب ہر موضوع پر اظہارِ خیال کی طاقت رکھتے ہیں۔ اصلاحِ معاشرہ کی گفتگو اور مذہبی جلسوں میں انہیں خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے۔

کھلا ذہن روشن دل، پاک و صاف اور تہذیبِ فکر و خیال کے آئینہ دار ہیں۔ مزاج میں بردباری، رواداری، محبت و آشتی پائی جاتی ہے۔ بذلہ سنج اور ظریف انسان کی حیثیت سے بھی اپنے احباب میں مشہور ہیں۔ انہیں بے شمار لطیفے یاد ہیں ہر موضوع پر بہترین لطیفے سنانے کے موقف میں رہتے ہیں۔ اپنے لطیفوں سے محفل کو خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ بے ساختہ ہنسی کا سامان فراہم کرتے ہیں معاشرہ میں پھیلے ہوئے مسائل اور بعض شخصیتوں پر ان کے لطائف برجستہ ہوا کرتے ہیں خوب ہنستے ہیں اور خوب ہنساتے بھی ہیں نشتر صاحب جب علمی و ادبی، سیاسی و تہذیبی موضوع پر گفتگو کرتے ہیں تو بہت سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ نہایت مخلص، اچھے دوست، اصول پسند نفیس انسان اور مہذب شخصیت کے حامل ہیں۔ ہمارے شہر کے معززین میں اُن کا شمار ہوتا ہے شہر کے مختلف علمی و ادبی اداروں اور فلاحی و تہذیبی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔ نشتر صاحب کے زیادہ تر دوست مسلم ہیں شہر کے مسلم اداروں کے اربابِ مجاز کی نظروں میں رہتے ہیں ہر اہم موقعہ پر نشتر صاحب کو اپنی محفل کا ایک حصہ بنا لیتے ہیں۔ نشتر صاحب عام مشاعروں میں اپنا کلام نہیں سناتے۔ البتہ ادارہ میرا شہر میرے لوگ

ایوان پرنس معظم جاہ شجیع سوغات نظر کی ادبی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں ان انجمنوں سے ہٹ کر کبھی کبھی خاص خاص محفلوں میں وہ کلام سناتے ہیں چنانچہ انہوں نے راشٹرپتی نیلائم میں منعقدہ مشاعرہ میں بھی کلام سنایا جبکہ صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیالی شرما تھے ۔ آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن سے شاعری کے علاوہ ان کی تقریروں سے اہل اردو استفادہ کرتے ہیں ۔ حال ہی میں ان کی ایک کتاب انگریزی زبان میں KHS IN PRESENT CONTECT اور SELECTION FROM GURU GARNTH SAHIB کے نام سے شائع ہوئی ہے

سردار نانک سنگھ نشتر سے میری پہلی ملاقات ۴۰ سال پہلے ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کے دولت خانہ پر ہوئی تھی ان دنوں وہ اردو فاضل کا امتحان کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے ۔ ڈاکٹر زور اس ہونہار سردار کی اردو دوستی اور ان کی اردو زبان و روایات سے دلچسپی کو سراہتے رہے تھے ۔ اس پہلی ملاقات کے بعد کئی برسوں تک ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوئی البتہ سیاست اخبار میں وہ جب کوئی مضمون اشاعت کے لئے دینے آتے تو ملاقات ہو جاتی تھی ۔ جگر صاحب نشتر صاحب کو مضامین لکھنے کی ترغیب دیا کرتے تھے نشتر صاحب کے سیاست میں کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں ۔ گزشتہ ۵، ۶ سال پہلے ہمارے کی ملاقات کی کچھ اس طرح تجدید ہوئی کہ ہماری ملاقات دوستی میں بدل گئی ۔ اب تو یہ حال ہے کہ وہ مجھ سے متعلق ہر ادبی محفل و

مشاعرہ میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے کلام اور اپنے خطابت سے نوازتے ہیں۔ غالباً حیدرآباد کے شاعر دوستوں میں ہیں ہی ان کا قریبی دوست ہوں۔ کبھی کبھی وہ میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے ہیں سیاسی، غیر سیاسی، ادبی ایمنوں اور اردو کے مسائل موضوع گفتگو رہتے ہیں۔ شاعروں میں رئیس اختر، مومن خان شوق سے بھی ان کے اچھے مراسم ہیں۔ مدینہ ایجوکیشنل سنٹر کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جلسوں میں (جس کے داعی جناب کے یم عارف الدین ایڈیٹر عوام رہتے ہیں) شرکت کرتے ہیں۔ راج بھون کی تہذیبی و ثقافتی محفلوں میں بھی وہ مدعو رہتے ہیں۔ نشتر صاحب ایک محبت کرنے والے یار باش آدمی ہیں۔ شہر کی اعلیٰ سوسائٹیوں کی محفلوں میں بھی مدعو رہتے ہیں۔ راج بھون کی تہذیبی و ثقافتی تقاریب میں بھی پابندی سے شرکت کرتے ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں۔ ایم اے اردو کی ڈگری رکھتے ہیں۔ معاشی طور پر مستحکم ہیں، قناعت پسند ہیں خوش رہتے ہیں اور دوسروں کو خوش دیکھنے کے آرزومند رہتے ہیں نشتر صاحب اضلاع کے مشاعروں میں بھی مدعو رہتے ہیں ان کی موجودگی سے اضلاع کے مشاعروں میں کار کا سفر نہایت خوشگوار ماحول میں طے ہوتا ہے۔ کھل کر قہقہے لگانے کے عادی ہیں اپنی گفتگو سے ساری محفل کو متوجہ کرتے ہیں ان کے مزاج میں انکساری، روایت پسندی اور رواداری ہے۔ نشتر صاحب کثرت مطالعہ کے عادی ہیں

کتابوں سے انہیں عشق ہے ہر اچھی کتاب کا مطالعہ دل لگا کر کرتے ہیں معلومات کا خزانہ ہیں۔ ان سے ہر موضوع پر گفتگو کی جا سکتی ہے وہ اپنی مدلل گفتگو سے کسی کو بھی مایوس نہیں کرتے۔ انہیں علمی و ادبی معاملات میں شرمندگی کا منہ دیکھنا نہیں پڑتا۔ شہر کے تہذیبی شغلوں میں اپنی ذاتی پہچان کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔ ہر طبقہ کا فرد ان سے مل کر خوش ہوتا ہے انتہائی سیکولر پکے ہندوستانی ہیں لیکن ساری کائنات کے انسانوں سے رشتہ رکھتے ہیں انسانی رشتوں کے قدر داں ہیں انہیں انسانی مسائل کے حل میں دلچسپی رکھتے ہیں ظلم و استبداد، جھوٹ، فریب، مکر، ریاکاری کے ماحول سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ ان کے ہاں مصلحت کوشی، مفاد پرستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے جو بات بھی کہنی ہوتی ہے صاف صاف کہہ جاتے ہیں وہ کسی کی دلآزاری نہیں کرتے مستحق لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے سرگرداں رہتے ہیں۔ اصلاح معاشرہ میں جن لوگوں کو خاص دلچسپی ہے ان میں سے ایک اہم نام سردار نانک سنگھ نشتر کا بھی ہے نانک سنگھ نشتر کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن محفلوں میں صرف اور صرف اردو بولتے ہیں۔ وہ انگریزی ادبیات سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ان کی گفتگو میں انگریزی کا ایک لفظ بھی نہیں ہوتا۔ اردو کے مشکل اور آسان لفظ ان کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ لفظوں کا صحیح استعمال کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اپنے اندازِ گفتگو سے مخاطب کو متاثر کرتے

ہیں۔ دوسروں کی بات کو بھی پوری توجہ سے سنتے ہیں کسی کی گفتگو
کے دوران یہ خود دخل دیتے ہیں اور نہ ہی ان کے بیچ مسکراتے ہیں جانتے
ہیں۔ آدابِ محفل کا خیال رکھتے ہیں۔ گردوارہ گرو گوبند کمیٹی کے
صدر نشین رہ چکے ہیں۔ ادارہ میرا شہر میرے لوگ کے رکن عاملہ ہیں
سکھ برادری میں بڑی عزت و توقیر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں
اُن کے مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ میرے بہت ہی با اعتماد مخلص
ترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔ تمام شاعر دوست ان کی عزت
کرتے ہیں ان کی اردو خدمت کو تہہ دل سے خراج پیش کرتے ہیں
نشتر صاحب ملک کی مختلف زبانوں کے معاملے میں کھلا ذہن رکھتے
ہیں۔ لسانی ہم آہنگی ان کا مزاج ہے۔ تمام مذاہب کے لوگوں سے
ان کا ربط ہے۔ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک رہتے ہیں۔
زندہ دل انسان ہیں۔ تمام لوگوں کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں ان کی
زندگی کا مقصد خوش رہو اور خوش رہنے دو ہے جو شخص
دوسروں کو ہمیشہ خوش رکھتا ہے یقیناً اس کا دامن بھی خوشیوں
سے بھرا رہتا ہے

سکھس ان پریزنٹ کانٹکسٹ SIKHS IN PRESENT CONTEXT
جولائی ۲۰۰۶ء میں دہلی سے شائع ہوئی جو مختلف سمیناروں میں پیش کردہ
مضامین پر مشتمل ہے جس میں سکھ مسلم تعلقات پر بھی ایک مضمون ہے دوسری کتاب
سلکشنس فرم گرو گرنتھ صاحب SELECTIONS FROM GRANTH SAHIB
اس میں گرو گرنتھ صاحب کے منتخب اشعار کا آسان انگریزی میں ترجمہ ہے
جولائی ۲۰۰۱ء میں حیدرآباد میں شائع ہوئی۔

ایم - پالیا

(گنگا جمنی تہذیب کی منفرد شخصیت، بہترین انسان)

ہمارے شہر حیدرآباد کی بنیاد ہی محبت، شرافت، رواداری اور آپسی بھائی چارگی پر رکھی گئی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ نہ صرف ہمارے اسلاف نے بھی اپنے حیدرآبادی ہونے پر فخر محسوس کیا بلکہ آج کے بکھرے ہوئے ماحول میں سانس لینے والے لوگ بھی اپنے حیدرآبادی ہونے پر ناز کرتے ہیں۔ حیدرآباد کی قدیم تاریخ خاص طور پر علمی، ادبی، تہذیبی، ثقافتی تاریخ نمایاں خصوصیات کی حامل رہی ہے۔ مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے حیدرآبادیوں نے ہر دور میں اپنے بہترین کارناموں کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ صالح روایات کے نسل میں جو لوگ اپنے اپنے زمانے میں سرگرم عمل رہے ہیں اور ان کی خوبیوں اور ان کے اعلیٰ کارناموں کا تذکرہ شہر کی مختلف محفلوں میں ہوتا رہتا ہے۔ آج بھی ہم جس ماحول میں

اور جن حالات میں بھی رہے ہیں ان میں بہت سے روشن دماغ اور قابل قدر و منزلت شخصیتیں موجود ہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنے اپنے طریقوں سے ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے شہر کے انسانیت دوستوں، بامروت شہریوں اور محبت شناس لوگوں کی فہرست میں ایک نمایاں نام ایم بالیا کا بھی ہے جن کی نیک نامی، انسان دوستی اور رواداری کی کئی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

حیدرآباد کے غیر مسلم، سیکولر ذہن و فکر کے حامل لوگوں میں بالیا صاحب کا نام بھی سر فہرست ہے۔ ہمارے شہر میں اچھے لوگوں کی آج بھی کمی نہیں ہے تب ہی تو شہر محبت نواز حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا دامن آج بھی پچھلے دور کی طرح کشادہ ہے۔ ایم بالیا کو میں تقریباً ۴۰ برس سے جانتا ہوں۔ حیدرآباد کے کانگریسی قائدین میں نمایاں حیثیت کے حامل قائد ہیں۔ پرانے شہر کے محلہ علی آباد میں اپنے آبائی مکان میں سکونت پذیر ہیں۔ بالیا صاحب آج بھی کانگریس سے وابستہ ہیں لیکن انہوں نے ملک کی مختلف سیاسی پارٹیوں میں بہت کچھ ایسا پایا ہے کہ وہ ان دنوں سیاسی سرگرمیوں سے بہت کم دلچسپی رکھتے ہیں۔ بالیا صاحب ایک عوامی خدمت گذار کی حیثیت سے بھی زیادہ مشہور ہیں وہ کانگریسی حکومت کے زمانے میں (۱۹۸۲ء) ایم ایل سی رہ چکے ہیں۔ ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۵ء میں ھڈا کے صدر نشین رہے۔ خاص طور پر پرانے شہر

کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں
ان دنوں سائوتھ زون حلقہ کی پیس اینڈ ویلفیر کمیٹی کے صدر نشین
ہیں جس کے جواں سال گراں خدمت گزار قابلِ ذکر غلام صادق الدین
جنرل سکریٹری ہیں۔ ایم بالیا کا ذریعہ تعلیم اُردو رہا۔ وہ اُردو زبان اور
اُردو شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے ہیں مشاعروں میں بڑے شوق
سے شرکت کرتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ انھیں صاف دل اور روشن دماغ
انسان پایا۔ جس زمانے میں وہ ایم ایل سی تھے اُس زمانے میں بھی انھوں
نے مسلمانوں کے لئے غیر معمولی کام کیئے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرنے
میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتے ہیں۔ کچھ برس پہلے تک پرانے شہر میں
مختلف اوقات میں فسادات ہوتے رہے۔ فسادات کو فرو کرنے
کے سلسلے میں بالیا صاحب نے اپنی جان کی پروا کیئے بغیر مسلمانوں
کی مدد کی۔ وہ مسلمانوں میں بے حد مقبول ہیں ان کی مقبولیت کا
یہ حال ہے کہ بعض اُن کے بے تکلف دوست انھیں شیخ بالیا کہتے
ہیں وہ بے خوف بے لاگ اور باحوصلہ انسان ہیں۔ ان کی سیاسی و
غیر سیاسی زندگی نہایت پاک و صاف ہے۔ سابق وزیر داخلہ حکومت
آندھرا پردیش نواب میر احمد علی خان کی حب الوطنی اور ان کی قیادت
سے بہت متاثر تھے۔ نواب میر احمد علی خان، بالیا صاحب کی بہت
قدر کرتے تھے جناب عابد علی خان، محبوب حسین جگر صاحب سے بھی
بالیا صاحب کے بہت اچھے مراسم تھے اخبار سیاست اُن کا پسندیدہ

اختیار ہے۔ پرانے شہر کے مسلم دوستوں میں غلام صادق الدین سے ان کے نہایت قریبی روابط ہیں۔ پرانے شہر کے اکثر نزاعی معاملات کو ختم کرنے کے لئے ہمیشہ بھر پور تعاون کیا کرتے ہیں۔ حیدرآباد میں اردو تحریک سے ہمیشہ جڑے رہے۔ اردو کے اُلجھے ہوئے مسائل کی یکسوئی کے سلسلے میں انھوں نے ہر زمانے میں حکومت سے نمائندگی کی۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے تھے اب بھی انہیں اردو زبان و تہذیب سے دلی لگاؤ ہے اردو کے جلسوں میں بڑے شوق سے شریک ہوتے ہیں بالیا صاحب ہر مسئلہ پر چاہے وہ سیاسی ہو کہ غیر سیاسی دو ٹوک انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔ انہیں شہر حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب سے دلی لگاؤ ہے ان کے دوستوں میں زیادہ تر مسلم حضرات ہی دکھائی دیتے ہیں۔ بہترین مقرر ہیں ہر موضوع پر گفتگو کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں ان کے مزاج میں انتہائی سادگی ہے تو طبیعت میں شگفتگی۔ بذلہ سنجی ان کے مزاج کا ایک اہم حصہ ہے بالیا صاحب جس محفل میں بھی ہوتے ہیں ساری محفل کو اپنی گفتگو سے زعفران زار بنا دیتے ہیں بالیا صاحب آداب محفل کا خاص خیال رکھتے ہیں حیدرآبادیت ان کے مزاج میں رچ بس گئی ہے۔ نہایت باوقار، معتبر اور پُر اثر شخصیت کے مالک ہیں بالیا صاحب نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ضرورتمند لوگوں کے لئے وقف کر دیا ہے انھوں نے ہر اُس شخص کی مدد کی جو مستحق

تھا۔ بالیا صاحب لسانی ہم آہنگی کے دلدادہ ہیں۔ اُردو بڑی روانی سے
بولتے ہیں ان کی تقریر اردو ہی میں ہوتی ہے چاہے وہ ادبی جلسے
ہوں کے عوامی وسیاسی جلسے ہوں حکومت کے سربراہوں سے ہمیشہ ان
کے اچھے مراسم رہے شہر کے ہر طبقہ کے لوگوں میں وہ گھل مل کر رہتے
ہیں ان کے ہاں چھوٹے بڑے کی کوئی قید نہیں ہے ہر وہ شخص جو
معاشرہ کے لئے روشنی کا پیغام دیتا ہے اس کی وہ دل وجان سے قدر
کرتے ہیں۔ بالیا صاحب سے میرے گہرے مراسم ہیں اگرچیکہ ان سے
میری ملاقات بہت کم کم ہوتی ہے لیکن جہاں کہیں بھی ان سے ملاقات
ہوتی ہے وہ نہایت گرم جوشی کے ساتھ ملتے ہیں ان کے ہونٹوں پہ
ہمیشہ مسکراہٹ رہتی ہے ادبی جلسوں سے انہیں کسی قدر لگاؤ ہے
میں ایک واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔ ۱۹۷۶ء میں میرے دوسرے
کلام زخموں کے گلاب کی رسم اجرا تقریب اعلیٰ پبلسٹی میرا اردو ہال میں
منعقد ہوئی تھی۔ بالیا صاحب بھی مدعوئین میں شامل تھے دوران جلسہ
اچانک برقی فیل ہوگئی۔ بالیا صاحب شہ نشین سے اٹھے انجمن کے
آفس گئے اور وہاں سے ۲۰ موم بتیاں لے آئے اور تمام بتیاں
روشن کیں۔ اس واقعہ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ بالیا صاحب جس
وقت ہڈا کے چیرمین تھے ان کا آفس حمایت نگر میں تھا ایک دن
مجھے انہوں نے ملاقات کے لئے فون کیا۔ ان دنوں وہ چاہتے تھے کہ
شاعروں کے لئے ہڈا کی جانب سے زمین الاٹ کی جائے۔ لیکن یہ

تجویز عمودیت گری کی منزل پر ہی ختم ہوگئی۔ بالیا صاحب پرانے شہر کی اکثر خصوص محفلوں میں خاص طور پر غلام صادق الدین کی جانب سے منعقدہ محفلوں میں ملاقات ہوتی رہتی ہے غلام صادق الدین پرانے شہر میں سال میں دو تین دفعہ بیسں کمیٹی کے خصوصی جلسوں میں اور مشاعرہ کا اہتمام کرتے ہیں مشاعرے کے سلسلے میں مجھ سے تعاون حاصل کرتے ہیں اور مجھے منتخب شاعروں کو شرکت کے لئے مدعو کیا کرتا تھا اس طرح کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حیدرآبادی تہذیب اور حیدرآباد کی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لئے بالیا صاحب تاحیات سرگرم عمل رہیں گے۔ بالیا صاحب کی فطرت ہی اعلیٰ تہذیبی روایات اور انسانی رشتوں کی طرفدار ہے۔ جب تک بالیا صاحب جیسے انسانیت کے علمبردار لوگ حیدرآباد میں رہیں گے۔ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب سرسبز و شاداب رہے گی۔

منظور ظفر

گولکنڈہ کا ہیرا۔ عوامی خدمت گزار

ہر اچھا معاشرہ ایسے ہی لوگوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے جو اپنی خوشیوں کے مقابلے میں دوسروں کے دُکھ درد میں زیادہ شریک رہا کرتے ہیں۔ خوشیوں اور مسرتوں کے ماحول میں تو بے شمار لوگ مل جائیں گے لیکن معاشرہ میں کم ہی ایسے لوگ ملتے ہیں جو دوسروں کی پریشانیوں اور مشکلات میں اُن کے آنسو پونچھنے والے ہوتے ہیں۔ ہمارا مشاہدہ ہی نہیں تجربہ بھی ہے کہ زیادہ تر لوگ اپنی ہی بہتری و بھلائی کی فکر میں رہتے ہیں۔ کسی کی درد بھری آواز کوئی سننا نہیں چاہتا۔ اس طرح کے بے حسی کے ماحول میں کچھ ایسے لوگ بھی نمودار ہوتے ہیں جن کا ایک ایک لمحہ جھونپڑیوں میں تلنے والا اور روشنی کا سرچشمہ ہوتا ہے جن کا وجود دیپ بے سہارا معاشرہ کے لئے مسیحائی کا کام کرتا ہے معاشرہ میں اس طرح کے نبض شناس انسانی رشتوں کی آبرو کی حفاظت میں لگے رہنے والے لوگ بیشتر اوقات میں حالات کی کشمکش سے گذرتے رہتے ہیں

اور ان کا کام بس یہی رہتا ہے کہ دوسروں کے لیئے کچھ اچھا کام کر جائیں۔
جب کبھی اس طرح کے ہمدرد، انسانیت پسند لوگوں کا ذکر ہوتا ہے تو
ان میں ایک اہم نام منظور ظفر کا بھی نظر آتا ہے جو گولکنڈہ کے ہیرے
کی طرح اپنی چمک کو باقی رکھے ہوئے ہیں منظور ظفر کو میں گولکنڈہ
کا ہیرا اسی لیئے کہتا ہوں کہ انہیں کسی بھی تاج میں لگا دیں وہ اپنی
چمک ضرور دیں گے چاہے وہ کوئی بھی رت ہو، کوئی بھی موسم ہو،
منظور ظفر کے کردار میں یکسانیت ملے گی۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ۔ فلاحی
ادبی، سیاسی و تہذیبی مصروفیات میں نہایت پاک و صاف آئینہ کی صورت
رہا کرتا ہے۔ ان کے کام میں شفافیت ہوتی ہے ان سے وابستہ تمام لوگ
ان کی آئینہ مثال شخصیت کا عکسِ جمیل ہوا کرتے ہیں۔ منظور صاحب
کو میں تقریباً ۴۰ برس سے جانتا ہوں۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب
نواب میر احمد علی خان صاحب ریاستی وزیر داخلہ تھے منظور ظفر اُس دور میں
جو اُن کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا گولکنڈہ کی سرزمین کو مختلف ادبی،
تہذیبی، ثقافتی، سیاسی و غیر سیاسی سرگرمیوں کو مثالی بنانے میں مصروف
رہا کرتے تھے۔ ان ۴۰ برس میں منظور ظفر گولکنڈہ کی سرزمین کے پہلے
شخص ہیں جو ان معاملات میں زیادہ متحرک، زیادہ کارکرد اور زیادہ
رواں دواں رہا کرتے ہیں۔ گولکنڈہ میں ایک زمانے میں مشاعروں
کی فضا اپنے ایک خاص انداز سے عروج پر تھی۔ گولکنڈہ کی ممتاز شخصیت
مولانا عبدالغنی کے گھر میں شاید میں نے پہلا مشاعرہ پڑھا تھا۔ دا عی مشاعرہ

منظور ظفر اور عثمان علی ضیاء تھے بہت ہی شاندار مشاعرہ ہوا تھا جس میں میرے سوا بہت سے شاعروں نے شرکت کی تھی۔ گولکنڈہ میں سب سے بڑا مشاعرہ ایک ایسے دور میں ہوا تھا جب شہر حیدرآباد میں مختلف مقامات پر اردو کے اہم جلسے ہوا کرتے تھے ـــــــ جس کا افتتاح نواب میر احمد علیخان میر اعظم نے کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں مسز سعید شہیدی، اوج یعقوبی، تجارت ندیم نے شرکت کی تھی۔ اس عظیم الشان مشاعرہ کے لئے میں نے "غزلوں کی رات" کا نام تجویز کیا تھا جو بہت مقبول ہوا۔ اس نام کی اتنی شہرت ہوئی کہ اس نام سے شہر میں بے شمار تہذیبی پروگرامس ہوتے رہے۔ محفل خواتین کی سالانہ تقریب کے موقع پر محفل موسیقی کے پروگرام کا نام غزلوں کی رات سے موسوم رہا کرتا ہے یہ نام میں نے گولکنڈہ کی غزلوں کی رات کے پس منظر میں دیا تھا ـــ اس مشاعرہ کے بعد گولکنڈہ میں کوئی اور بڑا مشاعرہ نہیں ہوا۔ منظور ظفر اس مشاعرہ کے روح رواں تھے جنھوں نے اپنے رفقاء کار عثمان علی ضیاء حبیب الدین وغیرہ کے تعاون سے منعقد کیا تھا۔ اس مشاعرے کے انعقاد کے سلسلے میں منظور ظفر کی پُر اثر شخصیت کا مجھے اندازہ ہوا۔ وہ اثر میرے دل و دماغ کا ایک اہم حصہ بن گیا ہے اس مشاعرہ کے بعد ہماری ملاقاتیں کم کم سہی مگر ہوتی رہیں۔ منظور ظفر صاحب کے زیر انتظام گولکنڈہ میں اگر کوئی بڑی تقریب ہوتی تو مشاعرہ کے سلسلے میں مجھ سے مشورہ ضرور کرتے ہیں۔ اور شاعروں کا انتخاب مجھ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ مجھے یہ بھی یاد

ہے کہ گولکنڈہ میں عظیم الشان پیمانے پر جلسہ رحمت اللعالمین کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے بڑے بڑے علماء کو مدعو کیا جاتا ہے جلسے کے دوران نعتیہ کلام سنانے کے لیے کچھ شعرا کو بھی مدعو کیا جاتا ہے میں نے اکثر جلسہ ہائے رحمت اللعالمین میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے گولکنڈہ میں آج بھی منظور ظفر کی شخصی دلچسپی سے ہر سال عالیشان پیمانے پر جلسہ رحمت اللعالمین کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ادھر کچھ برسوں سے گولکنڈہ قلعہ کے باب الداخلہ کے قریب بڑے پیمانے پر دسہرہ تقریب ہوتی ہے جس میں منظور ظفر بھائی کافی دلچسپی لیتے ہیں یہ تقریب حیدرآباد کی گنگا جمنی ماحول کی بہترین تقریب ہوتی ہے ہزاروں ہندو مسلمان اس تقریب میں شریک رہتے ہیں شہر کی نمائندہ سیاسی و غیر سیاسی شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا ہے کبھی کبھی مشاعرہ بھی منعقد کیا جاتا ہے جلسہ کے دوران ممتاز سیاسی و تہذیبی شخصیتوں کو ایوارڈ بھی دیئے جاتے ہیں مجھے بھی یہ اعزاز حاصل ہے کہ ایک جلسہ میں میری شاعرانہ خدمات کے سلسلے میں ایوارڈ دیا گیا تھا۔ شال اوڑھا کر ایک خوبصورت مومنٹو دیا گیا تھا۔ منظور ظفر صاحب کے مراسم عابد علی خان، محبوب حسین جگر، مخدوم محی الدین سے بھی بہت گہرے حاصل رہے ہیں خاص طور پر گولکنڈہ میں منعقد ہونے والے عوامی جلسوں اور دیگر تہذیبی محفلوں کے سلسلے میں عابد علی خان اور محبوب حسین جگر سے تعاون حاصل کرتے تھے اور بعض جلسوں میں مدعو بھی کیا کرتے تھے منظور ظفر ترقی پسند خیالات کے حامل ایک متحرک انسان ہیں۔ مخدوم

محی الدین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کو اپنا قائد مانتے ہیں عوام کی بھلائی کے
لئے ہمیشہ تعاون کرتے ہیں سماجی مصروفیات میں ہمیشہ پیش پیش رہتے
ہیں گولکنڈہ کے بہت سے مسائل جو حکومت کی توجہ چاہتے تھے حکومت
کے ذمہ داران کو مسلسل توجہ دلا کر اپنی کوششوں میں کامیاب رہتے ہیں
۲۳ برس پہلے جس جوش و خروش سے کام کرتے تھے آج بھی اُن میں
وہ توانائی برقرار ہے منظور صاحب نہ تو ادیب ہیں نہ ہی شاعر
لیکن ان کا ادبی ذوق نکھرا ستھرا ہے اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے
گولکنڈہ کے نوجوان شاعروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں گولکنڈہ کے ایک
استاد شاعر [illegible] الدین صاحب کے بے حد قدر دان تھے ان کی شاعرانہ عظمتوں
کا احترام کرتے تھے اس وقت بھی گولکنڈہ میں بعض نوجوان شعراء
ایسے ہیں جن کا مستقبل روشن دکھائی دیتا ہے گولکنڈہ میں ادبی سرگرمیاں
جاری ہیں جو ایک خوش آئند بات ہے منظور صاحب نہایت قابل
بھروسہ، دیانت دار، فرض شناس اور اخلاقی رشتوں سے بے انتہا
لگاؤ رکھنے والے انسان ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان کی اعلا صلاحیتوں
کو بڑے بڑے لوگوں نے تسلیم کیا ہے چاہے وہ حکومتی سطح کے لوگ
ہوں کہ سوسائٹی کے ذمہ دار لوگ ہوں۔ منظور صاحب اُن سے اپنا
رشتہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ معاشرہ کی بہتری کے لئے تہذیبی اقدار کے
تحفظ کے لئے منظور صاحب کا تعاون ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ منظور صاحب
بنیادی طور پر ترقی پسند خیالات کے حامل ہیں لیکن وہ ایک بہترین انسان

اسی طرح تمام مکتب خیال کے لوگوں سے اپنا گہرا رشتہ رکھتے ہیں کسی بھی سیاسی پارٹی سے وابستہ لوگ کیوں نہ ہوں ان سے مراسم رکھتے ہیں ان لوگوں سے تعاون کرتے ہیں جہاں وہ کمیونسٹ قائدین سے اپنا رشتہ رکھتے ہیں وہیں مجلس اتحاد المسلمین، کانگریس پارٹی اور دیگر سیاسی جماعتوں کے سربراہوں سے بھی رشتہ رکھتے ہیں۔ ان میں اتنا سلیقہ ہے کہ ہر اس شخص سے کام لیا جاتے ہیں جو معاشرہ کی بہتری کے لئے تعاون کرتے ہیں۔ منظور ظفر یار باش انسان ہیں ان کے دوستوں کا بہت بڑا حلقہ ہے گولکنڈہ میں یقیناً بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جو اپنی خدمات کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں لیکن جہاں تک میری اپنی معلومات ہیں ان ۴۰ برسوں میں گولکنڈہ کی صرف ایک ہی شخصیت سے زیادہ متاثر ہوں جو با وقار، متحرک، فعال، با کردار شخص ہے اور وہ شخص منظور ظفر ہے۔ منظور ظفر صاحب سے اب بھی میری ملاقات کہیں نہ کہیں ہو ہی جاتی ہے جب بھی ملاقات ہوتی ہے ان سے مل کر خوشی ہوتی ہے۔ میں نے اکثر دفعہ کہا ہے کہ منظور صاحب گولکنڈہ کے بے تاج بادشاہ ہیں میری نظروں میں قابلِ احترام ہیں۔

منظور ظفر صاحب گولکنڈہ کے عوام میں بے حد مقبول ہیں ان کی یہ مقبولیت صرف مسلم معاشرہ کی حد تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ہر طبقہ میں ان کی مقبولیت یکساں ہے ایسے لوگ جو معاشرہ کی بھلائی کے لئے سرگرم عمل رہا کرتے ہیں میری نظر میں وہ قابلِ احترام ہیں ان

نام اور ان کے کام سے مجھے بے حد مسرت ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ منظور صاحب جیسے لوگوں کے لئے ہر موسم سازگار رہے۔ چونکہ منظور پاک و صاف دل رکھتے ہیں اس لئے ان کی خوشبو تمام معاشرہ کو مہکاتی رہتی ہے۔ منظور صاحب کو یوں تو شہر کی بہت سی انجمنوں اداروں کی جانب سے عزت افزائی کی گئی ہے لیکن اُن کے فلاحی و ادبی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں اُجالوں کے مسافر کے زیر عنوان ادارہ میرا شہر میرے لوگ کے زیر اہتمام خوشگوار فضاء میں ۱۹۹۸ء کو مولانا ابوالکلام انسٹیٹوٹ میں شاندار پیمانے پر تقریب منعقد کی گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ ادبی محفلوں کی جانب سے وہ پہلا جلسہ تھا جو ان کی خدمت کے اعتراف میں منعقد کیا گیا تھا۔ منظور صاحب کے چاہنے والوں کی ایک کثیر تعداد نے اس تہنیتی جلسے میں شرکت کی تھی۔ اس تقریب کے انعقاد کے سلسلے میں سب سے زیادہ خوش ہونے والے ان کے عزیز ترین دوست غلام صادق الدین تھے۔

غلام صادق الدین

انسانی رشتوں کے طرفدار۔ با مروّت انسان ہمدرد شخصیت

یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے کے لئے ناگزیر ہو اور وہ دوسروں کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے سرگرداں رہے لیکن معاشرہ کی بنتی بگڑتی شکلوں پر نظر رکھنے والے ایسے لوگ بھی ہماری نظروں میں رہتے ہیں جنھیں ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس طرح کے ذمہ دار لوگ اپنے ہونے کا پورا احساس دلاتے ہوئے ہماری آنکھوں کے سامنے بار بار جلوہ گر رہا کرتے ہیں۔ ہر ایک کے دکھ درد، غم، خوشی و مسرت میں شریک رہتے ہیں۔ انسانی رشتوں کو مسرت سے محسوس کرنے والے اگر تھوڑے سے بہت لوگ بھی مل جائیں تو اچھا اور بگڑا ہوا ماحول سدھر سکتا ہے کتنے ایسے لوگ ہیں جو کسی کی آہ دیکھتے ہی اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر اس کی مدد کے لئے پہنچ جاتے ہیں۔ ہمارے سماج میں اس طرح کے ہمدرد خبرگیری

رکھنے والے ہمدرد لوگ کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفت
سے لوگ معاشرہ کا ایک ناگزیر حصہ بن چکے ہیں لیکن ان
ہی میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں ہم خلوص و ہمدردی کے حوالوں
میں ان کی بہترین کارکردگی کے سبب یاد کرتے ہیں اس طرح کے عوامی
خدمت گزاروں میں غلام صادق الدین بھی ہیں غلام صادق الدین
نہ صرف عوامی خدمات سے متعلق کاموں سے ہی منسلک رہے ہیں
بلکہ اردو کی بقاء اور اس کے تحفظ کے لئے بھی کئی برسوں سے سرگرم
عمل ہیں۔ ہمیں ایسے لوگوں کی دل و جان سے قدر کرنی چاہیئے جو
اپنی زبان اور اپنی تہذیب سے والہانہ وابستگی رکھتے ہیں۔
غلام صادق الدین کو میں اردو تحریک سے ان کی وابستگی کے حوالے
سے تقریباً دس برسوں سے جانتا ہوں جبکہ انہیں نواب میر احمد علی
خان صاحب سابق چیرمین انجمن ترقی اردو اور وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش کی
[illegible] سرپرستی حاصل تھی انھوں نے اپنی بے پناہ محبت، ہمدردی
اور انسانی و تہذیبی رشتوں کو استحکام بخشا۔ نواب میر احمد علی خان
صاحب غلام صادق الدین کی سماجی اور اردو خدمات سے بے حد
متاثر تھے۔ اپنے شہر میں اردو گھر کے قیام کے سلسلے میں بھی غلام
صادق الدین کو ان کی [illegible] کے سلسلے میں ہمیشہ مقبول رہے۔ شہر
کے شیدائیان اردو کی تحریک یادگار بنانے کے شہر میں خلوت مبارک
میں ایک بڑا اردو کا جلسہ ہوا تھا۔ ان کا تقرر کے انعقاد کے

ذمہ داری مجھے سونپ دیا کرتے ہیں۔ غلام صادق الدین کی قیادت
ہیں اور ان کے تعاون سے شہر کے بے شمار لوگوں کو مختلف شعبوں
میں فائدہ پہونچ چکا ہے۔ گذشتہ ۱۵ برسوں سے پلیس کمیٹی کے
قیام کے بعد سے ان کے فلاحی کاموں کا ایک طویل سلسلہ جاری رہا ہے
خاص طور پر پرانے شہر کے ہر قسم کے سماجی مسائل کے لئے حکومت
کے ذمہ داران سے ربط رکھتے ہیں اور مستحق لوگوں کی مدد کرنے میں
پیش رہتے ہیں پرانا شہر کچھ برسوں پہلے تک فرقہ وارانہ فسادات
کی شہرت رکھتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ ماحول ختم ہوتا گیا جس میں
کے تعاون کے علاوہ پلیس کمیٹی کے ارکان کا بھی کافی دخل رہا ہے
یہاں پلیس کمیٹی کے بہت سے لوگ سرگرم عمل ہیں۔ لیکن
ان لوگوں کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں بالیا صاحب
کے نام کے لئے جو عوام سے اور محبان اردو سے تعلق رکھتے ہے
پیش رہتے ہیں۔ غلام صادق الدین ایک ایسے لوث حرکیاتی
شخصیت کے مالک ہیں ہر روز نہ جانے کتنے ضرورت مند لوگوں
کی خدمات انجام دیتے ہوں گے بعض اپنے ہم خیال احباب کو انھوں نے
ان کی صلاحیت کی بنیاد پر فلاحی کاموں سے وابستہ کر لیا ہے۔ ادھر
برسوں سے غلام صادق الدین کے حوالے سے ایک نوجوان عابد
علی الدین (مخدوم برادرس) کی فلاحی مصروفیات بھی توجہ کا مرکز بن
گئے ہیں جو غلام صادق الدین کے بہت ہی قریب دوستوں میں شامل ہیں

ان کے بعض ایسے ساتھی بھی ہیں جنھیں ان کی بہت زیادہ سرپرستی حاصل رہی، معاشرہ میں اپنا مقام بنا چکے ہیں۔ غلام صادق الدین ایک نیک دل، پاک طینت، ہمدرد، مخلص اور بے لوث عوامی خدمت گذار ہیں پیس کمیٹی کے توسط سے انھوں نے اپنی خدمات کے سلسلے میں حکومت کے سربراہوں، خاص طور پر پولیس کے عہدہ داروں کی نظر میں اپنا ایک منفرد مقام بنا لیا ہے۔ غلام صادق الدین کی ہر ایک جائز سفارش کی پزیرائی کے لئے عہدہ داران پولیس نے ان کا ساتھ دیا۔ نواب میر احمد علی خان صاحب، غلام صادق الدین کو بہت چاہتے تھے ان کے کام کی قدر کرتے تھے۔ غلام صادق الدین نے بھی نواب میر احمد علی خان صاحب کی عزت و توقیر میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اکثر ادبی جلسوں میں نواب صاحب کے ساتھ رہتے تھے محترم عابد علی خان صاحب اور محترم محبوب حسین جگر صاحب بھی غلام صادق الدین کی اردو خدمات کے معترف تھے خاص طور پر اپنے شہر کے مسائل اور اردو مسائل کے سلسلے میں ان سے تعاون حاصل کرتے تھے سیاست اخبار سے ان کا قدیم رشتہ ہے اخبار سیاست سے انھیں دلی ربط ہے سیاست کی بہتری کے لئے پُر خلوص جذبہ رکھتے ہیں جناب زاہد علی خان بھی غلام صادق الدین صاحب کی فلاحی اور اردو کاز کے لئے کئے جانے والے کاموں کی قدر کرتے ہیں غلام صادق الدین کو اردو شاعری سے بے حد لگاؤ ہے۔ حیدرآباد کے گنگا جمنی ماحول کو باقی رکھنے اور اس کی

بڑھاوا دینے کے سلسلے میں ایسے لوگ ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ میرے ہم خیال تمام شعراء بھی غلام صادق الدین صاحب کے جدید نثر بنگالی کے دل و جان سے قائل ہیں۔ غلام صادق الدین بہترین مفکر بھی ہیں جو ہر مسئلہ پر جامع اور کھل کر تقریر کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں ان کی تقریر اس لئے بھی دلچسپ اور پُراثر ہوتی ہے کہ وہ سچی بات کہتے ہیں اور بے خوف و خطر کہتے ہیں۔ ان کی گفتگو اور ان کے رویے میں یکسانیت ہے۔ منافقت سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ جو باتیں حقائق پر مبنی ہوتی ہیں ان کے اظہار میں قطعی تامل نہیں کرتے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ غلام صادق الدین جیسے محبانِ اُردو اور انسانیت دوستوں کے سبب ہی ہمارے شہر کی اعلیٰ روایات کی برقراری میں بڑی مدد مل رہی ہے۔ ایسے لوگ جو اپنے لئے کم اور دوسروں کے لئے زیادہ وقت دیتے ہیں وہ ہمیشہ مطمئن زندگی گذارتے ہیں۔ ایک سال پہلے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے شایانِ شان پیمانے پر مدینہ ایجوکیشنل سنٹر ہال میں ان کی عوامی و فلاحی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں عظیم الشان پیمانے پر جلسہ ہوا۔ انہیں سکوں میں تولا گیا۔

میری دعا ہے کہ خدا ان کے مراتب میں اور اضافہ کرے۔

خواجہ معین الدین

(باصلاحیت آفیسر۔ خوش نصیب انسان)

پروردگار عالم جن لوگوں کو بھی دنیاوی آسائشوں سے نوازنا چاہتا ہے تو اُن کی نوازشوں کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ آرائیوں کی حد سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔ وہ لوگ جن پر یہ کرم برستا ہے اُن کا وجود بذات خود ایک مینارہ نور کی طرح معاشرے ماحول کو اپنی برکتوں سے سرفراز کرتا رہتا ہے۔ خدا کے خاص بندے دوسروں کی بھلائی اور ان کی زندگی کو سنوارنے کے لیے وہ سب کچھ کر جاتے ہیں جو اُن کے بس میں رہتا ہے۔ ذاتی اشرافیت، محنت، شفافیت، ایمانداری اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے والے لوگ ہمارے معاشرہ میں مل تو جاتے ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی سوچ اور فکر کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں تقسیم کرتے رہیں۔

انسانی شرافت و رواداری ہر مناسب مقام پر اپنا اثر چھوڑ جاتی ہے اچھا انسان دوسروں کی بہتری کے لیے سوچتا رہتا ہے۔ اس طرح کی مختلف النوع خوبیوں کی حامل شخصیت خواجہ معین الدین صاحب کی بھی ہے۔ آج شہر کا تقریباً ہر مہذب شہری جو حیدرآبادی تہذیب سے جڑا ہوا ہے وہ خواجہ معین الدین صاحب سے واقف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ انہوں نے چیف منسٹر حکومت آندھرا پردیش جناب ٹی انجیا کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے کس قدر نمایاں خدمات انجام دیں معین صاحب نہ صرف سیاسی معاملات کی سرخ روئی کے لیے ہی کارآمد ثابت ہوئے بلکہ ضرورت مند حیدرآبادیوں کا بھی ہر مشکل مقام پر ساتھ دیا اور ان کے جائز مسائل کو کامیابی و کامرانی کی منزلوں تک پہونچایا۔ یہ بات شہرت رکھتی ہے کہ خواجہ معین الدین صاحب انتہائی با اعتماد عہدہ دار بہترین دوست اور اچھے مشیر کی حیثیت سے چیف منسٹر صاحب کے معاون رہے۔ انجیا صاحب کے سارے فیصلے معین صاحب کی صلاحیت رہے کا نتیجہ ہوا کرتے تھے۔ خواجہ معین الدین صاحب ۱۹۵۴ء سے ترقی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اسسٹنٹ سکریٹری محکمہ ٹرانسپورٹ کے عہدہ پر فائز رہے۔ جب میرا تقرر بہ حیثیت ایل۔ ڈی سی۔ ڈائرکٹوریٹ کمیونٹی پروجکٹ ڈپارٹمنٹ میں ہوا تو خواجہ معین الدین صاحب وہاں ٹائپسٹ کی حیثیت سے کارگذار تھے۔ کمیونٹی پروجکٹ آفس میں خواجہ بہاءالدین، خواجہ معین الدین، علیم الدین، ظلے نواز خان، بی این داگھر

نرسمہاریڈی، افضل حسین اور صلاح الدین نیئر ہم خیال ساتھی ہی نہیں تھے بلکہ آپس میں بہترین دوست بھی تھے۔ معین صاحب ہم سب میں نسبتاً سینیر تھے۔ جب ہمارا محکمہ لسانی بنیاد پر ریاستوں کی تقسیم کے بعد ۱۹۵۶ء میں پلاننگ ڈپارٹمنٹ (سکریٹریٹ) میں ضم ہوگیا تو ہم سب ساتھ ساتھ رہے۔ پلاننگ ڈپارٹمنٹ سے وابستگی کے بعد خواجہ معین الدین ٹائپسٹ سے اسٹینوگرافر بن گئے۔ خواجہ بہاء الدین، علیم الدین اور میرے دیگر ساتھیوں کو یو۔ ڈی۔ سی (یعنی اسٹنٹ سکشن آفیسر) کے عہدہ پر ترقی ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد معین صاحب مسٹر ٹی انجیا چیف منسٹر کے پی اے بن گئے۔ معین صاحب کی ترقی کا آغاز اسی زمانے سے ہونے لگا۔ جب ٹی انجیا ایم پی، مرکزی حکومت میں لیبر منسٹر ہوئے تو انہوں نے خواجہ معین الدین صاحب کو پی اے بنا کر اپنے ساتھ ہی رکھا۔ جب انجیا صاحب کی مرکز میں وزارت ختم ہوئی تو وہ ریاست آندھرا پردیش کے چیف منسٹر بنے۔ یہاں بھی معین صاحب انجیا صاحب کے پی ایس رہے۔ جب انجیا صاحب کی چیف منسٹری ختم ہوئی تو معین صاحب ٹرانسپورٹ ڈپارٹمنٹ میں اسٹنٹ سکریٹری کی حیثیت سے کارگذار رہے۔ پھر وہ ڈپٹی سکریٹری ہوئے اور ستمبر ۱۹۹۳ء میں بہ حیثیت جوائنٹ سکریٹری محکمہ ٹرانسپورٹ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ معین صاحب نے سکریٹریٹ کی ملازمت کے دوران بے شمار لوگوں کی مدد کی ــــــ انہوں نے "سٹاد لٹ" میں

بھی بے شمار مستحق افراد کے ساتھ تعاون کیا جبکہ وہ چیرمین ٹرسٹ ان تھے ان دنوں وہ مکرم جاہ ٹرسٹ میں سکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ خواجہ معین الدین اور ہم تمام ساتھی اپنی ابتدائی ملازمت کے زمانے میں بہت سے تہذیبی پروگرام سے دلچسپی رکھتے تھے خواجہ معین الدین کی شادی کی تقریب بہت شاندار پیمانے پر ہوئی۔ ان کے والد محترم محمد یسین صاحب گورنمنٹ اسکول میں صدر مدرس تھے جو تا دم زیست نیکی و شرافت کی روشن مثال رہے۔ نہایت پُر وقار، وضع دار، حیدرآبادی تہذیب کی نمائندہ شخصیت تھے۔ معین صاحب کا مکان محلہ عثمان شاہی میں واقع تھا۔ اسی مکان سے خواجہ معین الدین صاحب کی شادی کی برات نکلی تھی۔ ان کے خسر محترم سلیم سلطان شہر کی ممتاز شخصیت تھے جن کے والد محترم محمد سلطان صاحب بانی وزیر سلطان ٹوباکو (V.S.T.) تھے۔ معین صاحب نے اپنی ملازمت کے زمانے میں اپنے تمام بھائیوں، بہنوں کی بہتری اور ان کی کامیاب زندگی کے لیے بہت کچھ کیا۔ آج وہ تمام کے تمام خوشحال اور مطمئن زندگی گذار رہے ہیں۔ میں نے خواجہ معین الدین کی شادی کے موقع پر ایک تہنیتی نظم (سہرا) لکھی تھی۔ اُس نظم کا ایک شعر آج بھی یاد ہے جس کو خواجہ بہاء الدین جب بھی اچھے موڈ میں رہتے ہیں تو دہراتے رہتے ہیں۔

وہاں کھولی گئی ہے زلف شاید
تبھی خوشبو یہاں تک آرہی ہے

وہ زمانہ بہت اچھا زمانہ تھا ہم تمام دوست آج بھی نہ صرف بہترین دوستوں کی طرح ملتے ہیں بلکہ بھائیوں جیسا ہمارا آپسی رشتہ ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں نسبتاً خواجہ بہاءالدین، خواجہ معین الدین کے بہت قریبی دوست ہیں۔ خواجہ معین الدین غیر معمولی خوبیوں کے مالک ہیں جب وہ بیرسٹر کے پی ایس تھے تو انھوں نے علیم الدین سکشن آفیسر کو بہ حیثیت امپلا یمنٹ آفیسر تعینات کروایا۔ جب وہ چیف منسٹر صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری تھے تو اپنے آفس کے دوستوں پی۔ ایں واگھرے اور شرسیہار ریڈی (سکشن آفیسر) کو اپنے ساتھ چیف منسٹر صاحب کی پیشی میں رکھا۔ یہ دونوں محکمہ تنقیحات راج ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ معین صاحب نے اپنے ساتھیوں کی ہر ممکنہ مدد کی۔ اپنے دوستوں کی ہر جائز و کامیاب سفارش کی۔ خواجہ معین الدین سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن سے بھی وابستہ رہے لیکن وہ اپنی سرکاری مصروفیات کی وجہ سے ہماری محفلوں میں بہت کم شریک ہوتے تھے۔ لیکن انھوں نے اپنا اخلاقی رشتہ اسوسی ایشن سے برقرار رکھا۔ معین صاحب کے دوستوں کا بہت بڑا حلقہ ہے۔ ہر قسم کے لوگ چاہے وہ سیاسی ہوں کہ غیر سیاسی

اُن سے دوستانہ مراسم رکھتے ہیں۔ معین صاحب نے اپنی اہم سرکاری پوزیشن کے باوجود اپنی طبیعت کی انکساری میں فرق آنے نہیں دیا۔ ابتدائی ملازمت کے زمانے کے دوستوں سے خاص طور پر اپنا تہذیبی و شریفانہ رشتہ برقرار رکھا ہے۔ خواجہ معین الدین نہایت قابل و لائق انسان ہیں۔ معین صاحب کی شرافت کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے انجیا صاحب کی چیف منسٹری ختم ہونے کے بعد بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان کے گھریلو اور نجی کاروبار میں ان کے سارے خاندان کے ساتھ تعاون کرتے رہے انجیا صاحب کے انتقال کے بعد بھی معین صاحب نے اُس خاندان سے اپنا تعلق خاطر برقرار رکھا۔ چاہے وہ لیبر منسٹری کا دور ہو کہ چیف منسٹری کا دور ہو، انجیا صاحب خواجہ معین الدین کی ہر بات مانتے تھے اور ان کی ہر جائز سفارش کی پذیرائی کرتے تھے انجیا صاحب کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے معین صاحب نے اردو زبان و اردو تعلیم کے مسائل کے سلسلہ میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ انجیا صاحب کے زمانے میں ممتاز شاعر اوج یعقوبی صاحب کو ملک الشعراء کے اعزاز سے نوازا گیا ۔ ہندی اکیڈیمی قائم کی گئی۔ اس کے علاوہ بہت سے تعلیمی و فلاحی کام انجیا صاحب کے دور میں انجام پائے۔ معین صاحب اُن اعلیٰ افسروں میں سے ایک رہے جن کا دامن ہمیشہ پاک و صاف رہا۔ ساری

ملازمت کے دوران وہ مستحق لوگوں کی دعائیں لیتے رہے۔ نہایت شریف النفس، سادگی پسند، بامروت، اعلیٰ صفات رکھنے والے انسان ہیں جن سے مل کر ہر ملاقاتی خوشی محسوس کرتا ہے۔ معین صاحب کی گھر کی ہر تقریب میں اُن کے قدیم دوست لازماً مدعو رہتے ہیں ان کے گھر کی مختلف تقاریب کے سلسلے میں اُن کی خواہش پر میں نے کئی اشعار لکھے ہیں۔ معین صاحب کا سارا گھرانہ تعلیم یافتہ ہے۔ ان کے ۴ بیٹے ہیں اور ایک بیٹی ہے۔ بڑا بیٹا محمد نظام الدین ڈاکٹر ہے جو امریکہ میں مقیم ہے۔ دوسرا اور تیسرا بیٹا انجینیر ہے یہ دونوں بھی امریکہ میں رہتے ہیں۔ چوتھا بیٹا جدہ میں ہے۔ ان کی بیٹی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ خواجہ معین الدین، دنیا کی ساری نعمتوں سے فیض یاب ہو چکے ہیں۔ فیض یابی کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

میں ان دوستوں کو خاص طور پر یاد رکھتا ہوں جو اپنی ابتدائی زندگی اور دوستی کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے مخلص دوستی کی خوشبو سے اپنے دل و دماغ کو مہکاتے رہتے ہیں۔ خواجہ معین الدین میرے ایسے ہی دوست ہیں جن سے مل کر دل و دماغ میں مسرت و انبساط کی لہر دوڑ جاتی ہے اور ان کا مسکراتا ہوا چہرہ میری بینائی بڑھاتا ہے۔

خواجہ معین الدین (ایپلا)

(منکسر المزاج۔ خاموش طبع انسان)

حیدرآباد کے بقید حیات شرفاء کی جب بھی فہرست مرتب کی جائے گی تو اُس فہرست میں خواجہ معین الدین صاحب (ایپلا) کا نام بھی نمایاں رہے گا۔ ہمارے معاشرہ میں بہت سے ایسے لوگ بھی ملیں گے جو دوسروں کے حالات جاننے اور ان کی روزمرہ کی مصروفیات سے دلچسپی رکھتے ملیں گے۔ اسی سوسائٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہیں دوسروں کے معاملات سے انہیں کسی قسم کی دلچسپی نہیں رہتی۔ خواجہ معین الدین صاحب کو میں گذشتہ تین دہوں سے جانتا ہوں۔ میں نے انہیں ہمیشہ کھرا ستھرا پاک صاف اور شائستگی کا مظہر انسان پایا ہے۔ خواجہ معین الدین کی ملازمت کا تعلق نظامت زراعت سے تھا جہاں وہ منتظم کی حیثیت سے خوشگوار ماحول میں کارگذار تھے۔ سابق وزیر داخلہ حکومت آندھرا پردیش

کا شاعری کے دلدادہ ہیں۔ ان کے ہاں نامور شاعروں کی غزل کے کیسٹس کے
علاوہ ممتاز گلوکاروں کے کیسٹس بھی موجود ہیں ہر نئی کتاب کے وہ منگاتے
رہتے ہیں مجھ سے میری اور میرے دوستوں کی کتابوں کے لیے فرمائش کرتے
رہتے ہیں خواجہ صاحب کے دل میں میری بڑی وقعت ہے اکثر ملاقاتوں
میں میری شعری و ادبی سرگرمیوں کا دل کھول کر تذکرہ کرتے ہیں خواجہ صاحب
کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک بریف کیس رہتا ہے۔ عابد علی خان صاحب اور
جگر صاحب جب تک زندہ تھے خواجہ صاحب دفتر سیاست زیادہ آتے
تھے اب بھی وہ آتے ہیں لیکن بہت کم۔ زاہد علی خان صاحب بھی خواجہ
صاحب سے خلوص رکھتے ہیں زاہد علی خان صاحب کے گھر کے تمام افراد
خواجہ صاحب کی عزت کرتے ہیں خواجہ صاحب نے عابد منزل سے اپنی
دیرینہ رفاقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سابقہ روایت کو باقی رکھا ہے زاہد
علی خان صاحب کے گھر میں ہونے والی نجی محفلوں میں بھی خواجہ صاحب مدعو
رہتے ہیں ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں کے سلسلے میں خواجہ صاحب کا تعاون
حاصل رہتا ہے مہمان شعراء کے خیر مقدم کے لیے وہ ریلوے اسٹیشن پہنچ
جاتے ہیں شعراء کی میزبانی میں بھی پیش پیش رہتے ہیں ملک بھر کے شعراء سے
خواجہ صاحب کے مراسم ہیں۔ بیکل اتساہی سے انہیں گہری وابستگی ہے
جب تک مہمان شعراء حیدرآباد میں رہتے ہیں خواجہ صاحب ان سے ہر
ممکنہ تعاون کرتے ہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرہ کی فائیل میرے پاس رہتی
ہے اس لیے وہ مجھ سے مشاعرہ کے دوران ربط رکھتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتے

ہیں کہ کونسا شاعر کب آئے گا اور اس کی واپسی کب ہوگی؟ میرے یہاں ساری تفصیل رہتی تھی وہ نوٹ کر لیا کرتے تھے مہمان شعرا کے آمد و رفت کی تفصیل جاننے کے بعد اُن کے قیام اور اُن کی واپسی کی ذمہ داری کو بھی سلیقے سے سنبھالتے رہے۔ بعض مہمان شعرا کی ناز برداریاں بھی سہہ لیتے تھے مگر اف نہ کرتے تھے۔ خواجہ صاحب نہایت سنجیدہ اور صاف دل انسان ہیں انتظامات مشاعرہ میں اگر کوئی الجھن ہوتی تو وہ عمدگی کے ساتھ نپٹا لیتے۔ مہمان شعرا کی آمد پر یہ ریلوے اسٹیشن چلا جاتا اُن کے آنے کے بعد کوئی خاص مسئلہ ہو تو اُن سے مل لیتا۔ جس زمانے میں جناب عابد علی خان صاحب شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعروں کے نگراں رہتے تو خواجہ صاحب مہمان شعرا کی آمد و رفت کے سلسلے میں معاون رہتے تھے۔ خواجہ صاحب شہر کی تقریباً اہم ادبی جلسوں و مشاعروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے پاس ادبی ٹرسٹ اور شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعروں میں شرکت کرنے والے بیشتر شاعروں کے خطوط موجود ہیں خواجہ صاحب کی میزبانی سے متاثر ہو کر مہمان شعرا انہیں خطوط لکھا کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب جیسے وضعدار لوگ جو حیدرآباد کی پرانی تہذیب و اقدار کی پاسداری کرتے ہیں کم رہ گئے ہیں لیکن جتنے بھی رہ گئے ہیں اُن کی قدر کی جانی چاہیے۔ خواجہ صاحب کو میں سیاست سے ان کے جذباتی لگاؤ کی وجہ سے بھی پسند کرتا ہوں ایک شریف آدمی ہمیشہ اپنے کرم فرماؤں کو یاد کرتا ہے۔ خواجہ صاحب بھی ان لوگوں میں سے ایک ہیں جو اپنے محسنوں کو دل و جان سے یاد کرتے ہیں۔ جب کبھی مجھ سے خواجہ صاحب

کی ملاقات ہوتی ہے بے ساختہ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب کی
یاد آجاتی ہے اور میں اپنے اُن دو محترم شخصیتوں کی یاد میں کافی دیر
تک کھو جاتا ہوں۔ خواجہ صاحب ہماری تہذیبی رشتوں کا ایک تسلسل
ہیں۔ جن کی عزت کی جاتی رہے گی —

جی۔ ایم خان

(تہذیبی رشتوں کے پاسدار، بااخلاق و بامروت شخصیت)

انسانی اور تہذیبی رشتوں کی پاسداری کرنے والے لوگ جب اپنی عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی ہر حرکت ان کے اعلیٰ و ارفع اسلاف کے بہترین کردار کا اعلیٰ نمونہ ہے اس طرح کے لوگ جب اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کرتے ہیں تو ان کے راستوں کے تمام پیچ و خم، حالات کی سرد و گرم دھوپ، چھاؤں کی تمازت اور ٹھنڈک ان کے ہم رکاب ہوتی ہے اور وہ نسیم صبح کی بھینی بھینی خوشبو کی طرح اپنے دل و دماغ کو تر و تازگی بخشتے ہوئے فرحت آگیں ہی نہیں کیف آور لمحات سے بھی مانوس ہو جاتے ہیں اور ان کا ہر عمل ان کے بہترین مستقبل کی نشاندہی کرتا رہتا ہے۔ فکر و نظر کی پابندگی، ذہن و خیال کی تازگی فہم و ادراک کے تمام دروازے کھول دیتی ہے اور معاشرہ کے بہترین نوازشا

آس پاس کے ماحول کو چمکاتے رہتے ہیں۔ زندگی میں کچھ بننے اور کچھ کر دکھانے
کی ذہن میں لہریں سارے جسم میں خون کی روانی کی طرح اپنا اثر چھوڑتی چلی جاتی ہیں
اس طرح کی کیفیات سے گزرنے والا انسان زندگی کے ہر مرحلہ پر کامرانی و
کامیابی کے ساتھ رواں دواں رہتے ہوئے کھلے آسمان تلے راحت کی سانس
لیتا ہے۔ اس بات کا بھی احساس ہوتا ہے کہ زندگی رکنے کا نہیں چلتے
رہنے کا نام ہے۔ ایک ترقی پذیر شخص اپنے پر پرواز کی طاقت کو سمیٹے
ہوئے اونچی اڑان بھرنے لگتا ہے۔ آسمان کی بلندیوں تک پہنچنے کا
آرزومند رہتا ہے۔ جو شخص اپنی عملی زندگی کا حوصلہ مسافر بن کر اس کے
قدم حالات چاہے کسی بھی طرح کے ہوں رکتے نہیں۔ وہ خوب سے خوب تر
کی تلاش میں برابر سرگرم عمل رہتا ہے۔ اسی طرح کے مجموعی تاثرات سے
فیض یاب کامیاب و کامران زندگی گزارنے والی شخصیت غلام محمد خان
کی بھی ہے جو دل و دماغ پر چھائے ہوئے دوستوں میں سے ایک ہیں
جنھیں میں اردو فیسٹول (جشن اردو) ۶۰-۱۹۵۹ء کے حوالے سے اپنے
ذہن و فکر کے جھومتے اور لہراتے ہوئے گوشوں میں پاتا ہوں۔ اور ان میں
اپنے میں ذاتی و خاندانی شرافت کی خوشبو سے معطر رہنے والے با اخلاق
و با مروت نفیس انسان کی مہک آج بھی محسوس کر رہا ہوں۔ جی۔ ایم
خان کو میں نے پہلی دفعہ شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کے کمرے نمبر ۵ کے قریب
دیکھا تھا ان کے مشترکہ دوست احمد اللہ قادری، صفی اللہ قادری
نصیر الدین اور کچھ اور طلباء ان کے ساتھ تھے۔ میں اس وقت کسی ادبی

تقریب میں شرکت کے لیے جامعہ عثمانیہ آیا تھا۔ جی۔ ایم۔ خان سے میری ملاقات اُس دور ۶۰-۱۹۵۹ء میں مختلف کالجوں اور جامعہ عثمانیہ کے ادبی جلسوں اور مشاعروں کے علاوہ اُردو ہال ادارۂ ادبیات اُردو میں ہونے والے مشاعروں کے موقع پر ہوا کرتی تھی۔ انہیں میں نے کبھی تنہا نہیں دیکھا وہ اپنے احباب صفی اللہ قادری، احمد اللہ قادری اور دیگر طلباء کے ساتھ رہتے تھے مشاعروں سے لطف اندوز ہوتے تھے اور قریب منعقد ہر کچھ شاعروں کو ملوث کرتے تھے اُس زمانے میں صفی اللہ قادری خاص طور پر مشاعروں میں اپنی زندہ دلی کا کچھ زیادہ ہی مظاہرہ کرتے تھے۔ یہ گروپ اُردو ہال اور ادارۂ ادبیات اُردو کے علاوہ شہر میں منعقدہ اہم اہم مشاعروں میں بھی موجود رہتا تھا۔ جی۔ ایم۔ خان اپنے تمام ساتھیوں میں سنجیدہ طبیعت انسان تھے اپنے مزاج کی شائستگی، طبیعت کی نفاست اور روشن ذہن و فکر کی وجہ سے ادبی حلقوں کے لیے کبھی بار نہیں بنے رہے۔ اپنے تمام اساتذہ کی تعظیم کرتے تھے، تمام طلباء و ساتھیوں سے خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ میں نے جب بھی جہاں بھی انہیں دیکھا ہے ان کے چہرہ پر خوشگوار مسکراہٹ کھلکھلاتی بکھری نظر آتی رہی۔ ان کی گفتگو سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ کسی تربیت یافتہ کسی خاندانی نوجوان سے محو گفتگو ہوں۔ اُردو ڈیپارٹمنٹ کے بہترین دوستوں میں خاص طور پر ہاشم حسن سعید، مسعود متین (مسند نشین اُردو فیسٹیول) اور جی۔ ایم۔ خان کو بھی میں اپنے بہت قریب محسوس کرتا ہوں۔ بعض لوگوں

کی شخصیت اتنی جاذب نظر اور جادو اثر ہوتی ہے کہ اُن کی جبیں ملاحت اور ان کے بھولے پن کی خوشبو تا حیات جسم و جاں کو مہکاتی رہتی ہے ضروری نہیں ہے کہ ہر روز یا اکثر و بیشتر ملنے والے احباب ہی دل کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں بلکہ ایسے لوگ بھی رگ جاں کے قریب رہتے ہیں کہ جن سے بہت کم ملاقات رہتی ہے۔ میں جب اُردو تحریک کی ہمہ رنگی کیفیات سے گذر رہا ہوتا ہوں تو مجھے اس وقت کی تمام سرگرمیاں اس وقت کی تمام مصروفیات اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور جب میں اپنی بزم خیال کا وارفتگی کے ساتھ ایک اہم حصہ بن جاتا ہوں تو اس خوشگوار دور کے ایک ایک لمحہ میں محصور ہو کر رہ جاتا ہوں۔ اُردو تحریک کے سلسلہ کی شہری و ادبی سرگرمیوں کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ دل و دماغ پر اس دور کی کچھ شاہکار شخصیتیں ٹھہرے ہوئے تالاب کی طرح دکھائی دیتے ہیں تو کچھ بہتی ہوئی ندی کی طرح یادوں کے ساحل سے ٹکراتی ہوئی گزر جاتی ہیں اور کچھ لہریں ساحل کے وجود میں کچھ اس طرح ضم ہو جاتی ہیں کہ نہ تو ساحل ہی باقی رہتا ہے اور نہ ہی لہریں۔ یادیں ہر شخص کی زندگی کا ایک انمول تحفہ ہوتی ہیں۔ اگر یادیں زندگی کی ہم رکاب نہ رہیں تو انسان کا سارا وجود بے معنی و بے مطلب ہو کر رہ جاتا ہے۔ جی ایم خان کو اُردو شعر و ادب سے کافی دلچسپی ہے محفل موسیقی و تہذیبی تقاریب سے بھی وہ دلچسپی رکھتے ہیں جی ایم خان اپنی طالب علمی کے زمانے میں اپنے بہتر مستقبل کے لیے مسلسل کوشاں رہے۔ غلام محمد خان کی تاریخ پیدائش یوم ۱۶ اگست ۱۹۴۸ء۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی کام

گیا۔ ابتدائی تعلیم گوشہ محل ہائی اسکول میں ہوئی۔ جناب ذوالفقار علی خاں صدر مدرس تھے۔ ۱۹۵۶ء میں میٹرک پاس کیا پری یونیورسٹی کورس کے تکمیل کے لئے ۱۹۵۷ء میں چادرگھاٹ کالج کے طالب علم رہے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور پرنسپل کالج تھے جناب ڈاکٹر حمید الدین شاہد اُردو کے لکچرر تھے۔ چادرگھاٹ کالج کے سالانہ میگزین "فکر نو" میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ ایوننگ کالج کے "شب تاب" میں بھی تحریریں شائع ہوتی تھیں۔ ۱۹۵۸-۶۱ء جامعہ عثمانیہ میں رہے جہاں سے بی کام کی ڈگری حاصل کی۔ جوائنٹ سکریٹری بزم اُردو رہے۔ بزم اُردو آرٹس کالج کے تحت ایک پرچہ "سفینہ" شائع ہوتا تھا جس میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے جامعہ عثمانیہ کے خاص نمبر جس کے مدیر ہاشم حسن سعید تھے جی ایم خان کا مضمون شامل ہے اُس وقت آرٹس کالج جامعہ عثمانیہ کے پرنسپل عبدالقادر صاحب تھے۔ ۱۹۶۱ء میں گریجویشن کی تکمیل کے بعد ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتداء میں بہ حیثیت میڈیکل اسٹور انچارج ٹی بی انسٹی ٹیوٹ ارم نما پر تقرر ہوا۔ پھر ترقی پر ڈائرکٹر میڈیکل سرویس میں بہ حیثیت گراجویٹ پوزیشن دی گئی یہ سلسلہ ۱۹۷۶ء تک جاری رہا۔ اگست ۱۹۷۶ء میں وہ جبکہ اسٹاٹسٹیکل اسسٹنٹ کے عہدہ پر فائز تھے۔ ملازمت کو خیرباد کہہ دیا اور جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ سعودی ایرلائنس ہیڈ آفس جدہ پر بہ حیثیت آڈیٹر اکاونٹ تقرر ہوا۔ یہ سلسلہ ۲۱ برس تک جاری رہا (مئی ۱۹۷۶ء تا ۱۹۹۷ء) ریٹائرمنٹ کے بعد حیدرآباد واپس ہوئے۔ یہ وہ دور تھا کہ انھیں تمام تر

سہولتیں حاصل تھیں چنانچہ دورانِ ملازمت معہ فیملی دنیا کے بیشتر ممالک کا
دورہ کیا جن میں قابلِ ذکر امریکہ، لندن، سوئزرلینڈ، فرانکفرٹ اور
کینیڈا ہیں۔ بڑا بیٹا غلام محمود خان تکمیل بی۔ای کی تکمیل کرتے ہوئے امریکہ
روانہ ہوا اور آج ایم ایس کی تکمیل کرتے ہوئے انتہائی اطمینان بخش
زندگی گزار رہا ہے۔ دوسرا بیٹا حیدرآباد میں ہے ان کی بیٹی نصر اسکول کی
طالبہ ہے۔ جامعہ کے دوستوں میں احمد جلیس مرحوم بھی ان کے قریب ترین
دوست رہے۔ جی۔ ایم خان جہدِ مسلسل اور بہترین لمحوں کی تلاش و جستجو
میں سرگرداں رہتے تھے۔ کالجس اور یونیورسٹیز سے ڈگریاں لینے کے بعد جب
طلباء اپنی عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ان کے لیے کئی راستے کھلے ہوئے
ملتے ہیں اور بند بھی۔ لیکن ایک کامیاب انسان اپنی پوری صلاحیتوں اور
توانائیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لوگوں کی صفوں
کو چیر کر آگے نکل جاتا ہے۔ جی۔ ایم۔ خان نے کبھی بھی جستجو کی راہوں میں
تھکن محسوس نہیں کی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد جب جدہ میں منعقدہ
۴۰۰ سالہ جشن حیدرآباد تقاریب کے سلسلے میں جی۔ ایم۔ خان سے ملاقات
ہوئی تو مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں نے ایک شاعر کی حیثیت سے اس
تقریب میں شرکت کی تھی اس ملاقات کے بعد جی۔ ایم۔ خان جب کبھی
حیدرآباد آتے ہیں کہیں نہ کہیں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ میں جب ملے پلی
میں قیام پذیر رہا تو ان سے ملاقات کچھ زیادہ ہی ہوتی رہی۔ ملے پلی میں
ان کے سسرال کا مکان ہے جو ہاشم حسن سعید کے مکان کے قریب ہے۔

جی۔ ایم۔ خان سے عموماً سیاست آفس سے لوٹتے ہوئے ملتے پلی میں ملاقات ہو جاتی تھی۔ کچھ دن پہلے مسعود مبین اور ہاشم حسن سعید میرے گھر آئے تھے کافی دیر تک اپنے قدیم دوستوں کا تذکرہ چلتا رہا۔ اردو فیسٹول کی سرگرمیاں بھی زیر گفتگو رہیں۔ اس ملاقات میں بھی جی۔ ایم خان کا ذکر آگیا۔ ہاشم نے بتایا کہ جی۔ ایم۔ خان بھی ان خوش نصیب لوگوں میں سے ایک ہیں جن کو خدا نے دین و دنیا کی تمام نعمتوں سے نوازا ہے۔ ان کا گھر اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہے۔ پھر یہ طے پایا کہ کیوں نہ جی۔ ایم۔ خان سے ایک ملاقات کی جائے ایک دن میں اور ہاشم ان کے دولت خانہ واقع (لنگر خاں بازار) پر پہونچے۔ جیسے ہی ہم نے کال بل دی وہ فوراً باہر آئے۔ ہمارا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔ اپنے بہترین آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ ہماری خاطر تواضع کی۔ سوچتا ہوں اب کتنے ایسے دوست و احباب رہ گئے ہیں جن کی زندگی آئینہ مثالی ہے۔ کتنے ایسے دوست ہیں جو بے غرض دوستی کے اعلیٰ نمونہ ہیں۔ میں تو یہی چاہوں گا کہ خدائے برتر میرے تمام دوستوں کو دین و دنیا کی برکتوں سے سرفراز کرے۔ میں ہاشم حسن سعید کے لیے ہمیشہ دعا گو رہوں گا کہ اس شخص نے ایک بہترین و بے لوث دوست کی طرح مجھ سے اپنے مراسم استوار رکھے ہیں۔ ہاشم حسن سعید بعض لوگوں اور بعض دوستوں کی وجہ سے بھی ہمیشہ میرے دل کے قریب ہیں۔ ہاشم کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ

ہیں۔ اعظم صاحب کو شیخ عبداللہ چیف منسٹر جموں وکشمیر کے ہاتھوں ہند و مسلم یونیٹی ایوارڈ مل چکا ہے وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر اگریکلچر ڈیپارٹمنٹ رہ چکے ہیں عابد علی خان میموریل ٹرسٹ کے رکن بھی ہیں

اعظم صاحب کے یقیناً بہت سے دوست ہوں گے اور ہر طرح کے دوست زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شاعر کی صرف کسی شاعر سے ہی دوستی ہو یا کسی ادیب وصحافی کی کسی ادیب وصحافی سے ہی دوستی ہو۔ حقیقی دوستی کے لیے کسی خاص پیشے کے سبب ایک دوسرے سے وابستگی ضروری نہیں ہے۔ دوستی کسی بھی انسان سے ہوسکتی ہے کبھی بھی ہوسکتی ہے ایسی کئی مثالیں موجود ہیں کہ دو دوست ایک دوسرے کے پیشے سے قطعی تعلق نہیں رکھتے۔ میں یہاں محمد اعظم اور جناب زاہد علی خان صاحب کی دوستی کی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ جناب زاہد علی خان صاحب ایک بہت بڑے اخبار سیاست کے ایڈیٹر ہیں اور محمد اعظم نہ تو کوئی صحافی ہیں نہ ہی شاعر وادیب بلکہ وہ زاہد علی خان صاحب کے دوست ہیں صرف دوست۔ ان دونوں کا رشتہ صرف دوستی کی اساس کا مرہون منت ہے۔ محمد اعظم زاہد علی خان صاحب کے بہت ہی اچھے دوست ہیں۔ دونوں ہم خیال ہیں دونوں میں بے تکلفی ہے اور دونوں کی دوستی مثالی ہے زاہد علی خان صاحب کی طرح محمد اعظم بہ ذات خود ایک نفیس اور شریف النفس انسان ہیں۔ اعظم صاحب سے میرے بھی

مراسم ہیں لیکن ایسے نہیں کہ جو ایک شاعر کے دوسرے شاعر یا ایک ادیب کے دوسرے ادیب کے ساتھ ہوتے ہیں۔ آعظم صاحب کو میں اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ عابد علی خان صاحب کے گھر کی تقریباً تمام تقریبات میں مصروف رہا کرتے تھے۔ عابد علی خان صاحب اور جگر صاحب آعظم صاحب کو بہت چاہتے تھے جگر صاحب تو ذہین رہتے تو کہتے تھے کہ آعظم صاحب سیاست کے پی آر او ہیں آعظم صاحب عابد علی خان صاحب کے گھر کے ایک فرد کی طرح گھریلو تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے ہیں۔ عابد علی خان صاحب کے گھر کے تمام چھوٹے بڑے لوگ آعظم صاحب کو اپنے ہی گھر کا ایک فرد سمجھتے ہیں حیدرآباد کی یا اضلاع کی علمی و ادبی محفلوں میں جب کبھی زاہد علی خان صاحب شرکت کرتے ہیں تو عموماً آعظم صاحب اُن کے ساتھ رہتے ہیں۔ زاہد علی خان صاحب آعظم صاحب کو آعظم کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور آعظم صاحب زاہد علی خان صاحب کو نواب کہہ کر۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ آعظم صاحب نہایت خود دار، با اصول اور بے لوث انسان ہیں۔ محمد آعظم صاحب کو میں نواب شاہ عالم خان صاحب کے حوالے سے بھی جانتا ہوں۔ خاص طور سے نواب شاہ عالم خان کی ایک تقریب کے حوالے سے میں زیادہ واقف ہوں جو سالانہ گلابوں کے پھولوں کی نمائش کے موقع پر ہوتی ہے جس کے نواب شاہ عالم خان صاحب سربراہ رہتے ہیں اور محمد آعظم صاحب ان کے معاون۔ محمد آعظم صاحب کو میں نے اخبار سیاست کے معاملے میں کسی بھی حیثیت سے

حائل ہوتے نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر اعظم صاحب زاہد علی خان صاحب سے وابستہ
خاص خاص محفل شعر و نغمہ میں بھی دلچسپی لیتے رہتے ہیں اعظم صاحب
حیدرآباد اردو سوسائٹی کے رکن بھی ہیں۔ ادبی ٹرسٹ کے مشاعروں میں
بھی اعظم صاحب تعاون کرتے رہتے ہیں لیکن انہوں نے بہت کم عملی
حصہ لیا ہے البتہ اوہ دو سال قبل عابد علی خان آئی بال سپتال کی زخمی
اعانت کے لیے منعقدہ ادبی ٹرسٹ کے مشاعرہ میں کافی سرگرم رہے۔
خاص طور پر انہوں نے مہمان شعرا کے انتخاب اور حیدرآباد میں اُن
کی میزبانی کے سلسلے میں بہت زیادہ حصہ لیا۔ محمد اعظم صاحب نمائش
سوسائٹی سے بھی تعلق رکھتے ہیں شنکر جی میموریل سوسائٹی سے بھی وابستہ ہیں
سوسائٹی کے ایک مقبول رکن ہیں نمائش سوسائٹی سے متعلق تہذیبی پروگرام
سے بھی تعلق خاطر رکھتے ہیں نمائش سوسائٹی کے مختلف شعبوں سے کسی
نہ کسی حیثیت سے تعلق رکھتے ہیں اعظم صاحب شنکر جی میموریل سوسائٹی
کے مشاعروں میں گذشتہ ۲، ۳ سال سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہے
ہیں شنکر جی میموریل سوسائٹی کے مشاعروں کے روح رواں جناب محی الدین
جیلانی تھے۔ اعظم جب بھی مجھ سے ملتے ہیں تو بے حد خلوص کا مظاہرہ
کرتے ہیں ان کے لبوں پر "نیر بھائی" "نیر بھائی" کے الفاظ
رقص کناں رہتے ہیں۔ بے حد پُر خلوص شخصیت کے حامل ہیں۔ تین
سال پہلے جبکہ وہ نمائش کلب کے پروگرامس سکریٹری تھے صنعتی نمائش
کے موقع پر نمائش سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ مشاعرہ میں بیرونی

شعراء کو مدعو کرنا چاہتے تھے۔ اُن دنوں کئی دفعہ غریب خانے پہ مشورہ کیا کرتے تھے۔ میں ہر ممکنہ تعاون کرتا رہا۔ جب بھی وہ سیاست میں زاہد علی خان صاحب سے ملنے آتے ہیں تو مجھ سے بھی مل لیتے ہیں۔ وہ سیاست اخبار سے میری برسوں کی وابستگی سے واقف ہیں۔ سیاست سے میرے اٹوٹ رشتہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ آعظم صاحب باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں ہمیشہ مسکراتے ہوئے گفتگو کرتے ہیں۔ ان کے رکھ رکھاؤ اور ان کے اندازِ گفتگو سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مہذب معاشرہ کی ایک پاک و صاف شخصیت ہیں نظام کلب کی سرگرمیوں سے بھی واسطہ رکھتے ہیں نظام کلب کے زیر اہتمام ہونے والے ہر تہذیبی پروگرام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ آعظم صاحب اپنی ملازمت کے زمانے میں بھی تمام اعلیٰ عہدہ داروں کے منظورِ نظر رہے۔ اپنے ساتھیوں اور اپنے ماتحتین کے ساتھ ان کا دوستانہ و برادرانہ سلوک رہا۔ ساری ملازمت انہوں نے باوقار انداز میں گزاری۔
آعظم صاحب کو شعر شاعری اور موسیقی کی محفلوں سے بھی دلچسپی ہے خاص طور پر محفلِ موسیقی کے انعقاد میں اپنی پوری صلاحیت کو بروئے کار لاتے ہیں آج بھی کئی (اعلیٰ عہدہ دار) ان کے دوست ہیں آعظم صاحب کے مراسم بے لوث روابط کا آئینہ دار ہوتے ہیں آعظم صاحب کے خلوص کا انداز اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ ان کی زندگی کا سفر بھی اجالوں کے سفر کی طرح جاری رہے گا پوری شگفتگی و شائستگی کے ساتھ۔ آعظم صاحب

مشرقی ماحول کے پروردہ ہیں تب ہی تو وہ آداب گفتگو اور آداب نشست و برخواست سے پوری طرح واقف ہیں۔ نہایت فراخ دل خوش مزاج اور ہنس مکھ شخصیت ہیں۔ ان کے گھر کا سارا ماحول علمی اور دینی ہے۔ اعظم صاحب پابند صوم و صلوٰۃ ہیں۔ جس ادارہ یا انجمن سے بھی وہ وابستہ رہتے ہیں تو اپنی پوری توانائی ادارہ یا انجمن کے لیے صرف کرتے ہیں۔ نہایت محنتی انسان ہیں۔ سماجی و فلاحی کاموں سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں ہر ممکنہ طور پر خدمات انجام دیتے ہیں باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں ہمیشہ ان کے چہرہ پر شگفتگی نظر آتی ہے خوش مزاج اور دوستی کے قابل انسان ہیں منکسر المزاجی ان کی فطرت کا ایک خاص وصف ہے ہر شخص سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملاقات کرتے ہیں۔ صاف دل، پاک و صاف اور متاثر کن شخصیت ہیں۔ جس محفل میں بھی یا جن لوگوں کے ساتھ بھی اعظم صاحب رہتے ہیں یقیناً وہاں کا ماحول عطر بیز رہتا ہوگا۔

بصیر افضل

(اچھے شاعر۔ منکسر المزاج، فرض شناس عہدہ دار)

محکمہ بلدیہ کے اعلیٰ افسروں میں جناب نریندر لوتھر اور جناب جینت حسین جیسی شخصیتوں کی اعلیٰ کارکردگی اور مقبولیت کو ہمیشہ سراہا جاتا رہے گا۔ محکمہ بلدیہ کے بعض فرض شناس عہدہ داروں میں عباس ہاشمی ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ساتھ بصیر افضل صاحب اسسٹنٹ سٹی پلانر سکندرآباد ڈیویژن کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ محکمہ بلدیہ کے برسرِ خدمت عہدہ داروں میں میرے شاعر دوست بصیر افضل کی کارکردگی بھی محکمہ بلدیہ کے اعلیٰ افسروں اور دیگر اسٹاف کی نظروں میں قابلِ قدر سمجھی جاتی ہے انھوں نے اپنی خوش اخلاقی کے سبب سارے محکمہ میں اپنی منفرد پہچان بنائی ہے۔ یقیناً ہر محکمہ میں کچھ آفیسر اور ملازمین ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اعلیٰ صلاحیتوں، عمدہ کارکردگی اور فرض شناسی کی وجہ سے شہرت رکھتے ہیں۔ میں نے بصیر افضل صاحب کے بارے میں یہ بھی

سُنا ہے کہ وہ اپنے آفس کے تمام ساتھیوں میں بشمول عہدیداران پسندیدہ نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اہلِ غرض حضرات بھی اُن کے حسنِ سلوک کے مترف ہیں اور اُن کے تعاون سے مطمئن رہا کرتے ہیں۔ بصیر افضل صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۱ جون ۱۹۴۸ء ہے نامپلی ملٹی پرپز ہائی اسکول سے بارہویں جماعت تک تعلیم پائی۔ گورنمنٹ پالی ٹیکنک ماں صاحب ٹینک سے ایل سی۔ ای۔ سیول انجینئرنگ ڈپلوما کیا۔ ۱۹۷۱ء میں محکمہ بلدیہ میں اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ بصیر افضل نے جبکہ وہ ساتویں جماعت کے طالب علم تھے شعر کہنا شروع کیا۔ افسانے بھی لکھا کرتے تھے ان کے دو ناول "پیاسے پنچھی" اور "بھیگا دامن" شائع ہو چکے ہیں۔ پہلے ناول "پیاسے پنچھی" کی رسم اجرا جناب ایم باگا ریڈی وزیر بھاری مصنوعات کے ہاتھوں انجام پائی۔ جو ۱۹ ستمبر ۱۹۸۲ء کو سہری آرٹس انسٹیٹیوٹ میں منعقد ہوئی تھی ریاستی وزیر قانون جناب آصف پاشاہ مہمانِ خصوصی تھے۔ بصیر افضل سے میری دلچسپی ایک شاعر دوست کی حیثیت سے ہے۔ انھیں شاعر برادری میں کم آمیز شاعروں کے زمرے میں شامل کیا جاتا ہے مشاعروں میں بہت کم شرکت کرتے ہیں لیکن وہ شعر گوئی سے اچھی خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ مختلف اصنافِ سخن میں شعر کہتے ہیں لیکن غزل ان کے مزاج سے ہم آہنگ ہے اُن سے میری پہلی ملاقات دفتر سیاست میں ہوئی۔ وہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ مجھے وہ پہلی ملاقات میں ہی بے حد شریف النفس، شائستہ مزاج، نفیس انسان معلوم ہوئے۔ اُن کا اندازِ گفتگو اور شائستہ لب و لہجہ اپنی پوری شناخت کے ساتھ مجھے متاثر کرتا رہا۔

نے دورانِ گفتگو یہ بھی کہا کہ وہ استادِ سخن ملک الشعراء اوج یعقوبی
مرحوم کے شاگرد رہے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ میرے استاد بھائی ہوتے ہیں
لیے اوج یعقوبی صاحب جیسے مستند استادِ سخن سے شرفِ تلمذ رہا ہے
وج یعقوبی صاحب کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے میں ان
ے بہر قسم کے شاگردوں سے واقف ہوں۔ حیدرآباد کے بہ قیدِ حیات
ستادِ سخن میں ڈاکٹر علی احمد جلیلی اور خواجہ شوق ان کے قریب ترین شاعر
دستوں میں شامل رہے ہیں۔ بصیر افضل صاحب کے شاعر دوستوں میں
راحت اندیم اور شاذ تمکنت بھی تھے۔ بصیر افضل صاحب کے کلام کے مطالعہ
سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا کلام کلاسیکی اقدار سے گہرا رشتہ رکھتا ہے
یا نہیں ہے کہ بصیر افضل صاحب کا کلام گل و بلبل کے مضامین کی حد تک
محدود ہے۔ بلکہ ان کے کلام میں عصرِ حاضر کا وہ کرب و درد شامل ہے
انسانی اقدار کی شکست و ریخت کا ایک سلسلہ لامتناہی ہے۔ ان کی
ت کم غزلیں میری نظروں سے گزری ہیں کبھی کبھی سیاست اور منصف
، ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے اگر بصیر افضل کچھ وقت شعری ادب
لیے بھی نکال لیں تو ممکن ہے کہ ان کا شمار حیدرآباد کے مشہور شاعروں
ہو جائے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ بصیر افضل مشاعروں کی
نمی سے بہت دور رہنا چاہتے ہیں۔ اپنے آفس کی ذمہ داریوں
بہت ہی عمدگی کے ساتھ عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ بصیر افضل کے
ستوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر دوستوں کی تعداد بہت کم ہے

اس کی اصل وجہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ وہ شعری و ادبی محفلوں سے کم کم تعلق رکھتے ہیں۔ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے ہیں۔ اگر وہ شعری و ادبی محفلوں میں شرکت کرتے رہیں تو ظاہر ہے کہ شاعر اور ادیبوں کے ساتھ ان کے مراسم بڑھیں گے۔ اگرچہ بصیر افضل کا تا حال کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا ہے لیکن ان کے ہاں اتنا کلام موجود ہے کہ وہ ایک مجموعۂ کلام شائع کر سکتے ہیں۔ ایک ملاقات میں انہوں نے مجھ سے کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں تعاون کی خواہش کی تھی مجھے اس وقت بے حد مسرت ہوتی ہے جب کوئی قلمکار اپنی شاعری اور اپنی تحریروں کو کتابی شکل دینا چاہتا ہے۔ ہمارے شہر میں اب بھی بہت سے ایسے قلمکار موجود ہیں جن کے ہاں کافی شعری و ادبی ذخیرہ موجود ہے لیکن وہ ان کی اشاعت پر توجہ نہیں دیتے۔ میرے خیال میں اس کی شاید دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو ان کی افتادِ طبع اور تساہلی اور دوسری وجہ وسائل کی کمی اور کسی ورمالی موقف وغیرہ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض قلمکار پوری تن دہی کے ساتھ اپنی تخلیقات کو کتابی شکل دینے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ایسی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں رفتارِ ادب کا تجزیہ تو ہوتا ہی رہتا ہے اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے بغیر عملی اقدام ضروری ہے۔ میں خود اپنے کئی شاعر و ادیب دوستوں کو کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں توجہ دلاتا رہتا ہوں اردو اکیڈیمی کی رقمی اعانت سے بھی ادھر ۲۰ ، ۲۲ برسوں میں

سینکڑوں کتابیں ہمارے شہر کے شاعروں اور ادیبوں نے شائع کی ہیں۔ جن میں سے بعض کتابیں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بصیر افضل کے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے مجھے بے حد مسرت ہوگی اور مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ان کا مجموعۂ کلام منظرِ عام پر آجائے گا بصیر افضل ایک بہترین دوست، اچھے شاعر، خوش اخلاق اور مہذب شہری ہیں۔ میں اپنے دوست بصیر افضل سے کہتا رہتا ہوں کہ شعری و ادبی محفلوں میں کم ہی سہی شرکت کرتے رہیں تاکہ اچھی اچھی شاعری اور عمدہ عمدہ مضامین سے استفادہ کرتے رہیں۔

میری یہ خواہش ہے کہ بصیر افضل کا شعری سفر جاری رہے چاہے اس سفر کی رفتار دھیمی ہی کیوں نہ ہو، ان کے دل میں جو شمعِ ادب جل رہی ہے اس کی روشنی میں اضافہ ہوتا رہے ▲

خواجہ بہاء الدین

(بہترین دوست اور بے مثال دوست، شریف آدمی)

اس کی بنیاد پر ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایک دوسرے کی افادیت کے لئے کچھ ایسے کام بھی کر جاتے ہیں جو دوستی کی اقدار میں سرخروئی کا باعث بن جاتے ہیں جیسے کسی کو دوست مان لیا جاتا ہے تو دوستی کی آبرو باقی رکھنے کا خیال دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ خواجہ بہاء الدین بھی میرے ایسے ہی دوستوں میں شامل ہیں جن کی دوستی کبھی موقع شناسی کی مرہون منت نہیں رہی۔ بہاء الدین سے میری دوستی کی بنیاد اتفاق سے پڑی۔ تقریباً ۴۰ سال سے ہم ایک دوسرے کے بہترین اور با اعتماد دوست ہیں۔ خواجہ بہاء الدین میرے آفس کے ساتھی ہیں ۱۹۵۵ء میں جب میرا تقرر محکمہ کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں بہ حیثیت کلرک ہوا تھا تو وہاں بہت سے ایسے اچھے لوگ تھے جن سے دوستی کرنے کو جی چاہتا تھا۔ مجھ سے پہلے علیم الدین، سریپا کوراؤ، افضل حسین اور ایس واگھرے جیسے قابل نوجوانوں کا تقرر ہو چکا تھا۔

میرے بعد خواجہ بہاء الدین، کشٹپاکرن اور ارحمن راؤ کا تقرر ہوا۔ اس وقت مسٹر کرو سوامی محکمہ کمیونٹی پروجکٹ کے ڈائرکٹر تھے آفس کے منتظمین کی حیثیت سے محمد عمر صاحب اور محمد سعید صاحب اور محمود نواز خان کام کرتے تھے مسلم اسٹاف کچھ زیادہ ہی تھا۔ ان دنوں بہاء الدین سے میرے بہت زیادہ مراسم نہیں رہے۔ پھر ہمارا محکمہ تشکیل آندھرا پردیش کے وقت سکریٹریٹ کے پلاننگ / پنچایت راج ڈپارٹمنٹ میں ضم ہوگیا۔ یہ بات ۱۹۵۶ء کی ہے۔ سکریٹریٹ میں جگہ کی قلت کی وجہ سے ہمارے محکمہ کے اسٹاف کو کچھ مہینوں کے لئے سکریٹریٹ کے روبرو واقع عمارت شاہ پور واڑی میں کام کرنا پڑا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد جب ہمارا محکمہ پوری طرح سکریٹریٹ سے وابستہ ہوگیا اور جب ہم سکریٹریٹ میں تھے تو ہمارے محکمہ کے سکریٹری ایس نرسمہم تھے جو بہت ہی سخت گیر آدمی تھے۔ محکمہ پلاننگ علاقہ آندھرا اور علاقہ تلنگانہ کے مشترکہ اسٹاف کا ملا جلا محکمہ بن گیا۔ میری پوسٹنگ پہلے ای۔ جی۔ ای۔ میں ہوئی جو انتظامیہ سے تعلق رکھتا تھا۔ خواجہ بہاء الدین بھی کسی اور سکشن میں تھے۔ بتدریج ہم میں دوستی بڑھتی گئی۔ تلنگانہ کے کافی ملازمین ان دنوں سکریٹریٹ میں تھے مسلم ملازمین کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی — آپس میں اتحاد تھا۔ ہم لوگ آپس میں ملتے رہتے۔ لیکن ہماری دوستی پیروان نہیں چڑھ سکی۔ پتہ نہیں چلا کہ ۲۵ سال کس طرح گذر گئے۔

سکریٹریٹ میں ان دنوں تمام ملازمین سکریٹریٹ کی ایک تہذیبی انجمن آندھرا پردیش سکریٹریٹ کلچرل اسوسی ایشن کے نام سے کام کرتی تھی۔ اس تقریب

مجھے دوران جو ایک ہفتہ جاری رہتی تھی ہم لوگ جو اردو زبان سے دلچسپی رکھتے
تھے تلگو کے ماحول میں کبھی کبھی اردو پروگرام پیش کرتے تھے ۷ دن میں
صرف ایک گھنٹہ دیا جاتا تھا ایک دفعہ ایک مشاعرہ بھی میرے مشورہ سے
منعقد ہوا۔ خواجہ بہاء الدین، علیم الدین، افضل حسین، شکیل احمد،
عباس ہاشمی، محمد حسین خان اور قادر علی بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ڈرامے
میں خواجہ بہاء الدین، افضل حسین اور سکریٹریٹ کے کچھ اور لوگ حصہ
لیا کرتے تھے پھر ایک ایسا موقع آیا کہ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن
کا قیام عمل میں آیا جس کا میں بانی سکریٹری ہوں۔ اس وقت کے پہلے صدر
اسوسی ایشن بھارت چند کھنہ سکریٹری گورنر آندھرا پردیش نائب صدر کی
حیثیت سے غلام احمد اسسٹنٹ سکریٹری مسٹر جیا راؤ جوائنٹ سکریٹری اور
رشید بیتی اسسٹنٹ سکریٹری شامل تھے جب انجمن تشکیل پائی تو میں
نے صدر اسوسی ایشن بھارت چند کھنہ کے مشورہ سے خواجہ بہاء الدین کو
شعبۂ موسیقی کا انچارج بنایا اور آج بھی وہ سکریٹریٹ کے پروگرامس
میں حصہ لیا کرتے ہیں سکریٹریٹ اسوسی ایشن کے زیر اہتمام بہاء الدین
نے بے شمار تہذیبی پروگرام کامیابی کے ساتھ پیش کئے۔ خواجہ بہاء الدین
کے ہم خیال دوستوں میں عباس ہاشمی اور شکیل احمد تھے جنھوں نے
خواجہ بہاء الدین کے ساتھ مکمل تعاون کیا۔ قافلہ بڑھتا گیا۔ نئے نئے مسافر
شامل ہوتے گئے پھر شکیل احمد آئے۔ غفار تنویر آئے کرشنا کماری
اور جینتی بھی آئیں۔ مرد گلوکاروں میں محمد حسین خان، قادر علی اور عباس ہاشمی

پروگرام میں شامل کرتے تھے۔ بہاءالدین نے کسی محفل میں بھی ترنم سے غزلیں نہیں گائیں کی تمام گلوکار بہاءالدین کی موسیقی کی دھنوں پر گایا کرتے تھے۔ خواجہ بہاءالدین نے اگرچہ کسی موسیقی کے اسکول یا کالج سے موسیقی کی تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن خداداد صلاحیت کی وجہ سے وہ مکمل موسیقار بن گئے۔ خواجہ بہاءالدین کی موسیقی کی دھنیں شامل ہوتی تھیں۔ ان کی شہرت کا یہ عالم ہے کہ دور درشن سے اب انہی کی زیر نگرانی موسیقی کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں موسیقی کی محفلوں کے ذریعہ خواجہ بہاءالدین نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے سکندرآباد میں ایک خوشگوار ماحول بنایا۔ خواجہ بہاءالدین سکشن آفیسر کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے ایک فرض شناس اور ذمہ دار ملازم سرکار کی طرح ساری ملازمت نیک نامی کے ساتھ گزاری۔ موسیقی کے حوالے سے شہر کے تمام گلوکاروں اور موسیقی کے کئی سربراہوں سے ان کے مراسم ہیں سکندرآباد اردو اسوسی ایشن کے توسط سے پروگرام پیش کیے جانے کی وجہ سے ان کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ انہوں نے غیر اردو داں مرد و خواتین گلوکاروں کی سرپرستی کی۔ آج بھی یہ خدمات انجام دے رہے ہیں خواجہ بہاءالدین ایک بہترین دوست اور اعلیٰ کردار کے حامل انسان ہیں۔

ہماری دوستی کا معیار، ہماری دوستی کی بنیاد بے لوث ہے ہم نے سکندرآباد میں شعر و ادب اور موسیقی کی محفلوں کے لئے خوشگوار ماحول بنایا۔ سکندرآباد اردو اسوسی ایشن کی وجہ سے سکندرآباد کے اعلیٰ عہدہ داروں سے ہمارے مراسم بڑھے اور ہم نے زبان و ادب کے ساتھ ساتھ موسیقی کی

بھی خدمت کی۔ خواجہ بہار الدین کے لیے شمار شاگرد ہیں اُن کے دولت خانے واقع کالاڈیرا کالونی (ملک پیٹ) میں گلوکاروں کا لفرینا باہر رونق جمگھٹا رہتا ہے اور جب کوئی خاص پروگرام پیش کرنا ہو تو ریہرسل کی نشستیں ہوا کرتی ہیں خواجہ بہار الدین سکریٹریٹ کی مقبول شخصیت رہے ہیں۔ مسلم اسٹاف میں کچھ ملازمین ایسے بھی تھے جنھوں نے شعر و ادب اور موسیقی کی بدولت کافی شہرت حاصل کی اور جنھوں نے نہ صرف زبان و ادب و موسیقی کی خدمت کی بلکہ حیدرآباد کی تہذیبی روایات کو بھی باقی رکھا اور اپنے رکھ رکھاؤ سے آندھرا کے ملازمین کو یہ بتایا کہ حیدرآباد کے لوگ اس طرح کے ہوتے ہیں ان کی تہذیب اس طرح کی ہوتی ہے۔ ہم نے سکریٹریٹ میں نہایت خوشگوار ماحول برقرار رکھا۔ ہمارے محکمے کے آندھرائی ساتھیوں میں مسٹر وینکٹ رمنا۔ جی پربھو۔ محمد لطیف۔ ستیش گرگ کے نام قابلِ ذکر ہیں جو ہماری محفلوں میں بڑی دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ سکریٹریٹ کے ملنے جلنے والے دوستوں میں نرسِمہا راؤ، خواجہ بہار الدین، خواجہ معین الدین، افضل حسین، کنٹا کرن، پربھاکر راؤ، ارجن راؤ اور نرسِمہا ریڈی، جی پربھو، محمد حسین، قادر علی، عباس ہاشمی، شکیل احمد وغیرہ قابلِ ذکر دوستوں میں شامل ہیں جنھوں نے ہمیشہ اُردو زبان سے دلچسپی لی۔ سکریٹریٹ کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ خواجہ بہار الدین کی شخصیت قابلِ قدر و لائقِ تحسین ہے بہترین انسان ہیں لطائف گھڑنے میں ماہر ہیں خوش مزاجی ان کا وصف ہے بذلہ سنجی ان کے

مزاج میں رچ بس گئی ہے۔ سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ داروں میں خاص طور پر اپنے محکمہ کی حد تک بیں ملے داس سے ہمارے بے تکلفانہ مراسم تھے وہ ہمارے محکمہ میں ڈپٹی سکریٹری / جوائینٹ سکریٹری تھے اُن کے زمانے میں ہم نے بے شمار اہل غرض حضرات کی مدد کی ہے سکریٹریٹ کے اپنے محکمہ کے ساتھیوں کی جائز مدد کی۔ بیں ملے عزیز جی اے ڈی میں ڈپٹی سکریٹری تھے ان سے بھی ہمارے دوستانہ مراسم تھے اُن عہدہ داروں نے آپس میں کبھی تفریق نہیں پیدا کی کہ ہم سکشن آفیسر ہیں اور وہ ڈپٹی سکریٹری جوائینٹ سکریٹری ہیں سکریٹریٹ کے آفیسرس میں غلام احمد صاحب کے علاوہ تراب الحسن صاحب سے بھی ہم لوگ بہت قریب تھے خواجہ بہاء الدین نے میری شاعری کے ابتدائی زمانے میں میری بہت سی غزلیں ریڈیو سے پیش کیں سکریٹریٹ کے پروگرامس میں بھی میری غزلیں پیش کیں کورس گایا جاتا رہا۔ دور درشن سے میرا کلام پیش کر چکے ہیں۔ اکثر گلوکاروں کے ذریعہ خواجہ بہاء الدین نے میری غزلیں گوائیں۔ جن میں قابل ذکر گلوکارہ دلیپ رمنا مورتی، امیر محمد خان، بال سرارائیہ غفار تنویر، صابر حبیب وغیرہ ہیں سکریٹریٹ میں غیر اردو داں لوگ جیسے شانتا مورتی، مس جینتی اور کرشنا کماری جن کی آواز کوئل کی طرح ہے۔ بہاء الدین کی دھنوں پر غزلیں گاتی رہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی ڈیوٹی آفیسر دنے منی نے بھی بہاء الدین کی دھنوں پر غزلیں گائیں۔ خاص طور پر انہوں نے پہلی دفعہ جب ریڈیو سے میری یہ غزل

گائی تھی میری پلکیں بھیگ گئی تھیں۔ ع
یہ سوچا بھی نہ تھا اک دن بچھڑ جائیں گے ہم دونوں
خواجہ بہاء الدین دوستی کے قابل انسان ہیں ہم دونوں کے مراسم انتہائی دوستانہ ہیں ہماری دوستی کی عمر تقریباً زائد از ۴۰ برس کی ہے لیکن آج تک ہم میں کسی بات پر بھی اختلاف نہیں ہوا بلکہ ہماری دوستی جیسے جیسے دن بڑھتے جا رہے ہیں پختہ ہوتی جا رہی ہے وہ ایک یار باش، زندہ دل انسان ہیں۔ پاک و صاف ذہن و فکر کے مالک ہیں۔ ہمدرد ہیں، رواداری میں حیدرآبادی مزاج کے حامل ہیں۔ خواجہ بہاء الدین کا خاندانی پس منظر بھی اہم رہا ہے ان کے والد محترم احمد خان ایڈووکیٹ اپنے دور کے بہت مشہور وکیل رہ چکے ہیں مجھے انہیں دیکھنے کی سعادت حاصل رہی۔ بہاء الدین صاحب پہلے اپنے والدین، بھائیوں کے ساتھ ایک بڑے مکان میں رہتے تھے جو بانسی کھیت میں واقع تھا وہاں اُن سے ملاقات ہوتی تھی ان دنوں محفلِ موسیقی کے بہت سے پروگرامس ہوتے تھے جن میں میری غزلیں گائی جاتی تھیں اب ایسی ساری باتیں، ساری سرگرمیاں مفقود ہوتی جا رہی ہیں۔ سکریٹریٹ میں ہم لوگوں نے ملازمت کی اور شاندار ملازمت کی۔ ہمارا وجود ایک بے تاج بادشاہ کی طرح رہا۔ ہم نے سکریٹریٹ میں ہمیشہ اپنے پکے حیدرآبادی ہونے کا ثبوت دیا۔ باوقار انداز میں ہم اپنا کام کرتے تھے۔ کسی سے بھی مرعوب نہیں تھے۔ اپنی صلاحیت پر بھروسہ تھا اور

اپنی دیانت داری پہ یقین۔ سکریٹریٹ میں اُردو کا ماحول بنانا ہمارے لئے مشکل تھا آندھرا والوں نے کبھی اُردو سے ہمدردی کی اور اُردو زبان کے خلاف کوئی کام نہیں کیا بلکہ بعض آندھرائی احباب نے ہمیشہ تعاون کیا سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن نے سرکاری محکموں کی تاریخ میں اپنا اونچا نام کمایا ہے اُس زمانے میں جب اسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا غالباً ۱۹۷۰ء سے لے۔ جی آفس کے کسی بھی محکمہ میں اُردو اسوسی ایشن نہیں تھی۔ ہم نے شاندار پیمانے پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اُردو سے دلچسپی رکھنے والے احباب اُردو دانشوران شعر و ادب، سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی سرگرمیوں سے ہمیشہ متاثر رہے۔

خواجہ بہاء الدین ریٹائرمنٹ کے بعد بھی موسیقی کے ذریعہ اُردو کی خدمت انجام دے رہے ہیں میرے بہت ہی اچھے اور چاہنے والے دوستوں میں سے ایک ہیں جنھیں میں ہمیشہ یاد رکھتا ہوں۔ بہاء الدین سے اکثر فون پر گفتگو ہوتی ہے۔ وہی انداز، وہی لب و لہجہ۔ بڑے دلچسپ اور زندہ دل انسان ہیں۔

اللہ انھیں ہمیشہ پُرمسرت رکھے

***

محمد علیم الدین

سیکرٹریٹ کے سفید پوش نیک سیرت انسان

معاشرہ کے نشیب و فراز اور حالات کے مدّوجزر کے درمیان، روز و شب کے تذکروں، لمحوں اور ساعتوں کے آس پاس جن لوگوں کا ذکر ہوتا رہتا ہے ان کی نیکیوں، اُن کے حسنِ سلوک اور ان کی شرافت و مروت کی وجہ سے کچھ نام ذہن کے گوشوں میں اس طرح اُبھرتے ہیں کہ جیسے وہ کسی آبشار کی طرح کیف پرور کیفیات سے ہم کنار رہتے ہوں۔

پتہ نہیں کیوں جب کبھی میں سیکریٹریٹ کے نیک خصلت اور بہت زیادہ شریف انسان علیم الدین صاحب کو یاد کرتا ہوں تو وہ ایک مجسم شرافت، انتہائی با اخلاق، مروت شناس، وفا پیکر، انسانیت کے علمبردار اور نیکیوں کے سرچشمہ کی حیثیت سے میری نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز ہو جاتے ہیں۔ میں نے اپنی ملازمت کے تقریباً ۳۵ برس کے دوران بے شمار ملازمینِ سیکریٹریٹ کو دیکھا ہے۔ اُن سے گفتگو کی ہے

اُن سے دوستی کی ہے لیکن علیم الدین صاحب جیسا سب سے الگ منفرد انسان نہیں ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے علیم الدین صاحب کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ضرورت مند لوگوں اہلِ غرض حضرات کی مدد کرتے رہیں۔ علیم الدین صاحب بھی اُن خوش نصیب ملازمین سکریٹریٹ میں سے ایک ہیں جو کلرک سے ڈپٹی سکریٹری کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے۔ علیم الدین صاحب اور میرا بنیادی رشتہ سلسلۂ ملازمت ڈائرکٹر کمیونٹی پراجکٹ آفس سے استوار ہوا۔ اس محکمہ میں میرے تقرر سے پہلے علیم الدین صاحب کا تقرر بہ حیثیت کلرک ہو چکا تھا۔ ان کے تقرر کے ۳، ۴ ماہ بعد میرا بھی تقرر بہ حیثیت کلرک ہوا۔ اس محکمہ میں ہم نوجوانوں کا ایک اچھا خاصا حلقہ تھا علیم الدین، خواجہ بہاء الدین، خواجہ معین الدین، افضل حسین، صلاح الدین نیر، علی نواز خاں، ست نارائن، نرسہا ریڈی، سوشیل کمار ماتھر، بی این واگھرے، ارجن راؤ اور کشنا کرن۔ مجھ سے سینیئر لوگوں میں محمد افضل، رحیم الدین غوری، محمد علی عابدی، شانتی کمار اور عبدالرحیم سید تھے۔ ہم نے اپنے محکمہ میں بھائیوں اور دوستوں کی طرح اپنی ملازمت کی مدت نہایت خوشگوار انداز میں گذاری۔ مسلم عہدہ داروں میں بہ حیثیت منتظم محمد عمر اور سعید صاحب تھے مگر سوامی ڈائرکٹر جناب ایم اے حمید ڈپٹی سکریٹری اور ظہیر احمد کمشنر تھے۔

۱۹۵۶ء جب آندھرا پردیش کی تشکیل عمل میں آئی تو ہمارا محکمہ سکریٹریٹ کے محکمہ پلاننگ میں ضم ہو گیا۔ پلاننگ ڈپارٹمنٹ کے بعد میں بنی بیت

راج ڈیپارٹمنٹ کی شکل اختیار کر گیا۔

پلاننگ ڈپارٹمنٹ کے سکریٹری مسٹر سی نرسمہم تھے جو ایک نہایت مغرور، سخت گیر آفیسر تھے۔ اُس زمانے میں ہمارے محکمہ میں خواجہ حمید احمد اسسٹنٹ سکریٹری تھے۔ گزٹیڈ آفیسر کی حیثیت سے انہوں نے ہماری سفارش پر بے شمار لوگوں کے متعلقہ فارمس پر دستخط کیئے۔ ان کا یہ طریقہ تھا کہ بسم اللہ کہہ کر دستخط کرتے تھے۔ ہمارے محکمہ میں لکشمی نارائن اسسٹنٹ سکریٹری ایک نہایت مذہبی شخص تھا جو O.P.I. II کا انچارج تھا۔ برخلاف اس کے آندھرا کے اکاونٹس آفیسرس نارائن راؤ اور راما چوگا راؤ نہایت شریف النفس، انسانیت دوست آفیسر تھے۔ سکریٹریٹ کے ماحول پر اُس وقت آندھرا پردیش کے ملازمین چھائے ہوئے تھے۔ علیم الدین صاحب سکریٹریٹ کے اہم اہم شعبوں میں کام کرتے رہے۔ پہلے وہ ہمارے محکمہ O.P.I سکشن میں تھے پھر وہ اکاونٹس سکشن میں بھی رہے۔ علیم صاحب ہمارے محکمہ میں سکشن آفیسر کے عہدہ تک رہے پھر وہ اکاونٹس آفیسر بن کر G.A.D چلے گئے وہاں وہ اسسٹنٹ سکریٹری بھی رہے اور ڈپٹی سکریٹری بھی۔ کچھ عرصہ کے لئے ایمپلائمنٹ آفیسر بھی رہے۔ انہوں نے سینکڑوں اہل غرض اصحاب کی مدد کی۔ ان کے ایمپلائمنٹ آفیسری کا دور بھی نہایت کامیاب رہا۔ انہوں نے بے شمار لوگوں کو بلا تخصیص مذہب و ملت فیض پہونچایا۔ سکریٹریٹ کے کسی بھی محکمہ کا کام کیوں نہ ہو اہل غرض حضرات کی مدد کے لئے تیار رہتے۔ اور متعلقہ سکشن پہونچ جاتے تھے۔

انہیں حج بیت اللہ شریف کا بھی شرف حاصل رہا۔ علیم صاحب میرے بہترین
شانلی دوستوں میں سے ایک ہیں۔ کبھی کبھی وہ میرے گھر تشریف لاتے ہیں
فون پر بھی گفتگو ہوتی رہتی ہے علیم صاحب کا ادبی ذوق نکھرا ستھرا ہے
وہ بھی سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے بانیوں میں ہیں۔ ہم تمام
ساتھی ہمیشہ ہم خیال رہے۔ اردو اسوسی ایشن کے لئے ہم سب مل کر
بے لوث خدمات انجام دیتے رہے۔ ہوم ڈپارٹمنٹ کے سبزہ زار پر
ہم تمام ایک ساتھ لنچ کرتے تھے۔ ہم نے اپنی ساری ملازمت کے دوران اپنی
بہترین دوستی کا مظاہرہ کیا۔ علیم الدین صاحب سکریٹریٹ کے تمام ادبی،
شعری و تہذیبی پروگرامس میں شریک رہا کرتے تھے۔ ہمارے ساتھیوں
میں سب سے زیادہ زندہ دل انسان، خواجہ بہاء الدین جو سکریٹریٹ اردو
اسوسی ایشن کے شعبۂ موسیقی کے انچارج تھے۔ اب بھی وہ اپنے شگوفوں
سے ہمیں سرشار کرتے رہتے ہیں۔ خواجہ بہاء الدین سکریٹریٹ کے شعبۂ
موسیقی کے انچارج کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کو سلیقہ سے نبھاتے رہے
سکریٹریٹ کے موسیقی و تہذیبی پروگرامس کی وجہ سے ان کی بہت شہرت ہوئی۔
وہ اپنے سینئر و جونیر ساتھیوں محمد حسین خان، قادر علی، عباس ہاشمی، شکیل احمد
کے تعاون سے موسیقی کے بہتر سے بہتر پروگرام پیش کیا کرتے تھے۔ GAD
کی دو لڑکیاں کرشنا کماری اور جینتی نے بھی اردو اسوسی ایشن کی بڑی خدمت
کی۔ پروگرامس میں عمدگی کے ساتھ غزلیں، گیت، کورس گاتی رہیں۔ آج بھی وہ
سکریٹریٹ کے پروگرامس میں حصہ لیتی ہیں۔ نمائش سوسائٹی کے زیر اہتمام

صنعتی نمائش کے موقع پر ہر سال موسیقی پروگرام پیش کیا جاتا ہے۔ علیم الدین ایک نیک دل، فرض شناس، دیانت دار کلرک بھی رہے اور آفیسر بھی رہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان سے ملنے کے لئے کوئی نہ کوئی شخص تقریباً ہر روز سکریٹریٹ آتا تھا۔ علیم صاحب ان کے کام کی یکسوئی کے لئے متعلقہ محکموں سے ربط پیدا کرتے اور کامیابی کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ انہوں نے کسی بھی حاجت مند کو بے نیل و مرام نہیں لوٹایا۔ علیم صاحب ایک وضع دار یار باش اور دوستی کے قابل انسان ہیں۔ ان کی خوبیوں کی ایک طویل فہرست ہے۔ علیم صاحب کو میں نے ہر مرحلہ میں ایک باکردار، شرافت پسند انسان کی حیثیت سے پایا ہے۔ تقریباً ۴۰ برس کا ہمارا قریبی رشتۂ دوستی ہے۔ ان برسوں میں بے شمار خوشگوار لمحوں سے ہم گزرتے رہے ہیں۔ کن کن باتوں کا ذکر کیا جائے۔ ہماری دوستی کا ایک ایک لمحہ یادگار ہے۔ جو لوگ پاک طینت، ایماندار، بے غرض اور اعلیٰ خصوصیات و بہترین کردار کے حامل ہوتے ہیں، انہیں بہت زیادہ یاد رکھا جاتا ہے۔ علیم الدین صاحب کو میں نے سکریٹریٹ میں سفید پوش شخص کی حیثیت سے ہمیشہ سفید شیروانی میں دیکھا ہے۔ سفید شیروانی اُن پر خوب سجتی تھی۔ آفیسروں کی نظروں میں علیم الدین صاحب کی بڑی عزت تھی۔ آفیسر اُن پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ ہمارے تمام ساتھی اپنی ملازمت کے آخری دنوں تک ایک دوسرے سے اپنے خوشگوار تعلقات کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایسے دوستوں میں خواجہ معین الدین، خواجہ بہاء الدین، علیم الدین، افضل حسین، پربھاکر راؤ

تمہارے ہوتے بہت سے شاگرد ... رحمن راؤ قابلِ ذکر ہیں۔ اُن میں ... ہیں۔
ڈاکٹر ... بھی تھے جو اب ہم میں نہیں رہے) یہ تمام دنیا میں پھیلے ہیں۔
جب بھی ان سے ملاقات ہو جاتی ہے تو میں اپنے ماضی میں کھو جاتا ہوں
وہ بھی کھو جاتے ہیں اور ہم لوگ اپنے ماضی کے اوراق اُلٹتے رہتے ہیں
اور یہ دیکھتے ہیں کہ ماضی کے اُن اوراق میں ہمارا کہاں کہاں کس کس
حیثیت سے نام لکھا ہوا ہے۔ یادداشت خدا کا بہت بڑا عطیہ ہے
یادیں انسان کو زندہ رکھتی ہیں۔ اور خاص طور پر تنہائیوں کے لمحات میں
یادیں انسان کے لئے بہت بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔ اگر انسان سے اس
کی یادیں چھین جائیں تو اس کی زندگی بے مطلب ہو کر رہ جاتی ہے۔
علیم الدین صاحب اُن لمحات کی یادگار ہیں جن لمحوں میں اُجالوں کی ...
تقسیم ہوتی تھی جن میں خوشیوں کی مہک سے ہم سرشار رہتے تھے۔ ہماری
ایسی خواہش ہے کہ ہم اپنی باقی زندگی بھی ایسے خوشگوار لمحوں کی یاد
میں گزاریں جن میں دوستی بھی ہو اور رواداری بھی ہو۔ نیکی بھی ہو اور
کبھی ختم نہ ہونے والی شرافت بھی ہو۔

عباس ہاشمی

(سکریٹریٹ کی ایک باغ و بہار شخصیت نیک صفت انسان)

آندھرا پردیش سکریٹریٹ میں اپنی ملازمت کے دوران میں نے بے شمار ملازمین سکریٹریٹ کو دیکھا ہے بے شمار ملازمین سے صاحب سلامت رہی ہے لیکن ان میں کچھ ہی ایسے لوگ تھے جو اپنی خصوصی خوبیوں کے ساتھ نمایاں تھے۔ ان کے کام کرنے کا طریقہ، اپنے فرائض منصبی کو سلیقہ اور ذمہ داری کے ساتھ انجام دینے کا انداز، اپنے ساتھیوں سے خوشگوار مراسم رکھنے کا ہنر، سب سے فراخ دلی کے ساتھ اپنے روابط کو باقی رکھنے کا سلیقہ، آپسی یگانگت کا کھلا مظاہرہ کرنا اور اسی طرح کی بہت سی خوبیوں کے ساتھ پرسکون انداز میں اپنی زندگی کا سفر جاری رکھنا ان کے ایک خصوصی موقف کی نشاندہی کرتا رہا ہے۔ سکریٹریٹ میں بلا تفریق مذہب و ملت بلا تفریق آندھرا و تلنگانہ کچھ لوگ ایسے ہی تھے جو اپنی شرافت، دیانت داری اور خوش اخلاقی کے ساتھ سکریٹریٹ کے ہمہ رنگی ماحول میں اپنے آپ کو جذب کر چکے تھے

اس طرح کی سکریٹریٹ کی مقبول ترین شخصیتوں میں عباس ہاشمی بھی شامل تھے۔ ہمارے مراسم و دوستی کا آغاز سکریٹریٹ کی ادبی و تہذیبی سرگرمیوں سے ہوا۔ عباس ہاشمی اپنے محکمہ کے ایک نہایت خوددار ملازم ہونے کے علاوہ سکریٹریٹ کے تمام محکموں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں سے واقف تھے۔ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے قیام سے قبل آندھرا پردیش کلچرل اسوسی ایشن سرگرم عمل تھی جس کی سالانہ تقاریب ہر سال ماہ دسمبر میں مسلسل منائی جاتی تھیں تمام ملازمین تلنگانہ بھی اس اسوسی ایشن سے وابستہ تھے کلچرل اسوسی ایشن سکریٹریٹ کے تمام شعبہ جات ملازمین سے تعلق رکھتی تھی۔ پروگرامس کے ان دنوں میں ہم لوگ ایک دن اردو پروگرام کے لئے حاصل کرتے تھے جس میں خاص طور پر ڈرامے یا موسیقی کے پروگرامس ہوتے تھے۔ ایک دفعہ ہم نے مشاعرے کا بھی اہتمام کیا تھا جس میں شہر کے نمائندہ شاعروں نے شرکت کی تھی۔ میں اس مشاعرہ کا کنوینر تھا۔ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے قیام ۱۹۶۹ء کے بعد عباس ہاشمی سے میرے روابط میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے انہیں ہر مرحلہ پر اپنا ہم خیال پایا۔ عباس ہاشمی بھی بانیان سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن میں سے ایک ہیں۔ چونکہ انہیں موسیقی سے دلچسپی تھی اس لئے عہدہ داران اسوسی ایشن نے انہیں شعبہ موسیقی سے وابستہ کیا۔ اور وہ انچارج شعبہ موسیقی جناب خواجہ بہاءالدین کی قیادت

میں سرگرم عمل رہے ان کے بہترین معاون ثابت ہوئے۔ عباس ہاشمی نے سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے بے شمار پروگراموں میں حصہ لیا۔ آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد سے ہونے والے پروگرامس میں بھی انہوں نے سازیہ طرزیں سنائیں۔ کورس میں حصہ لیا۔ بعض پروگرامس کے وہ انچارج بھی رہے۔ خواجہ بہاء الدین کے دست راست کی حیثیت سے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ عباس ہاشمی نے اپنے محکمہ تعلیمات سے وابستگان کے علاوہ بہت سے اہل غرض حضرات کی مدد کی۔ سکریٹریٹ کی مشہور ترین شخصیتوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے تمام پروگرامس میں انتہائی خلوص و دلچسپی کے ساتھ حصہ لیا کرتے تھے۔ سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کی وجہ سے سکریٹریٹ کے مختلف محکموں کے اعلیٰ عہدہ داروں سے بھی ان کے مراسم تھے جن سے انہوں نے بہت سے اہل غرض لوگوں کی محکمہ جاتی کارروائیوں کے سلسلے میں تعاون حاصل کیا۔ سکریٹریٹ کے اعلیٰ عہدہ داروں میں جو سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن سے وابستہ تھے جن میں قابل ذکر ایس اے قادر (چیف سکریٹری) راے کنج بہاری لال چیف سکریٹری، بھارت چند کھنہ، سید ہاشم علی اختر، غلام احمد رشید قریشی، ایس اے واسع، صادق احمد، تراب الحسن ہیں عباس ہاشمی کا سکریٹریٹ کے محکمہ تعلیمات میں بہ حیثیت کلرک تقرر ہوا کئی برسوں تک محکمہ تعلیمات سے وابستہ رہے بعد میں اسسٹنٹ سکشن آفیسر اور سکشن آفیسر ہوئے۔ جب وہ اسسٹنٹ سکشن آفیسر تھے تو

محکمہ بلدیہ سے وابستہ ہو گئے۔ پہلے وہ میونسپل کمشنر کی حیثیت سے نظام آباد پر رہے۔ پھر نرمل پیران کا تبادلہ ہوا تھا۔ نرمل سے ظہیر آباد پرنسپل ڈیویژنل آفیسر کی حیثیت سے مقرر ہوئے۔ ظہیر آباد کے بعد میونسپل کمشنر کے عہدہ پر مامور رہے۔ ۱۹۹۱ء میں گریڈ I والیوشن آفیسر ہوئے۔ پھر میونسپل کمشنر کرنول پر خدمت انجام دی۔ پھر کاشمیر گئے۔ پھر محکمہ بلدیہ کے مین آفس وا نچ ٹینک بنڈ پر پی آر او ہوئے۔ اس کے بعد ڈپٹی کمشنر میونسپل کارپوریشن ہوئے۔ اسپیشل گریڈ میونسپل کمشنر کے عہدہ سے مئی ۱۹۹۸ء کو بہ حسنِ خدمت ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۹۹ء میں مع اہلیہ حج اکبر کی سعادت حاصل کی۔

سکریٹریٹ کے خوبصورت، وجیہ پُرکشش نوجوانوں میں عباس ہاشمی بھی شامل تھے۔ اپنے آفس کی ذمہ داریوں کو نہایت ہی فرض شناسی کے ساتھ نبھاتے رہے۔ اپنے محکمہ میں بے حد مقبول اور ہر دل عزیز تھے۔ متعلقہ افسروں سے بھی ان کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ شہر کے علماء و حضرت مشائخین کے خاندان سے عباس ہاشمی صاحب کا تعلق ہے۔ ان کے بزرگ شہر کے نامور شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ عباس ہاشمی نے سکریٹریٹ کے علاوہ محکمہ بلدیہ میں بھی بہت سے اہلِ غرض لوگوں کے ساتھ ہر ممکنہ تعاون کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ ہیں۔ انھیں اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی شعر و ادب و موسیقی سے دلچسپی رہی۔ سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ہونے والی تقریباً تمام

سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے بہت ہی شریف النفس، مہذب و پُروقار پاک طبیعت، پاک باطن، باکردار انسان ہیں۔ سکریٹریٹ کے ماحول میں اپنی بہترین صلاحیتوں، اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی محبت و رواداری کی وجہ سے بھی لوگوں کی نگاہوں میں رہے۔ دوران ملازمت جہاں بھی رہے وہاں کے اسٹاف اور عوام نے ان کی شخصیت کا احترام کیا۔ بلا تخصیص مذہب و ملت، بلا کسی ذہنی تحفظات کے اپنے عہدہ کا صحیح استعمال کیا۔ عباس ہاشمی سے جب بھی ملاقات ہوتی ہے تو طبیعت بحال ہو جاتی ہے۔ ان کی پُر مزاح گفتگو لطف دے جاتی ہے ہنستے اور قہقہے لگاتے ہوئے اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی نیک نیتی، نیک نامی اور اپنی نیک خصلت کے سبب تاحیات خوش رہیں گے۔ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں جو شخص دوسروں کی مسرتوں کو خراج پیش کرتا رہتا ہے وہ خود بھی مسرتوں سے ہم کنار رہتا ہے۔ سکریٹریٹ میں کام کرنے والی لڑکیوں / خواتین کی نظروں میں عباس ہاشمی چشمۂ نور بنے رہے۔ انہوں نے خاص طور پر سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے موسیقی کے پروگرامس کے سلسلے میں سکریٹریٹ کی خاتون گلوکاروں کی حوصلہ افزائی میں مکمل تعاون کیا۔ مس جگجیتی اور کرشنا کماری سکریٹریٹ کی بہت ہی اچھی گلوکارہ ہیں۔ ان لڑکیوں / خواتین کو اردو غزل سے مانوس کروانے میں خواجہ بہاءالدین کی طرح عباس ہاشمی کی دلچسپی کو بھی بڑا دخل رہا۔ عباس ہاشمی کا ایک اور کارنامہ یہ

سہگل اُنہوں نے اُن کی پیروی سی موجودہ پروگرام اگزیکیٹو آل انڈیا ریڈیو شریمتی وسنے متی کو سکریٹریٹ اردو اسوسی ایشن کے وساطت سے شہرت دلوائی جو ایک غیر معمولی صلاحیت کی گلوکارہ ہیں۔ سکریٹریٹ کے مرد گلوکاروں میں محمد حسن، نثار علی، شکیل احمد کی گائیکی کو سراہتے ہوئے ان کے لئے بہترین پروگراموں کی پیش کش کے لئے مواقع فراہم کرتے رہے۔ سکریٹریٹ کے اُن کے دوست و احباب آج بھی اُن کی یاد و دوستی پہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ اُن میں سے ایک میں بھی ہوں۔ سکریٹریٹ کے ہم خیال دوستوں میں خواجہ بہاء الدین صاحب اُن کا بار از قابل رشک ہے۔ جن کے برخلاف دوستانہ مراسم آج بھی خوشگوار انداز میں باقی نہیں ہے

عابد محی الدین

ایک مخلص سماجی کارکن — کامیاب تاجر، ذہین دانشور شخصیت

معاشرہ میں انسانیت، دوستی، رواداری، ہمدردی، شائستہ قدروں
اور تہذیبی رشتوں کی پاسداری کرنے والے بہترین مصلح قوم وملت
اور زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے کچھ لوگ مختلف گوشوں میں
بٹے ہوئے رہنے کے باوجود اپنی فطری صلاحیتوں، ذاتی خوبیوں اور
اعلیٰ تہذیبی روایتوں کی روشنی میں بہت ہی کم عرصہ میں اپنی ایک مخصوص
پہچان بنا لیتے ہیں جب وہ فنکارانہ، فنی وتعمیری سرگرمیوں میں دلچسپی
لینا شروع کرتے ہیں تو حالات خود بخود ان کے ہم رکاب ہو جاتے
ہیں مہذب معاشرہ انہیں پوری عزت و اعزاز کے ساتھ قبول کرتا
ہے۔ انسان میں کتنی ہی صلاحیتیں کیوں نہ ہوں آگے بہترین رہنمائی
کی ہی نہیں بہترین سہارے کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس کی قیادت و
رہنمائی میں وہ اپنی خدمات کا سفر خوش اسلوبی کے ساتھ جاری رکھ سکتا

ہے اگر ایسے شخص کو کسی کی بہترین رہنمائی حاصل ہو تو وہ جو کچھ بھی کر دکھانا چاہتا ہے اس کے خیالات میں ہی تر و تازگی نہیں بلکہ اس کے دل و دماغ میں شگفتگی در آتی ہے ہمارے معاشرہ میں بے شمار ایسے مسائل ہیں جو معاشرہ کے نبض شناسوں اور اصلاح پسندوں کے لئے سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں مسائل کو سمجھنا اور صحیح سمت پر اپنے قدم بڑھانا ایک اہم ذمہ داری سمجھی جاتی ہے ایسے لوگ جو بہترین ماحول کے سبب کبھی فضاؤں میں آسمانوں کی وسعتوں کو ناپنے اور دنیا کو زیادہ سے زیادہ روشنی سے سرفراز کرنے کے لئے میدانِ عمل میں قدم رکھتے ہیں وہ ہر مرحلہ پر کامیاب و کامران رہتے ہیں اس طرح کے پس منظر میں معاشرہ کے افق پر ایک مصلح نوجوان عابد محی الدین کی بھی تصویر ابھر رہی ہے جن سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ قوم و ملت کی فلاح و بہبود کے لئے بہتر سے بہتر کام انجام دیں گے میرے یقین کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انہیں غلام صادق الدین جیسے فعال اور سرگرم عمل شخصیت کی سرپرستی و رہنمائی حاصل ہے۔ ۶، ۷ برس پہلے عابد محی الدین سے میری ملاقات اپنے بہترین دوست غلام صادق الدین کی معرفت ہوئی۔ عابد محی الدین ایک مخلص سماجی کارکن اور ایک کامیاب تاجر ہیں جو اپنی تیار ملبوسات کی عالیشان دوکان مخدوم پیرادرس کے روح رواں اور سربراہ ہیں آئے دن ان کی ترقی کے اسباب قابل رشک حد تک بنتے جا رہے ہیں۔ ابتداء میں انہیں میں صرف ایک تاجر کی حیثیت سے ہی جانتا تھا لیکن مجھے معلوم ہوا کہ وہ خدا کی

عنایات سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ۲۰-۲۲ برس پہلے ہم کچھ شاعر (تحسین جعفر، ناصر کریولی وغیرہ) کی مدینہ ہوٹل کے ایڈ ویٹ ہال میں ۹ بجے شب سے ۱۲ بجے شب تک نشست منعقد کیا کرتے تھی۔ یہ ہمارا روز کا معمول تھا ایک ادب دوست شخصیت ہدایت محی الدین صاحب سے کبھی کبھی مدینہ ہوٹل کے ایڈ وکیٹ ہال میں ملاقات ہوتی تھی۔ ہوٹل کے باہر بھی ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ ہدایت محی الدین صاحب کو شعر و شاعری سے کافی دلچسپی ہے میں نے عابد محی الدین سے ان کے بارے میں بتایا تو کہنے لگے کہ وہ میرے والد محترم ہیں۔

عابد محی الدین صاحب دینی و فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے ہیں یہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کس کس ضرورت مند کی کس کس انداز سے مدد کرتے ہیں۔ کامیاب بزنس مین ہونے کے علاوہ ایک کامیاب عوامی خدمت گذار بھی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ غلام صادق الدین جیسے بالغ نظر انسانیت دوست شخصیت کے زیر اثر وہ اپنی شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں مصروف ہیں۔ عابد محی الدین بہترین دوست بہترین شہری اور بہترین انسان ہیں وہ اپنے خاندان کے ذمہ دار سربراہ کی طرح اپنے تمام بھائیوں کی بھلائی اور ان کی ترقی کے لئے رہبرانہ تعاون کیا کرتے ہیں اپنے والد محترم کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ ایک سعادت مند اولاد کی طرح اپنے والد کی ہر بات کو دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں ان کے والد کی سرپرستی اور رہنمائی نے بھی ان کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی منازل طے کرتے جا رہے ہیں اپنے والد بزرگوار سے بے حد محبت کرتے ہیں

اپنے بھائیوں کے ساتھ بھی مشفقانہ سلوک روا رکھتے ہیں۔ گھریلو معاملات میں اپنے بزرگوں کے زیر سایہ سکون قلب کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ عابد محی الدین اولڈ سٹی یوتھ ایڈ ویلفیر کمیٹی کے سرگرم کارکن ہیں۔ اولڈ سٹی ٹریڈرس کے سربراہ بھی ہیں۔ یہ ضرورت مندوں اور سماج کے قابل توجہ لوگوں کی مدد کرتے ہیں ان کے دوستوں کا حلقہ کافی بڑا ہے حکومت کے سربراہوں سے ان کے روابط ہیں جو بھی اہل غرض ان کے پاس آتے ہیں ان کے کام کی تکمیل تک چین سے نہیں بیٹھتے۔ عابد محی الدین فطرتاً خوش طبیعت ہیں بھی نہایت کھرے انسان ہیں تجارتی حلقوں میں کافی مقبول ہیں انہیں اردو شاعری سے بھی کافی دلچسپی ہے کبھی کبھی اپنے دولت خانے پر شاعروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ عابد محی الدین نہایت سنجیدہ اور خلیق انسان ہیں۔ ان کا انداز گفتگو بھی ہموار رہتا ہے شگفتگی ان کے مزاج کا ایک اہم حصہ ہے۔ مسکراتے ہوئے ان کا گفتگو کرنا اچھا لگتا ہے با شعور انسان ہیں۔

عابد محی الدین کو اپنی زندگی کا ایک لمبا سفر طے کرنا ہے۔ میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔

اظہارِ تشکر

● میری اس کتاب میں جن دوستوں پر میرے تاثراتی مضامین شامل ہیں اُن میں سے مجھے بعض کرم فرماؤں کا تعاون حاصل رہا ہے۔ خاص طور پر میرے اُردو فیسٹول (۱۹۶۰ء) کے ساتھی درویش غیاث الدین، مسعود متین اور جی ایم خان کے علاوہ میرے دوست لطیف افضل نے بھی اپنی ضرورت کے مطابق کتابیں محفوظ کروائی ہیں۔ میں اس تعاون کے لیے ان دوستوں کا ممنون ہوں۔

● صدر نشین اُردو اکیڈیمی آندھرا پردیش جناب سید شاہ نورالحق قادری اور اپنے سکریٹریٹ کے دیرینہ ساتھی، سکریٹریٹ اُردو اسوسی ایشن کے سابقہ رکن موجودہ ڈائرکٹر / سکریٹری، اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش جناب ایم اے نعیم کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس دستاویزی کتاب کی اہمیت و افادیت کو محسوس کرتے ہوئے حسب گنجائش اشاعت کے سلسلے میں رقمی اعانت کی۔ بروقت کتابت کے لیے جناب سید انوار احمد کا ممنون ہوں۔

● میں اُن تمام دوست و احباب کا بھی شکر گزار ہوں جو میرے شعری و ادبی مصروفیات کے سلسلے میں اپنی نیک تمناؤں سے نوازا کرتے ہیں۔

صلاح الدین نیر

انتساب

اپنی ماں کی اُس خوشبو کے
نام جو میرے جسم و جاں میں
پیوست ہے۔

صلاح الدین نیّر

صلاح الدین نیر

• نام : صلاح الدین نیر
• تاریخ پیدائش : ۲۵ جنوری ۱۹۳۵ء
• سکونت : حیدرآباد (آندھرا پردیش)
• تعلیم : پوسٹ گریجویٹ (جامعہ عثمانیہ)

صلاح الدین نیر کی کتابیں ——— مجموعۂ کلام

• گلِ تازہ (۱۹۶۵ء) • زخموں کے گلاب (۱۹۷۲ء) • صنم تراش (۱۹۷۸ء)
• شکن در شکن (۱۹۷۹ء) • خوشبو کا سفر (۱۹۸۳ء) • رشتوں کی مہک (۱۹۸۶ء)
• سفر جاری ہے (۱۹۸۸ء) • یہ کیسا رشتہ (۱۹۹۰ء) • کیا کیا جائے (۱۹۹۴ء)
• گلفشاں (۱۹۹۹ء) نیلم ترقشاں (۲۰۰۰ء)

نثری مطبوعات :
سلسلہ پھولوں کا (خود نوشت سوانح (۱۹۹۲ء) • بکھری پرچھائیاں (مضامین
خاکے، سفرنامے، تبصرے ۱۹۹۳ء) • قافلے یادوں کے (المیہ تحریریں ۱۹۹۳ء)
• کہکشاں ۱۹۹۶ء • سائبان (محبوب حسین جگر ۱۹۹۸ء)
• خوشبوئے بہاراں (۲۰۰۱ء) جبیں سوگئے، راستاں کہتے کہتے (۲۰۰۱ء) روشنی خوشبو مہک (۲۰۰۲ء)

تالیف • عظمت عبدالقیوم : فن اور شخصیت (۱۹۸۸ء)
• عظمتِ خیاباں : عظمت عبدالقیوم مضامین، افسانے، شاعری (۱۹۸۹ء)
• فیضانِ رسول (۱۹۹۵ء) • صالحہ الطاف : فن اور شخصیت (۲۰۰۱ء)

صلاح الدین نیر سے متعلق کتابیں

• قافلہ چلتا رہے گا (صلاح الدین نیر فن اور شخصیت ۱۹۹۲ء) از صالحہ الطاف ۔ ڈاکٹر
شاہدہ سعید • نیر گیتالو (۱۹۶۵ء) گلِ تازہ کی منتخب غزلوں کا منظوم ترجمہ
مترجم : شمس الدین عمودی ۔ ترتیب کار : ہیرالال موریا
• صلاح الدین نیر : فن اور شخصیت ۱۹۹۴ء

نواب میر محمد علی خان صاحب کے پرسنل اسسٹنٹ رہے۔ ۱۹۸۳ء تک یہ سپرنٹنڈنٹ ایڈمنسٹریٹو آفیسر محکمہ تنظیمات زراعت وظیفہ پر سبکدوش ہوئے۔ خواجہ صاحب کو نواب میر احمد علی خان صاحب سے بہت زیادہ قربت حاصل تھی خواجہ صاحب کو اردو شعر و ادب سے کافی دلچسپی ہے ان کے ہاں قدیم و جدید اردو کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ خواجہ معین الدین صاحب سے میری رسم و راہ سیاست کی معرفت ہوئی۔ خواجہ صاحب جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب کے دوستوں میں تھے۔ خواجہ صاحب دفتر سیاست آتے رہتے تھے۔ اور خاص طور پر اس وقت ضرور موجود رہتے تھے جب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب کے ہمراہ کسی علمی و ادبی جلسے میں شرکت کرنی ہوتی تھی۔ خواجہ صاحب عابد منزل میں منعقد ہونے والی اکثر دعوتوں میں موجود رہتے تھے۔ نہایت با اخلاق مخلص انسان ہیں ان کا مخصوص لباس شرٹ اور پینٹ ہے ٹائی لازماً ان کے لباس کا حصہ بنی رہتی ہے کبھی کبھی شیروانی بھی ملبوس رہتے ہیں ملے پلی میں سکونت پذیر ہیں گھر سے بہت کم باہر نکلتے ہیں محلہ کے بعض اصحاب سے ان کے اچھے خاصے مراسم ہیں حسن اتفاق ہے میں خود بھی ملے پلی میں اپنے ذاتی مکان میں رہتا ہوں لیکن محلہ میں ان سے ملاقات نہیں ہوتی خواجہ صاحب سے یا تو سیاست میں ملاقات ہوتی ہے یا ادبی جلسوں یا پھر مشاعروں میں۔ خواجہ صاحب کا شعری ذوق نکھرا ہوا ہے۔ وہ غزل

...تھا میں غلام صادق الدین بہت زیادہ سرگرم عمل ہے۔ غلام صادق الدین نام و نمود کی خواہش اور کسی عہدہ پر نظر رکھے بغیر اردو کے ایک حقیقی عاشق کی طرح اردو کا کام کرتے رہے ہیں (کر رہے ہیں) اردو سے محبت کا عملاً ثبوت دینے کے لئے انھوں نے گوکنڈہ میں اردو ماڈل اسکول قائم کیا۔ اردو ذریعہ تعلیم کا یہ منفرد اسکول آج ہائی اسکول کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔ اس اسکول کے نتائج بہت ہی حوصلہ افزا رہتے ہیں۔ اس اسکول کے قیام کے سلسلے میں نواب میر احمد علی خان صاحب کی شخصی دلچسپی کو بڑا دخل رہا ہے اس اسکول کے سلسلے میں جناب عابد علی خان صاحب اور جناب محبوب حسین جگر صاحب کی سرپرستی بھی انھیں حاصل رہی۔ اسکول کے بعض جلسوں میں ان دونوں محترم شخصیتوں کو مدعو کیا جاتا رہا ہے گولکنڈہ میں ان کے بہترین سینئر دوستوں میں منظور ظفر ان کے لئے اہم شخصیت کے حامل ہیں جو اسکول کی تقریباً ہر تقریب میں شریک رہتے ہیں غلام صادق الدین کے زیر انتظام جہاں کہیں بھی سیاسی و غیر سیاسی جلسے ہوتے ہیں ان میں مشاعرہ لازماً ہوتا ہے۔ مشاعرے کے سلسلے میں مجھ سے تعاون حاصل کرتے ہیں اور میری وساطت سے شہر کے منتخب نمائندہ شعراء ان کی محفلوں میں اپنا کلام سناتے ہیں یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ادھر ۲۰، ۲۲ برسوں میں غلام صادق الدین نے بے شمار جلسوں میں شعراء کو مدعو کیا ہے شعراء کے انتخاب کی پوری